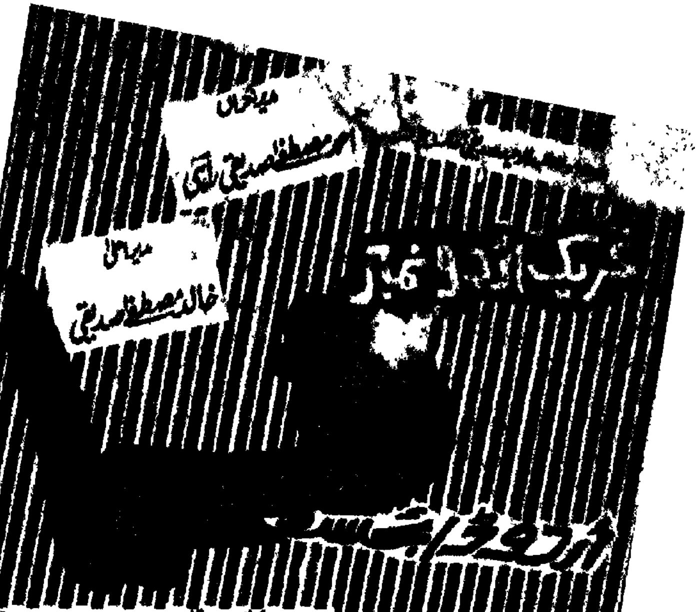

تحریک
اُردو نمبر
15/-



اس شمارے کی قیمت پندرہ روپے۔ عام شمارے کی قیمت آٹھ روپے
سال بھر کی قیمت ایک سو پچیس روپے جس میں سالنامہ، خصوصی
نمبروں کی قیمت اور چھتیس روپے رجسٹری و ڈاک خرچ کے شامل
ہیں۔ ہر شمارہ رجسٹری سے بھیجا جاتا ہے۔

جنوری ۱۹۸۶ء شمارہ ۲۳۳۶ جلد ۲۲

فون نمبر ۶۹۸۸۹۳

اردو ڈائجسٹ "ھما" ۲۸ سنٹرل روڈ جنگپورہ (بھوگل) نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

"ھما" آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس نئی دہلی کا ممبر ہے

ترتیب: مصطفیٰ صدیقی راہی — تزئین کار: اے روز، بہزاد راہی — ناظم اعلیٰ — خالد مصطفیٰ صدیقی
مطبوعہ امپیریل پریس لال کنواں دہلی — پرنٹر پبلشر: خالد مصطفیٰ صدیقی
مالک: خالد مصطفیٰ صدیقی
تاریخ اشاعت ۱۷ دسمبر ۱۹۸۵ء
مقام اشاعت — ۲۸ سنٹرل روڈ جنگ پورہ (بھوگل) نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

ماہنامہ ہما کی اردو ڈائجسٹ

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

۲۳۶ویں منزل

اُردو کو اُس کا جائز، قرار واقعی، دستوری، جمہوری اور آئینی حق دلانے کی جدوجہد تو گزشتہ پینتیس سال سے پورے ہندوستان میں چل رہی ہے اس دوران اُردو کو "یوپی" اور "بہار" میں دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا مطالبہ مسلسل کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں حکومت نے زبانی اور اصولی طور پر اس مطالبے کا برحق ہونا اور جہاں تک "بہار" کا تعلق ہے تو اس کے کچھ اضلاع میں "دستوری" طور پر اُردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن "یوپی" میں اردو کا معاملہ جوں کا توں اُردو مخالف سازشوں اور سیاسی مصلحتوں کا شکار ہے۔ صوبائی حکومت کے ذمہ دار عہدیداروں کے بیانات - رجحانات - حکومتی پالیسی اور عمل درآمد میں صریح تضاد و اختلاف پایا جاتا ہے، اگر حکومت دیانتداری سے اس مسئلے کا حل چاہتی ہے تو اس کو اردو مخالفوں سے اس جائز مطالبے کو تسلیم کرانے کے لئے سیاسی مصلحتوں سے بالاتر ہو کر اپنی واضح پالیسی کا اعلان کرنا ہوگا، ٹھوس اور پُر خلوص اقدامات کے ساتھ ایسے عناصر پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی، جو اس جائز حق و مطالبے کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

ساتھ ہی اُردو پرستوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک اور جدوجہد کو مزید شدومد کے ساتھ اور آگے بڑھائیں اور اُس وقت تک جاری رکھیں جب تک اُن کے جائز مطالبے، اُردو کو اُس کا حق نہ مل جائے اور اس کو دوسری سرکاری زبان نہ بنادیا جائے۔ محض شکوے اور شکایات مسئلے کا حل نہیں۔ ضرورت ہے قربانی اور جنگ کی ـــــ اُردو چلن عام کرنے کی ـــــ اردو پڑھنے کی ـــــ اُردو لکھنے کی ـــــ اردو بولے جانے کی ـــــ اردو اخبارات اور رسائل خریدے جانے کی اور اُردو کی تعلیم اور اُس کے استعمال کے لئے جو سہولتیں اِس وقت فراہم ہیں اُس سے باخبر رہ کر اُن کے عمل درآمد کی کوشش کرنے کی۔ اور گھر گھر، محلّے محلّے، شہر شہر، اُردو اسکولوں، مکاتب و مدارس کا جال بچھا دینے کی، جہاں ہر اُردو پڑھا لکھا فرد اپنے فاضل اوقات میں اپنے متعلقین اور دوسروں کو اُردو پڑھانے کی ذمّے داری لے اور اُردو کی ترویج و اشاعت میں عملی تعاون دے۔

خادم ہما
خالد صدیقی

GOVERNOR
UTTAR PRADESH

۱۸ نومبر ۱۹۸۵ء

مکرمی راہی صاحب

سلام مسنون!

مجھے مسرت ہے کہ آپ جنگ آزادی میں اردو کا کردار اور قومی یک جہتی کی قلم بردار افراد کے مختلف پہلو اور کردار پر روشنی ڈالنے کی غرض سے "ھُمَا" اردو ڈائجسٹ، دہلی کا اردو تحریک نمبر شائع کرنے جا رہے ہیں۔

اردو نے جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس کی مثال کسی دوسری علاقائی زبان میں ملنا دشوار ہے۔ "انقلاب زندہ باد" اور "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" جیسے نعرے اردو ہی نے دیئے۔ یہ فخر اردو کو ہی حاصل ہے کہ اس کے شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں نے حب الوطنی کے جذبہ کو اپنے اشعار اور تخلیقات کے ذریعہ عوام میں بیدار کیا تھا۔ مزید برآں انگریزوں کے دور حکومت میں ضبط کی گئیں بے شمار تخلیقات اردو کی ہی تھیں۔ اس لیے اردو یک جہتی کی سب سے بڑی یادگار ہے اور ہمارے مشترکہ کلچر کا حسین تحفہ بھی ہے۔

اردو تحریک کے روح رواں سرسید احمد خان تھے۔ اس کے بعد ملک کے بے شمار ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے تحریک کو فروغ دیا۔ اس میں ہر مذہب و ملت کے قلم کاروں نے اپنے اپنے طور پر اس تحریک کو کامیاب بنانے میں پوری پوری کوشش کی۔ اور آج بھی اردو ادب کے ...... اساتذہ اور فنکار اس تحریک کے محسن و مربی ہیں ان کی کوششوں سے کارروان اردو تحریک اپنی ترقی کی شاہراہ کی جانب گامزن ہے اور رہے گا۔ اردو تحریک کے اس کارروان کو آگے بڑھانے میں کتب و رسائل کی اشاعت اور اشاعتی اداروں کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔ ان کے خاص نمبروں کی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے۔ خاص نمبر دراصل کسی خاص موضوع پر اہل قلم حضرات کے معرکۃ الآرا مضامین جمع کرتے ہیں جو نہ صرف تفصیلی مطالعہ میں معاون ہوتے ہیں بلکہ ان کی تاریخی اور دستاویزی حیثیت بھی ہوتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ "ھُمَا" کا یہ خاص نمبر بھی تاریخی اور دستاویزی حیثیت کا حامل ہوگا۔ اس کامیاب اشاعت کے لیے میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

دعاگو

(محمد عثمان عارف)

گورنر یو۔پی

CONGRESS
VARNIKA

۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء

ہما اردو ڈائجسٹ

۴۸ سینٹرل روڈ جنگپورہ (بھوگل) نئی دہلی

مکرمی راہی صاحب

آداب عرض

جناب کا ۱۰ر نومبر کا نوازش نامہ ملا۔ بڑی مسرت ہوئی کہ آپ ہما کا اردو تحریک نمبر نکال رہے ہیں۔ اردو ہندوستان کی زبان ہے اور مشترکہ ثقافت کی مظہر۔ شاید اس اعادہ کی ضرورت نہیں کہ کانگریس پارٹی اور کانگریسی حکومت اردو کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔

یہ خبر آپ کے لیے باعث مسرت ہوگی کہ کانگریس (آئی) اب اردو پر اور زیادہ زور دے گی۔

اپنی نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

ج پرشاد

پیغام

हरियाणा राज भवन
चण्डीगढ़

HARYANA RAJ BHAVAN
CHANDIGARH



مجھے مسرت ہے کہ ہر دل عزیز اردو ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" دہلی ۱۰ دسمبر ۱۹۸۶ء میں "اردو تحریک نمبر" کے عنوان سے ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔

زبانِ اردو کا آغاز بذاتِ خود اس بات کا ضامن ہے کہ یہ زبان اس دور کے عصری تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وجود میں آئی تاکہ یہ عوام کے جذبات و خیالات کی ترجمانی بلا امتیاز مذہب و ملت کر سکے۔ بے شک اس نے فارسی زبان کا رسم الخط اپنایا لیکن اس نے نہایت فراخدلی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی بہت سی زبانوں کے الفاظ اپنائے اور یہی وجہ تھی کہ یہ بہت جلد ہندوستان بھر میں مقبول اور ہر دل عزیز بن گئی۔ آج بھی اس کی شاعری، خاص طور پر صنفِ غزل اور بول چال کے آداب سارے ملک میں محبت و احترام کی نظر سے تسلیم کیے جاتے ہیں اور لاثانی مانے جاتے ہیں۔ یہ زبان تمام فرقوں کی زبان ہے، تمام خطوں کی زبان ہے اور اب تو یہ ایک عالمگیر زبان بن گئی ہے۔ بیرونِ ہند میں بھی اس کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہ زبان ملک کی تقسیم کے بعد بھی تقسیم نہ ہوئی اور آج تک برصغیر پر حاوی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ زبان قومی یکجہتی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اس کا لافانی SYM BLE ہے اور موثر ترین وسیلہ ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اردو کا مستقبل تابناک اور درخشاں ہوگا۔

میں اس خصوصی شمارے کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

(سید مظفر حسین برنی)
گورنر ہریانہ



AMITABH BACHCHAN
MEMBER OF PARLIAMENT
(LOK SABHA)

پیغام

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ اردو ڈائجسٹ
ماہنامہ اردو تحریک پر شائع کر رہا ہے مجھے توقع
ہے کہ یہ رسالہ علم کے فروغ اور ملک میں یکجہتی
و دوستی کو بڑھاوا دینے میں اہم رول ادا کرتا
رہے گا۔

میں اس کام میں رسالہ کی کامیابی کا متمنی
ہوں۔

(امیتابھ بچن)
ایم پی (لوک سبھا)
۲-اے، موتی لال نہرو مارگ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۱

اردو تحریک اور
ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی

کرمی صدیقی صاحب   تسلیم!

آزادی کے بعد اردو تحریک ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کی ایک مشترکہ جدوجہد بن گئی ہے۔ ہندوستان کو وحدت مذہب، وحدت وطن اور وحدت زبان دینے والی زبان اردو ہی ہے جس نے بقول شخصے ہندو، ہندوستان اور ہندی جیسے ہمہ گیر الفاظ عطا کیے۔

ایسی متعدد کانفرنسوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے کہ جن میں ہندوستان کے سارے فرقوں کے لوگ اردو زبان کے تحفظ کے لیے شانہ بشانہ کھڑے ہوگئے۔ دنیا کی کسی بھی زبان میں پہلی بار اردو زبان میں غیر مسلم ادیب بھی اجتماعی تعاون کے ساتھ آگے بڑھے اور انہوں نے ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۱ء میں دو بار لکھنؤ میں کانفرنس منعقد کی۔ ۱۹۸۱ء میں آپ کے والد محترم نے وفات سے کچھ روز قبل ہماری دوسری کانفرنس میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن اجل نے انہیں اتنی مہلت نہ دی۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اس وقت بھی سارے غیر مسلم ادیب اردو کے ساتھ اس لیے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کی وحدت کی یہی زبان ضامن ہو سکتی ہے۔ آپ ہما کا اردو تحریک نمبر نکال کر ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ مجھے فرصت ہوتی تو میں کئی کانفرنسوں اور سیمیناروں کا مواد آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا جو میرے پاس فائلوں میں بندھا ہوا رکھا ہے۔ اس انتظار میں کہ کوئی ریسرچ اسکالر اس پر کام کرے گا۔ آپ کے ہما کا نمبر بھی ایک تاریخ مرتب کر دے گا اس کا مجھے یقین ہے۔ اس کے لیے بہت تھوڑا سا مواد بھجوا رہا ہوں۔ اگر وقت پر آپ کے پاس پہنچ گیا تو اسے شامل کرلیں۔

آپ کا نیازمند

رام لعل

چیرمین اردو رابطہ کمیٹی اتر پردیش

[illegible]

[illegible]

ایک نظر میں

رائے پور میں اردو رابطہ کمیٹی کا جلسہ

رائے پور ـــ اردو رابطہ کمیٹی مدھیہ پردیش کے صدر سید ظہور اعلی نے صولت لائبریری رائپور میں منعقد کتاب میلے کے ایک جلسے میں کہا ـــ اردو زبان کو کسی ایک فرقے سے جوڑنا نہ صرف تاریخی غلطی بلکہ ایک خطرناک سیاسی حربہ ہے جس سے اردو زبان کے حامیوں کو خبردار رہنا چاہیے۔ انہوں نے اردو مخالف لوگوں کے اس الزام کی بھی سختی تردید کی کہ اردو ملک کی تقسیم کے لیے ذمہ دار ہے۔ اگر اردو زبان اپنے جمہوری حقوق حاصل کرے گی تو ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دے گی۔ رام لعل نے کہا ـــ ملک کی تقسیم کا نظریہ پیش کرنے والے اردو کے علاوہ گجراتی، ملیالم، بنگالی، تلگو، مراٹھی وغیرہ کی زبانیں بولتے تھے۔ تقسیم کے لیے صرف اردو کو مورد الزام ٹھہرانا محض سیاسی الزام ہے۔ انہوں نے کہا اردو نے ملک کو متحد و منظم کرنے میں ایک انقلابی کردار نبھایا ہے جس کی کوئی مثال دنیا کی کسی دوسری زبان کی





اردو رابطہ کمیٹی کے
نائب چیئرمین جناب ڈاکٹر ملک زادہ
صاحب رامپور میں
صولت پبلک لائبریری میں
دانشوروں کو خطاب کرتے ہوئے۔
اردو کو ریاست اتر پردیش
میں دوسری سرکاری زبان
بنوانے کے لئے
'لائحہ عمل' پر
تقریر کی۔

لسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ رام لعل نے ملک کی مزید تقسیم کے الزام کو لغو اور بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا ۔۔۔ اب تک جاسوسی کے الزام میں ایک بھی اردو یا کوئی دوسری ہندوستانی زبان بولنے والا مسلمان گرفتار نہیں کیا جا سکا جبکہ اس الزام میں کئی ہندو، عیسائی اور سکھ ملوث ہو چکے ہیں۔ رام لعل نے کہا مسلمانوں کا دامن بے داغ ہے انہوں نے ہر موقعہ پر حب الوطنی کا ثبوت دیا ہے اور اردو زبان کے ذریعے سب سے زیادہ جوشیلی نظمیں تخلیق کی گئی ہیں جن سے آزادی کی تحریک تیز ہوئی تھی اور اب بھی یہ نظمیں عوام کے دلوں کو گرماتی ہیں۔

اردو رابطہ کمیٹی کے جلسے کو جو رامپور کی صولت لائبریری میں منعقد ہوا تھا نائب چیرمین ڈاکٹر ملک زادہ منظور اور خان محمد عاطف سابق ایم، ایل، اے نے بھی خطاب کیا۔ ڈاکٹر ملک زادہ نے اپنی تقریر میں کہا شمالی ہند کے تمام فرقوں کی مادری زبان اب بھی اردو ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ سیکڑوں سنسکرت الفاظ ۔۔۔ دوار، سندھیا، پراتہ، آگیا وغیرہ اردو الفاظ یعنی دروازہ، شام، صبح، اجازت وغیرہ کے توسط سے پڑھائے اور سمجھائے جاتے ہیں۔

خان محمد عاطف نے جوش ملیح آبادی کی شاعری کے حوالے سے ایسے متعدد واقعات سنائے جو تحریک آزادی سے متعلق ہیں لیکن ان کا تعلق جوش جیسے انقلابی شاعر سے بھی ہے انہوں نے کہا جوش ہمارا قومی شاعر ہے۔ جو اس لئے وطن چھوڑ کر پاکستان چلا گیا تھا کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل مایوس کن نظر آتا تھا۔ اس حقیقت کا اعتراف کھلے دل سے کیا جانا چاہیے اور جوش اور اردو زبان کو ہندوستانی سماج میں باعزت مقام واپس دیا جانا چاہیے۔

اس موقعہ پر ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی کنوینر اردو رابطہ کمیٹی ضلع رامپور نے ایک روزہ علامتی بھوک ہڑتال بھی کی۔

● قلم کی سربلندی کی قسم اردو زبان کے جہاد میں آپ اور ہم ایک ہیں ●

۱۹۷۲ء میں لکھنؤ میں منعقدہ آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کے مندوبین اور شاہدین ہیں:

۱	کرشن چندر	(صدر)
۲	پنڈت آنند نرائن ملا	(صدر استقبالیہ)
۳	رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری	(جنرل سکریٹری)



۷ نومبر ۱۹۹۰ کو گورداسپور میں
اردو کو پنجاب
میں دوسری سرکاری
زبان بنوانے
کے لئے
ڈاکٹر شان عاطف
عوام کو خطاب
کرتے ہوئے

۳۶ جگدیش سنگھ سرنا
۳۷ بشیشر پردیپ
۳۸ کلدیپ تلوار
۳۹ کرشن کمار طور
۴۰ مسز مایا کھنہ راجے
۴۱ پنڈت دیوی پرشاد مست بریلوی
۴۲ ڈاکٹر پریم لال شفا دہلوی
۴۳ کملاپت سہائے ماہر بلگرامی
۴۴ رانا گنوری
۴۵ اندر موہن مہتہ کیف
۴۶ ہیرانند سوز
۴۷ کشن لال ثاقب
۴۸ اجمیر سنگھ ہنسی
۴۹ گور پرشاد جندل
۵۰ ساحر سنامی
۵۱ راجہ لال راجہ
۵۲ شوق مرزاپوری
۵۳ طالب شاہ آبادی
۵۴ پریم نارائن وہال
۵۵ شیام کشن نگم
۵۶ ایس این سنہا
۵۷ ای، لارنس
۵۸ جگدیش پرشاد ماتھر
۵۹ رام بہاری لال اعظم
۶۰ سورج پرکاش بھاردولی
۶۱ جگر جالندھری
۶۲ فلک مظفر نگری
۶۳ بسمل تیواری
۶۴ نسیم نور محلی
۶۵ پربھان شنکر سروش
۶۶ دواکر راہی
۶۷ پورن سنگھ ہنر
۶۸ رام لعل بھنڈاری
۶۹ شرون کمار ورما
۷۰ رام رتن مظفر
۷۱ روپل سنگھ دیسچیہ
۷۲ اچل سنگھ
۷۳ رمیش سنہا

مشاہدین

۱ علی سردار جعفری
۲ ساحر لدھیانوی
۳ مجروح سلطان پوری
۴ پروفیسر آل احمد سرور
۵ ڈاکٹر ظ انصاری
۶ ڈاکٹر محمد حق
۷ شمس الرحمٰن فاروقی





۵۹ خلیق نگرامی
۶۰ محمد مسعود
۶۱ شہنشاہ مرزا
۶۲ اختر الملک
۶۳ خواجہ محمد یونس
۶۴ مسز اختر محسن یزداں

اُردو پر مسلمانوں سے زیادہ حق ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کا ہے۔

دوسری آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کے مندوبین و مشاہدین :-

۱ پروفیسر گوپی چند نارنگ (صدر)
۲ پنڈت آنند نرائن ملاّ
۳ فراق گورکھپوری
۴ اندر کمار گجرال
۵ رام لعل (جنرل سکریٹری)
۶ پروفیسر جگن ناتھ آزاد
۷ جمنا داس اختر
۸ ڈریا پرکاش سرور تونسوی
۹ برجموہن زتشی گلزار دہلوی
۱۰ ضیا فتح آبادی
۱۱ گنپت سہائے سریواستو
۱۲ ڈاکٹر وشوامتر کیو۔ عالی
۱۳ بلدیو سنگھ ناصر
۱۴ مسز تارن کور
۱۵ برہمندر سنگھ گگن (پاکستانی)
۱۶ پریت پال سنگھ بیتاب
۱۷ دواکر راہی
۱۸ چرنجی جنیوئی
۱۹ آنند رومانی
۲۰ بلدیو متر بجلی
۲۱ ڈی اے ہیرپین قرباں
۲۲ رادھا کرشن سہگل



۱۹۸۱ء آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس لکھنؤ کے مندوبین اور مشاہدین۔ دائیں سے : ڈاکٹر مظفر حنفی، رام لعل، پروفیسر گوپی چند نارنگ، مسز ساحل الہ آبادی، ساحل الہ آبادی، برجموہن گلزار دہلوی، اور پروفیسر محمود الٰہی



اُردو کی ہندوستان میں مقبولیت
میں دو سالہ آل انڈیا
اردو مصنفین کانفرنس
منعقدہ ۱۹۸۷ء کا افتتاح
کرتے ہوئے اردو کے ممتاز
شاعر محترمہ ... سے پہلے
فراق گورکھپوری

مشاہدین

مقبول احمد لاری

۱۹ وحید فاطمہ جائسی

۲۰ احمد عباس ردولوی

اردو رابطہ کمیٹی اتر پردیش کے چیرمین رام لعل نائب چیرمین ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے استاذ و سابق ایم، ایل، اے خان محمد عاطف پر مشتمل ایک وفد نے ۷ر نومبر ۱۹۸۵ء سے ۱۲ر نومبر ۱۹۸۵ء تک درج ذیل اردو علاقوں کا دورہ کرکے اردو عوام کو خطاب کیا۔

۷ر نومبر بریلی مولانا عبدالرؤف کے گھر پر
صدارت محمد خالد

۷ر نومبر رامپور صولت لائبریری میں
صدارت رام لعل

۷ر نومبر مرادآباد جنت نشاں اسکول میں
صدارت رام لعل

۷ر نومبر حسن پور اسکول میں
صدارت مولانا ابوالبرکات

۸ر نومبر تاج پور مدرسہ اسلامیہ تاج العلوم میں
صدر دیوان بابو رام

۸ر نومبر سیوہارا مدرسہ میں
صدر مولانا فرالت حسین

۸ر نومبر دھام پور مسلم مسافر خانہ میں
صدر مولانا عبدالرحیم

۸ر نومبر نور پور مدرسہ اشرف زکریا اسکول میں
صدر حاجی عبدالرزاق

۸ر نومبر شیرکوٹ پبلک پارک میں
صدر پنڈت اندر دھر شرما

۸ر نومبر افضل گڑھ مسجد میں
صدر شیخ سلیمان

۹ر نومبر نہٹور حافظ محمد ابراہیم انٹر کالج میں
صدر صوفی خلیل احمد

۱۰ر نومبر نگینہ عزیز الرحمٰن کے گھر پر
صدر مسعود احمد صاحب

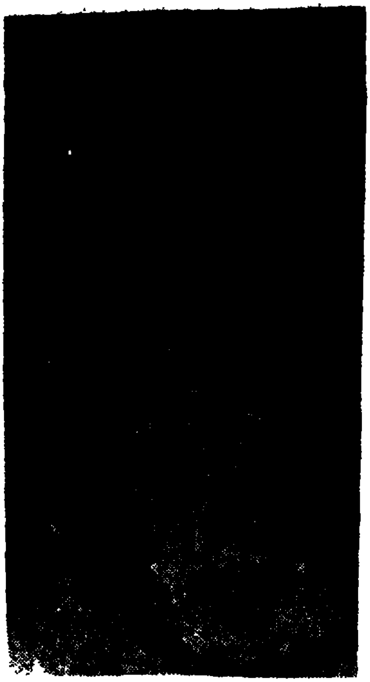




۹ر نومبر نجیب آباد ارشاد احمد صاحب کے گھر پر
صدر رام نارائن کیلا
۱۰ر نومبر رُڑکی ٹاؤن ہال میں
صدر شری کانت گوتم
۱۰ر نومبر دیوبند اسلامیہ مدرسہ میں
صدر ڈاکٹر ایش ویر سنگھ
۱۰ر نومبر کھتولی پبلک پارک میں
صدر بابو رام شرما
۱۱ر نومبر میرٹھ ٹاؤن ہال میں
صدر قاضی الحاج زین العابدین
۱۱ر نومبر بلند شہر لائبریری میں
صدر شمیم عالم (سابق وزیر، یوپی)
۱۲ر نومبر انوپ شہر پبلک پارک میں
صدر نسیم اللہ
۱۳ر نومبر فیروز آباد کارخانے میں
صدر رفیع الدین احمد
۱۳ر نومبر شکوہ آباد قمر حسین کے گھر پر
صدر راکیش پالیوال

اردو تحریک اور آل انڈیا مسلم پروگریسیو فرنٹ

• شیرازی



مولانا احمد مصطفیٰ صدیقی راہی ◄

آل انڈیا مسلم پروگریسیو فرنٹ کا قیام [illegible] میں عمل میں آیا۔ اس کا بنیادی مقصد ملک کی اس عظیم ترین اقلیت کی پروگریسیو قوتوں کو ایک محاذ پر اکٹھا کرنا تھا کہ وہ بھی ملک کی تمام پروگریسیو طاقتوں کے ساتھ شانہ بشانہ چل کر ترقی کی نعمتوں میں مساوی رتبہ کے ساتھ حصہ دار بن سکیں۔ فرنٹ کے بانیوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اقلیتی طبقہ چند قدامت پرست عناصر کے ذاتی مفادات پر مبنی قیادت کی سیاست کا شکار بن کر قومی دھارے کا جزو بننے سے رہ جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آئینی حدود میں حاصل مراعات کا مکمل فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ فرنٹ یہ بھی چاہتا تھا کہ برسرِ اقتدار طبقہ کو اقلیتی طبقہ کے تئیں اس کی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کرایا جاتا رہے۔ آل انڈیا مسلم پروگریسیو فرنٹ کے اغراض و مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ اردو کو اس کا جائز مقام دلایا جائے۔ جو چند تنگ نظر افراد کی تنگ .... نظری کے ہاتھوں وہ مقام حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی جو کہ اصل میں ہونا چاہئے تھا۔ اردو کسی ایک طبقہ کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ سبھی فرقوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں، شاعروں

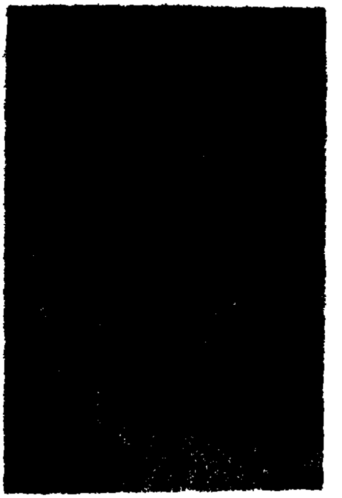
اردو صحافیوں نے اردو کو جنگ آزادی کی سب سے ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو صحافت سب سے پہلے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دے کر آزادی کے متوالوں کا حوصلہ بڑھایا۔ اس کا نعرہ جاوید مجموعہ پنڈت رام پرشاد بسمل کا وہ لافانی شعر ہے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔

کہتے دار پر کہہ کر پھانسی کے پھندے کو گلے لگایا۔

آل انڈیا مسلم پروگریسو فرنٹ کے بانی صدر کی حیثیت سے مولانا محمد مصطفٰے صدیقی راہی کا انتخاب عمل میں آیا جو خود بھی ایک نڈر صحافی، قوم پرست مسلم رہنما اور جنگ آزادی کے ایک قابل احترام سپوت مولانا عبدالوحید صدیقی کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی ادارت میں "اردو ڈائجسٹ"، "ہما" اور "اسلامی ڈائجسٹ"، "ھدیٰ" کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار رہیں۔ ان کے پڑھنے والے برصغیر ہندو پاک کے علاوہ مشرق وسطیٰ اور ہر اس ملک میں ہیں جہاں اردو کے پڑھنے والے موجود ہیں۔ مولانا راہی خود بھی کئی اہم کتابوں کے مصنف اور مختلف سماجی تنظیموں اور اہم اداروں جیسے دلی وقف بورڈ اور دلی حج کمیٹی سے وابستہ ہیں۔

اردو کے محاذ پر منظم اور آئینی حدود میں رہ کر جد وجہد کا عزم فرنٹ کے صدر مولانا راہی کے دل میں اس وقت اور بھی مضبوط ہو گیا جب جنتا وزارت کے دور میں اردو گھر کے افتتاح کی تقریب کے مہمان خصوصی اور اس وقت کے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی نے انتہائی بداخلاقی کے ساتھ اردو والوں سے اہانت آمیز لہجے میں خطاب کیا تھا اور غیر ضروری طور پر اردو کو تقسیم ملک سے پہلے کی مسلم لیگ سے جوڑ کر ایک طرف اپنی تنگ نظری کا ثبوت دیا اور دوسری طرف ملک میں اردو دشمن عناصر کی بلاواسطہ طور پر ہمت افزائی بھی کی۔ ابھی فرنٹ کے صدر مولانا راہی کی یہ ذہنی اور روحانی اذیت کم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اخباروں کے وہ کالم بھی ان کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے جن میں ہندوستان کے اسی جنتا دور کے نائب وزیر



نڈر صحافی مولانا عبدالوحید صدیقی مرحوم

اعظم چودھری چرن سنگھ نے بھی فرمایا کہ اردو غیر ملکی زبان ہے اور ہندوستان میں منگولوں اور ترکوں کی لائی ہوئی ہے۔ اس طرح چرن سنگھ نے بھی جہاں ایک طرف اپنی لسانی عدم واقفیت کا ثبوت فراہم کیا تو دوسری طرف صحیح لسانی شعور رکھنے والوں کے منہ پر داغ لگائے۔ تیسری طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر انہوں نے فرقہ پرستی، تعصب اور تنگ نظری کی چنگاریوں کو ہوا دی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے زمانہ سے ہی یہی روایت رہی ہے کہ جب بھی اقلیتوں کی بات چھڑتی تو اقلیتوں کی زبان کے مسائل کا زیر بحث آجانا ایک لازمی امر بن گیا۔

چنانچہ آل انڈیا مسلم پروگریسو فرنٹ کی قیادت کے ذہن میں بھی اردو اور اردو والوں کے مسائل اور ان سے جڑے ہوئے مختلف سوالات بھی پیدا ہوتے رہے۔ انہی تمام



پہلوؤں کو ذہن نشیں رکھتے ہوئے فرنٹ کے صدر مولانا احمد مصطفےٰ صدیقی راہی نے اردو کے مسئلہ پر سابق وزیراعظم مسز اندرا گاندھی سے تاریخی اہمیت کا حامل ایک انٹرویو لیا اور اسے اردو ڈائجسٹ۔ ھما، کے چودھویں عظیم سالنامہ کے صفحات کی زینت بنایا جو فروری ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ۔ ھما، کا ۱۴۳واں شمارہ تھا۔

مولانا راہی نے اردو کے بارے میں براہ راست سوال کرتے ہوئے مسز اندرا گاندھی سے پوچھا تھا۔

"مادام۔ آپ جانتی ہی ہوں گی کہ اردو زبان اور اس کا اثاثہ مسلمانان ہند کے لئے ایک اہم سوال ہے۔ کیا ازراہ عنایت آپ ان اقدامات سے آگاہ فرمائیں گی جو اردو اور اس کے ادبی اثاثے کو فروغ دینے کے لئے آپ کی حکومت نے کئے ہیں"۔

مسز گاندھی نے کہا۔

"ان کے زمانہ میں پرائمری، سکنڈری اور ڈگری کی سطح تک اردو کی تعلیم اور تفہیم پر خصوصی توجہ دی گئی اور ہزاروں اردو ٹیچروں کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ اردو ایک عظیم زبان ہے اور اس کا تہذیبی سرمایہ ہمیں دل سے عزیز ہے۔ اردو سے مسلمانوں کا جذباتی رشتہ ضرور ہے لیکن یہ زبان دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھی بولتے ہیں۔ اور اردو ہمارے قومی کلچر کا بھی حصہ ہے۔ اردو کے فروغ کے لئے ہم نے مؤثر اقدامات کئے۔ مرکز میں ہم نے اردو بورڈ قائم کیا اور بیشتر ریاستوں میں اردو اکیڈیمیوں کی تشکیل کی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مزید طریقے اور ذرائع معلوم کرنے کی نیت سے گجرال کمیٹی قائم کی گئی۔ یہ ایک مسلسل اور مربوط عمل تھا لیکن جنتا پارٹی کی سرکار کے قائم ہوتے ہی ان تمام پروگراموں کو دھکا پہونچا"۔

جب اردو کی بات چھڑ گئی تو مسلم پروگریسو فرنٹ کے صدر مولانا راہی نے مسز اندرا گاندھی سے ایک اور سوال کیا۔ یہ سوال قدرے تیکھا تھا۔ جو اس طرح ہے۔

"مادام۔ کیا آپ اردو اور اردو والوں کی ترقی سے مطمئن

ہیں۔ اگر نہیں تو کیا آپ کے ذہن میں کچھ ایسے منصوبے ہیں جن پر آپ اردو کی ترقی کے لئے عمل کریں گی۔

مسز گاندھی نے اس سوال پر پہلو بدلا۔ چہرے پر ہمیشہ رہنے والی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی اور انہوں نے مولانا کے دل کی بات یوں کہہ دی۔

"میں یقیناً اردو کی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہوں اور میرا خیال ہے کہ اردو کے فروغ کے لئے فوری اور منظم پیمانے پر اقدامات کئے جائیں۔ ہماری پارٹی پہلے ہی کچھ ریاستوں میں یہ اعلان کر چکی ہے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کیا جائے گا تاکہ کچھ علاقوں میں سرکاری مقاصد کے لئے اسے استعمال کیا جائے۔ جہاں بھی ضرورت ہوگی اردو کی تعلیم کے لئے مزید سہولیات فراہم کی جائیں گی"

اردو کے سلسلہ میں کئے گئے اپنے وعدوں کو عملی جامہ پہنانے کی سمت میں مسز گاندھی نے ۱۹۸۰ء میں دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد اقدامات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اقلیتوں کی فلاح وبہبود کے لئے ۱۵ نکاتی پروگرام کی داغ بیل بھی ڈال دی تھی۔ لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کیا۔ تاہم یہ بات قابل اطمینان ہے کہ قیادت کا بار نہرو خاندان کے جواں سال قائد راجیو گاندھی کے کندھوں پر پڑا ہے جو اردو کے تئیں اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے مسٹر راجیو گاندھی کو کانگریس (آئی) کا جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ اس عہدہ پر رہتے ہوئے انہوں نے کانگریس (آئی) کی ریاستی یونٹوں کے سربراہوں اور ان ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو جہاں کانگریس (آئی) برسر اقتدار تھی، ایک اہم مراسلہ بھیجا تھا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ اردو کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی جائے۔ اسی مراسلہ کی نقلیں تمام مرکزی وزراء کو بھیجی گئیں۔

آل انڈیا مسلم پروگریسیو فرنٹ اردو کے حالات پر



نہرو خاندان کے جواں سال قائد راجیو گاندھی

برابر نظر رکھے ہوئے ہے چنانچہ فرنٹ کے صدر مولانا راہی کے حالیہ دورہ غیر ممالک سے واپسی کے بعد ماہ ...... ۱۹۸۵ء میں ملکی حالات کا جائزہ لینے کے لئے فرنٹ کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا جس میں مختلف اہم قومی اور بین الاقوامی مسائل پر اہم قراردادیں منظور کی گئیں۔ ان قراردادوں کی ایک نقل ضروری کارروائی کے لئے فرنٹ کے صدر مولانا راہی نے وزیر اعظم راجیو گاندھی کو روانہ کی۔ ان میں ایک قرارداد اردو کے متعلق بھی ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ بہار کی طرح اتر پردیش میں بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ اسی قرارداد میں اردو کے متعلق شرپسند نکتہ چینی کرنے والوں کو بھی لگام لگانے پر زور دیا گیا ہے تاکہ اردو والوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہونچے۔ ❁ ❁



دیکھی اک صورت بہت حسینہ | [illegible]
سیکھا کر دلبری کا قرینہ | [illegible]

ان گنت پھول گلشن میں جن سے
سیکڑوں عطر دامن میں جن کے

راہبر نقش پا جس کے چوہیں | گلستاں جس کی خوشبو سے مہکیں
وادیاں جس کے نغموں سے گونجیں | بجلیاں حسن کی بار بار جمکیں

لذتِ زندگی ساز پیکر
تاج مقبولیت تھا جبیں پر

پھول بن کر کلیس مسکرائی | بن کے سرخوں جبیں پہ چھائی
ہر جگہ جس کی جلوہ نمائی | تھی ہر اک دل پہ جس کی حکمرانی

جس سے رونق تھی ہر انجمن کی
اور زینت تھی ارضِ وطن کی

لکھنؤ میں کبھی آگرہ میں | جبتی میں کٹک میں گیا میں
گھومتی پھرتی تھی اک ادا میں | مست رہتی تھی دارالشفا میں

مٹ گئیں آج سب اس کی خوشیاں
چھانتی ہے جو دلی کی گلیاں

وہ کلی بجھ کو شدید جنون میں | لاش لپٹی ہو جیسے کفن میں
سیکڑوں جس پہ عاشق ہوئے ہیں | پوچھتی تھیں ہوائیں چمن میں

کیا ہوا ہے بھلا وہ حسینہ
تھی جو انسانیت کا نگینہ

ہو گئے جس کے اپنے پرائے | رحم جس پر کسی کو نہ آئے
جس کی صورت کسی کو نہ بھائے | ٹھوکریں ہر قدم پر جو کھائے

بن گئی ظلم کا جو نشانہ
ہو گیا جس کا دشمن زمانہ

بال بکھرے ہوئے لب پہ آہیں | شرم سے جس کی نیچی نگاہیں
بند ہیں جس پہ دنیا کی راہیں | در بدر ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے جو

ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھی ہر جگہ
نام تھا اس ابھاگن کا اردو

ایم اے بیگ جہاں آبادی



یادگار مباحثہ

ہسٹر پارلیمنٹ

۲۷ مارچ تا ۲۹ مارچ ۱۹۵۴ء

شیخ حسام الدین

اور

اسلام کا نظامِ تعلیم

مولانا آزادؒ

[redacted]

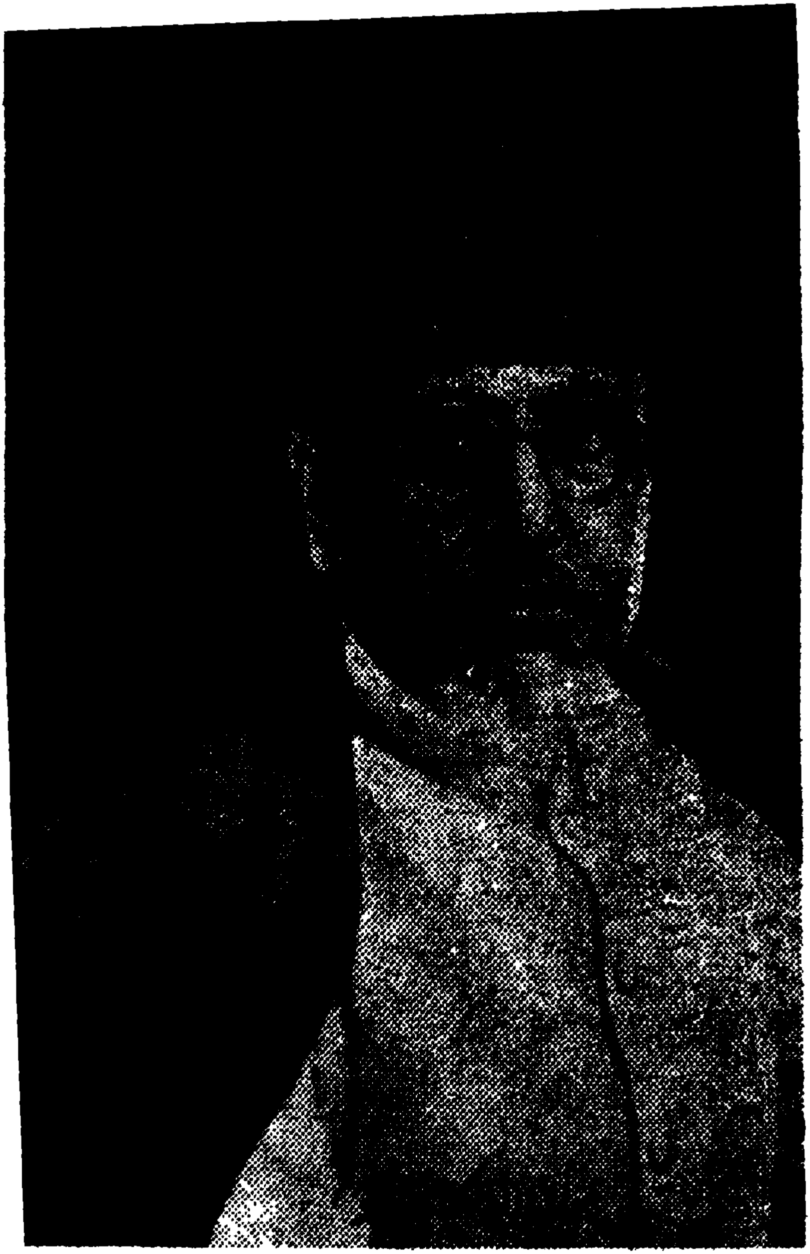
ہندی والوں کو اُن کا لسانی
تعصب لے ڈوبے گا۔ افسوس جو اُردو زبان
اسی ملک کی پیداوار ہے۔ آج اُس کے لئے ہمارا
دماغ تنگ ہو گیا۔

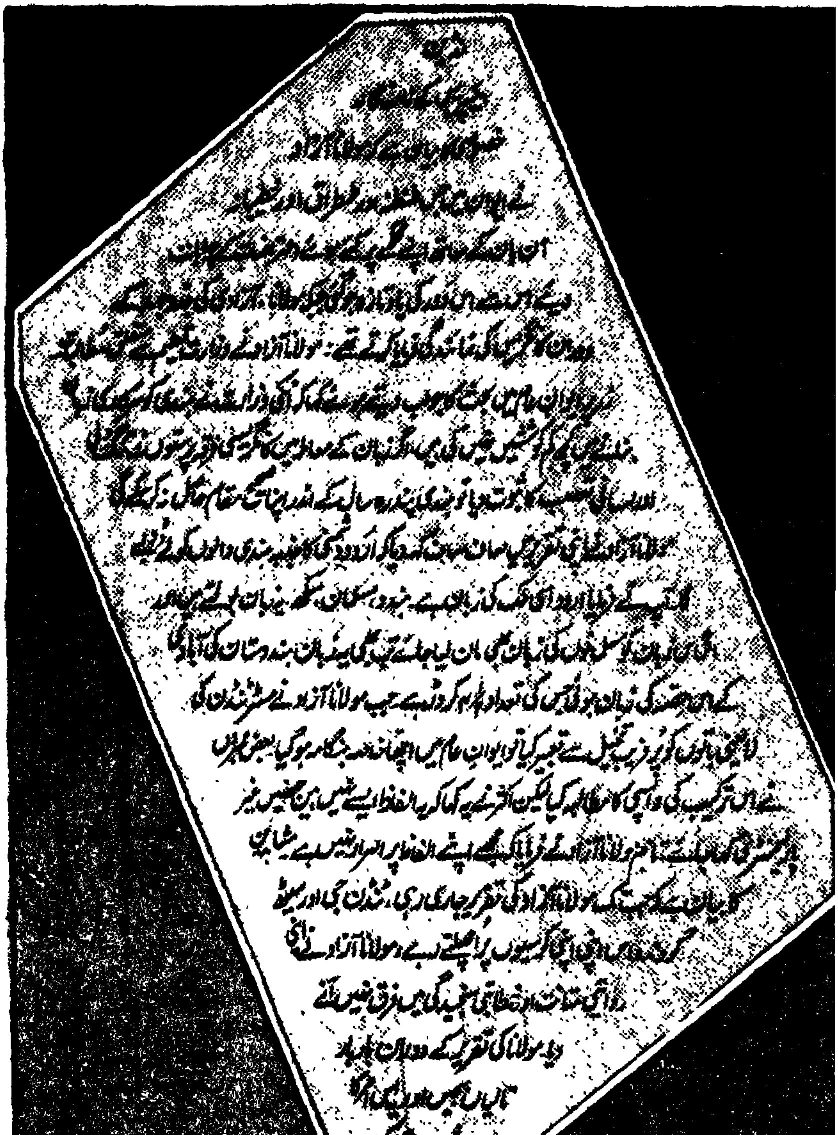
اردو کسی مذہب یا گروپ کی زبان نہیں بلکہ سب
کی زبان ہے۔ اگر اردو کو مسلمانوں کی زبان فرض
کر لیا جائے تو کیا اس ملک کے ساڑھے چار کروڑ باشندوں
کے ادارہ کو امداد دینا اعتراض کی بات ہے؟

میری زندگی

ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ میں بے غرض ہوں اور
جسمیں
غرض نہ ہو اُسے تلوار نہیں کاٹ سکتی۔

(ماخوذ از روزنامہ الجمعیۃ دہلی)





مولانا کو جھنجھوڑ دیتے تھے اس کی تصدیق ہر کسی کو کیا
جسے شک تھا ہیں معلوم ہوتا تھا کہ مولانا نے بھی اسے عین
بچپنا ہو کر دیا ہو۔ اور اللہ ہی ہے مولانا کے مندرجہ ذیل خط میں جو کہا
حسین جذبات نہ ہاں۔
مولانا کی تحریر کا ایک کمال یہ بھی ہے وہ تھا جیسے بیچتا ہوا ہے سنا تھا

میری زندگی یک عمل ہی کی ہے جیسے
آپ زندگی کا تعلق اب پچاس سال پہلے چلا گیا تھا جب
میری عمر ۱۵ سال تھی آج تک یہ لکھا ہے جو اب
بیت زندگی کا بہت بڑا حصہ ختم ہو گیا ہے اب جو باقی ہے
وہی قریب ختم ہے

جس وقت مولانا عبد الماجد دریابادی سے ...
جیسا کہ ... زندگی میں ...

تقریر کا متن

وزارتِ تعلیم کے مطالبات پر کل میرے دوست اچاریہ کرپلانی نے تقریر شروع کی تھی، انھوں نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ تعلیم کا جو سسٹم جاری ہے درست نہیں ہے، اس میں اصلاحات کا ہونا ضروری ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ وزارتِ تعلیم نے اصلاح کا جو قدم اٹھایا ہے اس میں وہ کوئی تجویز پیش کریں گے لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ کہا کہ وزارت اوپر سے نیچے گرنا چاہتی ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے وزارت نے بہت سے اصلاحی اقدامات کئے ہیں اور اس نے پرائمری سکینڈری تعلیم کے متعلق کچھ تجاویز منظور کی ہیں جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے اس بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ یہ بنیادی قسم کی ہوگی۔ یونیورسٹی کی تعلیم پر بھی حکومت نے غور کیا ہے، اس میں سکینڈری ایجوکیشن خاص اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ اصل خرابی وہیں ہے انگریزی حکومت نے ایک خاص مقصد سے تعلیم شروع کی تھی اور چوں کہ ثانوی تعلیم کے بغیر یونیورسٹی کی تعلیم جاری نہیں رہ سکتی تھی اس لئے ثانوی تعلیم بھی جاری کی مگر یہ یونیورسٹی تک پہونچنے کا ذریعہ تھا، اختتامی تعلیم نہیں تھی اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ ثانوی تعلیم میں ایسی اصلاح کی جائے جو ۹۰ فیصدی طلباء کے لئے اختتامی تعلیم کی حیثیت رکھتی ہو۔ چنانچہ مرکزی مشاورتی بورڈ نے نومبر میں ایک کمیٹی اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے مقرر کی جس نے جنوری میں اپنی سفارشات پیش کر دیں بورڈ نے ان سفارشات کو منظور کر لیا۔ اور پھر ٹھوس اقدام کیا گیا اس لئے یہ کہنا کہ اصلاحات کے لئے کچھ نہیں ہو رہا ہے بے معنی ہے۔ آج کل نکتہ چینی کرنا فیشن سا ہو گیا ہے لیکن محض باتوں کا طوطا مینا بنانے سے کچھ نہیں ہوتا، دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اصلاحات کا جو پروگرام بنایا گیا ہے وہ ایک صحیح پروگرام ہے اگر ریاستی حکومتوں نے اشتراک کیا تو ہم تعلیمی نظام کو بہتر بنا سکیں گے جہاں تک یونیورسٹی تعلیم کی اصلاحات کا تعلق ہے اس سلسلہ میں ایک کمیشن قائم ہو چکا ہے جو اصلاحات کی طرف تعمیری قدم اٹھائیگا۔

ٹنڈن جی سے خطاب

اب میں ٹنڈن جی کی طرف مخاطب ہوتا ہوں چونکہ تعلیمی اصلاحات کا تذکرہ شروع ہو گیا تھا اس لئے کچھ الفاظ انھوں نے اس سلسلہ میں کہے لیکن دراصل ان کا آ[illegible] منشا نہ تھا، بہرحال جہاں تک اصلاحات کا تعلق ہے میں ٹنڈن جی سے کہوں گا کہ آپ اپنے دماغ کو تکلیف نہ دیجئے بلکہ یہ کام دوسروں کے لئے چھوڑ دیجئے ٹنڈن جی دراصل ہندی کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے اور اسکے لئے وہ تیار ہو کر آئے تھے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ معاملہ اہم ہے، مرکزی حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس فرض کو پورا کرے کہ پندرہ برس کے بعد سرکاری زبان دیوناگری رسم الخط میں جاری ہو جائے۔ میں خوش ہوتا اگر ٹنڈن جی یہ بتلاتے کہ اس بارے میں جو پروگرام بنایا گیا ہے اس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے ان کو کچھ تجاویز بھی پیش کرنی چاہئے تھیں لیکن افسوس ہے جب طریقہ

پھر انھوں نے اپنی تقریر شروع کی اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کوئی تعمیری تجاویز پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دماغ میں ایک مخالفانہ نقشہ تیار کیا اور اس کی بنیاد پر اپنا مقدمہ بنایا۔ انھوں نے الزام لگایا کہ وزارت تعلیم جو مدد دے رہی ہے وہ ہندی کے لئے نہیں بلکہ ہندوستانی کے لئے دے رہی ہے۔ ایسا خیال انھوں نے اس لئے ظاہر کیا کہ جب دستور ہند میں زبان کے مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی تو میں ہندوستانی کے حق میں تھا۔

مسٹر ٹنڈن (غصے سے کانپتے ہوئے) آپ مجھے غلط طور پر پیش کر رہے ہیں۔ میں نے یہ کہا تھا کہ اس وزارت میں تناسب کا احساس نہیں ہے۔ آپ غصہ میں اپنا توازن کھو رہے ہیں۔

اس کے جواب میں مولانا آزاد نے صرف یہ فرمایا کہ آپ میرے غصہ کی فکر نہ کیجئے۔

ڈپٹی اسپیکر۔ آنریبل ممبران مہربانی فرما کر چیئر کی طرف مخاطب ہوں اور آپس میں بحث نہ کریں۔

مولانا آزاد نے اپنی تقریر جاری رکھی ۔۔۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ٹنڈن جی الزام دیتے ہیں کہ وزارت تعلیم ہندی کے لئے کچھ نہیں کر رہی ہے بلکہ اس کا جھکاؤ ہندوستانی کی طرف ہے یہ سراپا غلط ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ انھوں نے یہ الزام لگا کر کہاں تک دیانت داری سے کام لیا۔

ٹنڈن جی نے یہ بھی کہا کہ حکومت ہندوستانی پرچار سبھا کو مدد دے رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہندی کا نام تک نہیں ہے اور انھوں نے اسی لئے اس کا نام بالکل سننے والوں کے دماغ پر اس کا یہ اثر پڑے کہ حکومت ہندی کی نہیں بلکہ ہندوستانی زبان کی ہمت افزائی کر رہی ہے۔ یہ ایک پُرفریب تخیل ہے۔

ٹنڈن جی (غصہ میں کانپتے ہوئے انگریزی میں) مولانا صاحب وزیر ہو سکتے ہیں لیکن اتنے ایماندار نہیں جتنا کہ میں ہوں۔ جو کچھ میں نے کہا وہ پُرفریب نہیں بلکہ خود ان کی تقریر پُرفریب ہے۔ انھیں زندگی گذارنے کا ڈھنگ مجھ سے سیکھنا ہوگا۔

(کچھ دیر کے لئے شور و غل اور ہنگامہ۔ بہت سے کانگریسی ممبروں نے ان الفاظ کی واپسی کا مطالبہ کیا اور بعض نے زور کے ساتھ کہا کہ یہ الفاظ غیر پارلیمانی نہیں ہیں۔)

مولانا آزاد ۔۔ یہ الفاظ بالکل غیر پارلیمانی نہیں ہو سکتے۔

مسٹر الگورائے شاستری :۔ مسٹر ٹنڈن کے متعلق وزیر موصوف نے دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ ایک "غیر ایماندارانہ" اور "پُرفریب تخیل"۔ یہ دونوں الفاظ غیر پارلیمانی ہیں جنھیں واپس لیا جائے۔

مولانا آزاد :۔ ایک ممبر کو یہ کہنے کا حق ہے کہ دوسرے ممبر نے حقائق ایماندارانہ طور پر نہیں رکھے۔ پُرفریب کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو پیش کیا گیا وہ صاف نہیں تھی۔

مسٹر شاستری :۔ اگر ہمارے سینیئر وزراء ارکان دیگر ایسا ہی رویہ اختیار کریں تو گالیاں شروع ہو جائیں گی۔

مسٹر ٹنڈن :۔ میں نے مولانا کے متعلق ایک لفظ

[illegible]

اردو سب کی زبان ہے

یہ کسی ایک مذہب یا گروپ کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہندو مسلمان اور سکھ کی زبان ہے اور اگر فرض کر لیجئے کہ مسلمانوں ہی کی زبان ہے تو آخر ساڑھے چار کروڑ مسلمان اس ملک میں بستے ہیں۔ ایسی سوسائٹی جو قیمتی خدمت انجام دے رہی ہے، کیا اس کو امداد دینا اعتراض کی بات تھی، کیا محض اس وجہ سے کہ ایک ہسٹری اردو میں لکھی گئی یہ اسلامی کلچر ہو گیا۔ ٹنڈن جی جیسے لوگ جو ہندی کی کوشش میں نظر آتے ہیں وہ اسے ہندی کی حمایت کہیں گے نہ صرف اس لئے کہ وہ ہندی سے محبت کرتے ہیں اس لئے وہ کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے۔ اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اونچا کرو نہ یہ کہ دوسروں کو نیچا کیا جائے۔ جہاں تک شمالی ہند کے رہنے والوں کا تعلق ہے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے خلاف ہو، اور اگر کہیں رکاوٹ ہے تو میں کہوں گا کہ وہ تنگ نظری کی رکاوٹیں ہیں۔

(تالیاں)

جنوبی ہند میں ہندی کی مخالفت کیوں؟

مجھے یاد ہے کہ مدراس میں ایک سوسائٹی نے تامل زبان میں انسائیکلوپیڈیا کا کام اسّی ہزار روپیہ سے شروع کیا تو شور مچ گیا تھا یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جو پریشانی کا باعث ہوتی، لیکن محض اس جذبے سے کہ دوسری زبانوں کو دبایا جائے، اس کی مخالفت کی گئی یہ جذبہ بالکل غلط ہے اس سے ہم ترقی نہ کر سکیں گے، آج اگر جنوبی ہند میں ہندی کے خلاف کچھ جذبہ ہے تو اسی مذکورہ پالیسی کا نتیجہ ہے۔

ہمیں کسی زبان کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہر زبان کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہئے۔ بلاشبہ ہم نے ہندی کو قومی زبان تسلیم کیا ہے اور ہمیں اسے زیادہ سے زیادہ ترقی دینا چاہئے لیکن اگر یہی رویہ رہا تو یقیناً رکاوٹ پیدا ہوگی۔

بے غرض بے پناہ ہوتا ہے

میں لیپا پوتی کی باتیں نہیں کر رہا ہوں اس قسم کی باتیں وہ کرتا ہے جس میں کوئی غرض کا مادہ پایا جاتا ہو میرے اندر کوئی غرض نہیں ہے، میں نے اب سے ۴۰ برس پہلے اپنی زندگی کا ایک پروگرام بنایا تھا۔ اس وقت سے آج تک میری زندگی کھلی ہوئی کتاب ہے، زندگی کا بڑا حصہ ختم ہو چکا ہے، تھوڑا باقی ہے وہ بھی قریب الختم ہے، جس نے اپنے دل سے غرض نکال دی وہ بے پناہ ہو جاتا ہے، بے پناہ کا شاید آپ مطلب نہیں سمجھے میں آپ کو سمجھاتا ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی جس کو کوئی تلوار نہ کاٹ سکے۔ تلوار اس جسم پر چلتی ہے جس میں غرض ہو، اگر غرض نہیں ہے تو کوئی تلوار اس کو نہیں کاٹ سکتی۔

پاکستان کا قیام

مسلم لیگ نے دو قومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان کا مطالبہ کیا اور ایک بڑی مصیبت سے ہم دوچار ہوئے لیکن جتنی ذمہ داری پاکستان کے قیام کے لئے رجعت پسند مسلم فرقہ پرستوں پر ہے اتنی ہی ذمہ داری اس قسم کے دماغوں (ٹنڈن جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پر ہے کیوں کہ اس طرح کی تنگ دلی سے دوسروں کو موقع ملتا ہے اور وہ لوگوں کو مشتعل کرتے ہیں۔

میں نے کہا تھا کہ ہندو دماغ کی نمائندگی یہ لوگ نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ دماغ کرتے ہیں جو گاندھی جی کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں، میں مسلمانوں سے لڑا، ان کے دماغوں کو درست کیا۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ جب تک تنگ دلی سے کام لیا جاتا رہے گا ہم کسی حالت میں ترقی نہیں کر سکتے بلکہ اس سے الٹا نقصان ہوگا

ٹنڈن جی نے "شبلی اکیڈمی" اور "ہندوستانی پرچار سبھا" کا تو ذکر کیا لیکن "ہندی ساہتیہ سملین" کو چالیس ہزار روپیہ کی امداد دی جا رہی ہے اس کا ذکر نہیں کیا۔

مسٹر ٹنڈن :۔ میں نے اس کا ذکر کیا تھا !

مولانا آزاد :۔ اس وقت ذکر کیا جب میں نے اس طرف توجہ دلائی۔ ٹنڈن جی نے "ناگری پرچارنی سبھا" کا ذکر نہیں کیا۔ جس کو ایک لاکھ روپیہ دیا گیا اپنے استدلال کی جو اسٹیٹمنٹ ٹنڈن جی چن رہے تھے ان میں یہ اینٹ نہیں تھی۔

سیٹھ گووند داس کو جواب

اب میں تھوڑا وقت سیٹھ گووند داس کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے لوں گا (معمولی قہقہہ) انھوں نے اپنی تقریر یوں شروع کی کہ ہندی کی راہ میں صرف دو رکاوٹیں ہیں۔ اول انگریزی اور دوم اردو۔ انگریزی کے متعلق انھوں نے کہا کہ میں ان لوگوں کو جو انگریزی کے حامی ہیں بیگانے کا بچہ سمجھتا ہوں (شرم شرم کے نعرے) سیٹھ گووند داس (آپے سے باہر ہو کر نہایت غصے میں) کچھ کہنے کھڑے ہوئے لیکن جو کچھ انھوں نے کہا وہ شور و غل اور ہنگامے میں دب کر رہ گیا۔

مولانا آزاد پر سیٹھ جی نے چیخ چیخ کر اعتراض کیا کہ ذات نے سائنس کے لئے بین الاقوامی اصطلاحات کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں برطانیہ گیا۔ فرانس گیا، کہیں بھی بین الاقوامی اصطلاحات جاری نہیں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا لندن میں "چیرنگ کراس" پر کھڑے ہو کر انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ بین الاقوامی اصطلاحات ان ممالک میں رائج نہیں ہیں؟ میں ایوان کی اطلاع کے لئے بتلانا چاہتا ہوں کہ وزارت تعلیم کا ان اصطلاحات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ فیصلہ یونیورسٹی تحقیقاتی کمیشن نے کیا۔ اس نے یہ سفارش کی تھی کہ سائنس کی بین الاقوامی اصطلاحات کو منظور کر لیا جائے۔ حکومت نے ایک بورڈ بنایا تھا اس نے کمیشن کی سفارش کو منظور کیا۔ اب میں سیٹھ جی سے پوچھوں گا کہ ان اصطلا

کے بارے میں کیا سائنس داں ڈاکٹروں، مثلاً ڈاکٹر بھٹناگر، ڈاکٹر کرشن جیسے سائنس دانوں کی رائے لی جائے یا سیٹھ گووند داس کی، وہ بتائیں کہ کتنے برس انھوں نے سائنس کی دنیا میں بسر کئے ہیں۔

پندرہ سال میں ہندی

اب میں ایوان کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ صرف ہندی کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں، یہ طے ہو چکا ہے کہ پندرہ برس میں ہندی کو لایا جائے۔ حکومت کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ اس کام کو پورا کرے، مگر یہ ایک مشکل کام ہے، نظم و نسق کی زبان کو ہٹا کر دوسری بھاشا لانا آسان کام نہیں ہے وزارت نے جو پروگرام بنایا ہے مجھے امید ہے کہ اس پر عمل کرنے سے ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پندرہ برس تک انگریزی ہی رہے گی اور اگر ہندی کو ساتھ ساتھ بڑھانے پر روپیہ خرچ ہوتا ہے تو حکومت اس کو برداشت کرے گی۔ بعض طبقوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ پانچ برس بعد ہی کیوں نہ ہندی میں کام شروع کر دیا جائے اس قسم کا خیال غلط ہے پہلے پانچ سال کا پروگرام تو اصطلاحات کے لئے بنایا گیا اس میں تین برس گزر چکے ہیں۔ ٹراونکور کوچین تک سکنڈری اسکولوں میں ہندی کر دی گئی ہے، میسور، اڑیسہ، آسام میں بھی لازمی ہے۔ صرف آندھرا اور مدراس میں ثانوی اسٹیج میں ہندی جاری تو کر دی گئی ہے مگر اسے اختیاری مضمون رکھا گیا ہے تاہم جو رپورٹ مل رہی ہے اختیاری مضمون کے باوجود کافی طلبہ ہندی لے رہے ہیں ہنوز اصطلاحات اب تک تیار ہو چکی ہیں۔ ۳۰ اپریل کو بورڈ کا اجلاس بلایا گیا ہے جس میں آئندہ کے اقدامات کے متعلق غور کیا جائے گا۔

مسٹر این سی چٹرجی نے مانبھوم کے متعلق اپنی تقریر میں ذکر کیا تھا۔ ہر کسی کو معلوم ہے کہ وہاں ایک ایسا علاقہ ہے جس کی زبان بنگالی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ بچوں کو ان کی مادری زبان "بنگالی" میں تعلیم دی جائے میں نے ۱۹۴۹ء میں ریاستی وزرائے تعلیم کی کانفرنس بلائی تھی جس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اگر ایسی کمیونٹی ہو جو ہے تو وہ اپنی مادری زبان میں بچوں کو تعلیم دلا سکتی ہے اصول یہ طے کیا گیا تھا کہ اگر اسکول میں چالیس یا ایک کلاس میں دس لڑکے اس زبان کے بولنے والے موجود ہوں تو ان کے لئے مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جائے، یہ سفارش حکومت نے ۹ اگست کو منظور کر لی تھی اور اس کا باقاعدہ اعلان کیا گیا تھا۔ حکومت بہار کی طرف سے جو مراسلہ آیا ہے اس میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس فیصلے کے مطابق کام کر رہی ہے (بعض آوازیں جی ہاں کر رہی ہیں) این۔ سی چٹرجی مجھے ایک مراسلہ بھیج دیں تو حکومت بہار سے معلوم کروں گا کہ اصلیت کیا ہے۔

وزارت خزانہ کا بچا ہوا روپیہ

کہا گیا ہے کہ دو کروڑ روپیہ وزارت تعلیم کے پاس ہے جو خرچ نہیں کیا گیا

دو کروڑ کا معاملہ تو نہیں لیکن ۴۰ لاکھ کا معاملہ ضرور ہے مگر بڑے بڑے آئیٹم ایسے ہیں جن کی ذمہ داری وزارت تعلیم کے سر نہیں۔ مثلاً دس لاکھ روپیہ سائنس انسٹی ٹیوٹ بنگلور کیلئے رکھا گیا تھا وہ سامان آیا نہیں۔ تو وہ روپیہ کس کو دیا جائے۔ "آوازیں: سیٹھ گووند داس جی کو" (پُرزور قہقہہ۔)

کچھ روپیہ سنسکرت کے مسودوں کو چھاپنے کے لئے ہر برس دیا جاتا ہے لیکن پورا سال نکل گیا توجہ دلانے کے باوجود اس سلسلہ میں کوئی اسکیم پیش نہیں کی گئی آخر میں میں ایوان سے اپیل کروں گا کہ وہ ایک منٹ کے لئے بھی یہ نہ سمجھے کہ وزارت تعلیم کا دماغ بند ہے اس کا دماغ بالکل کھلا ہوا ہے جو تجاویز پیش کی جائیں گی ان پر خوش دلی کے ساتھ غور کیا جائے گا: اگر کچھ بدگمانیاں دور نہ ہوں تو میں دور نہیں مجھ سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا معاملہ ہے میں یقین دلاتا ہوں کہ ہندی کے بارے میں وزارت تعلیم پر جو ذمہ داری آتی ہے اس میں وہ کوتاہی نہیں کرے گی۔

ایک ممبر کی توجہ دلانے پر مولانا آزاد نے پنجاب کیمپ کالج کا ذکر کیا اور کہا کہ وزارت تعلیم کو گھٹانا نہیں بڑھانا ہے وہ اپنی طرف سے اس بات کی کوشش نہیں کرے گی کہ ایک تعلیمی چیز کو بند کر دیا جائے۔ مولانا آزاد کی تقریر کے بعد تخفیف کی تحریکوں پر ووٹ لئے گئے اور سب تحریکیں مسترد کر دی گئیں اور اصل مطالبات زندہ تالیوں کی گونج میں منظور کر لئے گئے۔ تالیاں بجانے والوں میں خود وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک تھے حالاں کہ یہ ان کی عادت کے خلاف تھا۔



پنڈت نہرو اور مولانا آزاد اُردو کی بقا کے لئے قدم بہ قدم۔



نازش پرتاب گڑھی

اے ہم سخنو!

پھر میں نے کہا۔ لاؤ، مرا جام مجھے دو
اے بادہ کشو! پھر کوئی الزام مجھے دو

"شعلوں پہ ذرا رقص کا پیغام مجھے دو"
جینے کے علاوہ بھی کوئی کام مجھے دو

اک میں ہی سر دار رہا اور رہوں گا
تاریخ نگارو! کوئی بھی نام مجھے دو

صرف ایک ہی جرعے میں بھرم کھل گیا ساقی
اب کس کا یہ منہ ہے جو کہے جام مجھے دو

سوچا ہے اسے گردِ رہِ شوق بنا دوں
اے ہم سفرو! لاؤ، غمِ شام مجھے دو

عیسیٰ کے مقدر سے جو کچھ چھوٹ گیا ہو
وہ نام۔ وہ الزام۔ وہ دشنام مجھے دو

کہتا ہو جو اشکوں کی زبانی وہ کہو تم
جو خون سے لکھنا ہو وہ پیغام مجھے دو

اس دور میں جینے کی سزا دی گئی ہم کو
جس دور کو ضد ہے کہ ہر الزام مجھے دو

لمحوں سے کہو۔ لذتِ آغاز اُٹھا لیں
میں عہد ہوں، تلخابۂ انجام مجھے دو

شاعر کا تو مفہوم ہے اک بے عمل انساں
اے ہم سخنو! اور کوئی نام مجھے دو

اِس دور میں نازش وہی فنکار بڑا ہے
جو کھل کے یہ کہتا ہو کہ انعام مجھے دو

★ مسلمانوں پر فرقہ واریت کا الزام لگانیوالے آئینہ سامنے رکھیں تو قلعی کھل جائے گی۔

★ اردو بھی قومی زبان ہے، ہندوؤں کی بڑی تعداد اسکی حامی ہے۔

مولانا سید محمد شاہد صاحب فاخری

★ جن لوگوں کی زبان، کلچر اور پرانی روایات خطرہ میں پڑیں گی وہ ضرور پروٹسٹ کرینگے

★ آج کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو مجھکو یا کسی مسلمان کو ہندوستان سے باہر کر سکے۔

★ اگر ہم باقی رہیں گے تو اردو بھی باقی رہے گی

یوپی لیجسلیٹو اسمبلی کے بجٹ سیشن میں (مارچ ۱۹۵۲ء میں) تقریر کرتے ہوئے

حضرت مولانا سیّد محمد شاہد صاحب فاخری

محترم اسپیکر صاحب! یہ بجٹ جو ہمارے سامنے پیش ہے آنکھ بند کر کے نہیں بلکہ آنکھ کھول کر بنایا گیا ہے اور سینچائی کے محکمہ کی طرف سے اطمینان ہے مگر میں منسٹر صاحب سے یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ "نہریں بنانے کیلئے معاوضہ دے کر زمینیں لیا کریں"۔

مولانا فاخری صاحب نے پولیس کے رویّہ کے متعلق تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"مجھے امید تھی کہ گورنمنٹ پولیس کے رویّہ پر نگاہ رکھے گی، گر غازی آباد کے واقعہ پر ہم کو سخت تکلیف ہے۔ کانپور میں بقرعید کے موقع پر مسلمانوں کی گرفتاری نے ہم کو سخت تشویش میں مبتلا کر دیا تھا میں ڈی۔ ایم کے پاس خود گیا مگر انھوں نے اپنے رویّہ پر نظر ثانی نہیں کی۔

وقف بل

وزیر خزانہ حافظ محمد ابراہیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"گذشتہ سال آپ نے وعدہ کیا تھا مگر اب تک وقف بل ہاؤس کے سامنے نہیں لائے۔ صوبہ کے الیکٹرک انسپکٹر اور ان کا آفس ہمارے لئے مستقل مصیبت ہے۔ غازی پور میں بجلی کمپنی آسانی سے بجلی سپلائی کر رہی ہے وہاں حکم ہو چکا کہ نیا انجن چھ سے لگایا جائے اس طرح پر کئی لاکھ روپے کا بار بجلی کمیشن پر پڑ رہا ہے جو نہایت ظلم ہے۔

محکمہ تعلیم پر سخت تنقید کرتے ہوئے مولانا موصوف نے فرمایا۔ وزیر تعلیم نے یا گورنمنٹ نے انٹرمیجیٹ بورڈ بنایا لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کی آبادی جو پچاس ساٹھ لاکھ سے زیادہ ہے اس کو کیوں نظر انداز کر دیا؟ اسمبلی اور کونسل کی طرف سے جو لوگ نمائندے بن کر گئے ہیں ان میں ایک مسلمان بھی نہیں رکھا گیا۔ گورنر صاحب نے نامزدگی کے وقت بھی ایک مسلمان نمائندہ نہیں لیا۔ یہ حالات سخت افسوسناک ہیں۔ آپ مسلمان لفظ سے گھبرائیں نہیں۔ آپ مسلمان نام سے پریشان نہ ہوں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ بھی یوپی کے ہی رہنے والے ہیں۔ وہ بھی برابر کے شہری ہیں اور ان کے حقوقِ شہریت کو کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔

مسلمانوں پر الزامات

مسلم کانفرنس کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا، کل بھی ایک صاحب نے مسلم کانفرنس کے سلسلہ

میں مسلمانوں پر حملے کئے۔ خیر وہ تو ایسی باتیں کہنے کے عادی ہی ہیں۔ لیکن آج پھر ایک بھائی نے جن کی میں عزت کرتا ہوں مسلم کانفرنس اور عام مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کی اور ان کو "غدار" کہا۔ ٹھیک ہے، جہاں تک غداروں کا تعلق ہے اور آج کل فرقہ واریت کے پیدا کرنے اور کرانے والوں کا تعلق ہے، بلوہ کرنے اور کرانے والوں کا تعلق ہے چاہے وہ کسی قوم و ملت کے ہوں ان کو سخت سے سخت سزا دینی چاہئے لیکن مسلم کانفرنس والوں کو جب یہ کہا گیا کہ وہ ہندوستان سے باہر چلے جائیں تو مجھے ضرور تعجب ہوا، میں کہتا ہوں آپ میں اتنی قوت نہیں کہ ایک ہندوستانی کو بھی ہندوستان سے باہر نکال سکیں۔

اصلی فرقہ پرست مسلمانوں پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے والے آئینہ سامنے رکھ کر دیکھیں تو قلعی کھل جائے کیا وہ فرقہ پرست ہیں یا آپ؟ میں تو کہتا ہوں کہ ہم آج یہاں منہ بند کرکے بیٹھے ہیں مگر ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ہم نے ۱۹۱۸ء سے آج تک فرقہ واریت کو قریب نہیں آنے دیا۔

گاندھی جی کا قتل: جو لوگ مسلم کانفرنس والوں اور مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ ان سے عرض کروں گا کہ ہندوستان کا سب سے بڑا مجرم گاندھی جی کا قاتل تھا، غور کیجیے وہ کون تھا؟ اسے بھی ہم نے یہیں سزا دی، اس کو ہندوستان سے باہر نہیں نکالا، کوئی شخص جو ہندوستان کا باشندہ ہے اس کو ہندوستان سے باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ میں سیاسی اعتبار سے اس پارٹی کا ممبر ہوں جو اکثریت میں ہے اور میں آج کوئی ایسی طاقت نہیں دیکھتا جو مجھ کو یا کسی فرد مسلمان کو ہندوستان سے باہر کر سکے میں نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں پر روشنی ڈالی جائے مگر میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یوں ہی اگر آپ نے حقوق غصب کئے۔ اگر آپ نے ایمان داری کے ساتھ توجہ نہیں کی (آپ سے میرا مطلب آپ بھی ہیں اور میں بھی)، تو جن کے علم کا مسئلہ جن کی زبان کا مسئلہ جن کے کلچر کا مسئلہ جن کی پرانی روایات کا مسئلہ خطرہ میں پڑے گا وہ پروٹسٹ کریں گے، اور سخت پروٹسٹ اور وہ تمام چیزیں ہوں گی جن کو آپ پسند کریں یا نہ کریں ان کی آواز دبائی نہیں جا سکتی جنھوں نے تیس برس تک اس ملک کی خدمت کو سیاسی اور مذہبی فریضہ سمجھا ہم مسلمانوں پر اعتراض کرنے والے حضرات! ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں، اگر ہم مسلم لیگ کی جماعت میں شریک ہو جاتے تو دنیا کی لیڈری حاصل کر لیتے، مگر ہم نے اس کو ٹھوکر ماری اور کبھی اس کو منہ نہ لگایا۔

اردو آج بھی فرقہ واریت ہمارے دماغ میں نہیں ہے بلکہ ان کے دماغ میں ہے جو اس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے قبضہ کر کے دنیا بھر کے ناجائز منافع حاصل کرنا چاہتے ہیں، میں کہتا ہوں اور پورے زور سے کہتا ہوں کہ اردو زبان کا مطالبہ ہیں

کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا، وہ یہاں کی قومی زبان ہے اور کسی کی ہمت نہیں کہ اس کو مٹا سکے قومی زبان ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پریسیڈنٹ کے سامنے جو ڈیپوٹیشن گیا تھا اس میں غیر مسلموں کی بھی بہت بڑی اور اچھی خاصی تعداد تھی۔ آپ اس مطالبہ کو کیسے کیمونل کہتے ہیں؟ کل ایک صاحب جو اکثر ایسی باتیں کہنے کے عادی ہیں فرمایا کہ اردو کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اردو کا مطالبہ کریں گے۔ ضرور کریں گے، سختی سے کریں گے اور زندگی کی قیمت پر بھی کریں گے، کوئی حکومت یا طاقت ہم کو اس مطالبے سے روک نہیں سکتی جہاں تک سنسکرت کا تعلق ہے یہ بھی علم ہے اس کی بھی خدمت کریں گے۔ ہندی ہماری نیشنل زبان ہے؛ ہندی ہماری قومی زبان ہے، ہم اپنے مذہب کے سارے لٹریچر اس کے اندر بھر کر رہیں گے، ایک طرف اس کو ساری دنیا کو پڑھائیں گے، دوسری طرف اردو کو بھی باقی رکھیں گے۔ اور انشاء اللہ یہ باقی رہے گی۔ اگر ہم باقی رہیں گے.... تو اردو بھی باقی رہے گی، اور اگر ہم زندہ ہیں تو اردو بھی زندہ رہے گی۔ ہمارے بعد خدا کے ہاتھ میں اس کا معاملہ ہے آپ کا جو جی چاہے وہ کیجئے گا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم گونگے ہیں، ہمارے منہ میں بھی زبان ہے ہم اپنے مطالبات کو برابر جاری رکھیں گے، آپ ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے آج تک کے واقعات دیکھیں اور اس سے پہلے بھی نظر ڈالیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ کس کے چہرے پر فرقہ واریت کی نفرت انگیز جھلک ہے اور کون فرقہ واریت سے ویسی ہی نفرت کر رہا ہے جیسے پہلے کر رہا تھا۔

مسلمانوں کا نمائندہ

اسپیکر کی طرف رخ کر کے فخری صاحب نے کہا کہ "آپ کی یہاں بہت بڑی طاقت ہے۔ مگر ایک اور بہت بڑی قوت ہے جس کا نام خدا ہے میں صرف اسی سے ڈرتا ہوں اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہتا ہوں کہ میں فرقہ واریت کو اپنے دل کے ایک کونے میں بھی جگہ دینے کے لئے تیار نہیں، میں حافظ ابراہیم اور سید علی ظہیر کو مسلمانوں کا نمائندہ نہیں سمجھتا میرا نمائندہ تو پنت ہے (اسپیکر کی طرف اشارہ کر کے) میرا نمائندہ یہاں بیٹھا ہے۔ آپ ہمیں دھمکیاں دے کر ڈرانا چاہتے ہیں، ہم اسی سرزمین پر رہیں گے اور یہیں جئیں گے، بحیثیت مسلمان ہم چار کروڑ ہیں بحیثیت مجموعی ہم بہت بڑی اقلیت ہیں ہمیں کوئی جا نہیں سکتا۔



ہند پارلیمنٹ کی تقریریں

۲۷ مارچ ۱۹۵۴ء کو ایوانِ عام میں وزارتِ تعلیم کے مطالبات زیرِ بحث شروع ہوئی، تو شری پرشوتم داس ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس نے حسبِ معمول اُردو کی مخالفت کی

ٹنڈن جی :-

مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن نے وزارت تعلیم پر بولتے ہوئے حملہ کیا کہ اس نے ہندی کی اشاعت کے لئے صحیح پالیسی اختیار نہیں کی" ہماری قدیم تہذیب ہی صرف ہماری قومی زبان کی بنیاد ہو سکتی ہے۔ ملک میں دو قومی زبانیں نہیں ہو سکتیں، خواہ یہاں کتنے ہی مختلف مذاہب ہوں۔ انھوں نے شکایت کی کہ وزارت ایسے اداروں کو امدادی عطیے دیتی ہے جن کا مقصد ہندوستانی یا اردو کا پرچار ہے لیکن ہندی ساہتیہ سمیلن اور ناگری پرچارنی سبھا جیسے اداروں کی ہمت افزائی نہیں کرتی یہ تجویز کہ اردو رسم الخط ہندی کے ساتھ رائج ہو بے معنی اور خطرناک ہے، اردو تو ایک مصنوعی زبان ہے

جس وقت ٹنڈن جی نے کہا کہ ہندوستانی پرچارنی سبھا کو ایک ڈکشنری مرتب کرنے کے لئے ۶۰ ہزار روپیہ دیا گیا ہے جبکہ اس سوسائٹی کا مقصد ہندوستانی کا پرچار کرنا ہے نہ کہ ہندی کا، تو وزیر تعلیم مولانا آزاد نے ٹنڈن جی کو ٹوکا اور کہا کہ امداد صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی سفارش پر دی گئی ہے جو اس سوسائٹی کے صدر ہیں۔ مولانا نے یہ بھی بتایا کہ ناگری پرچارنی سبھا کو بھی ایک معقول گرانٹ دی جا رہی ہے۔

ٹنڈن جی کو تسکین نہیں ہوئی

انھوں نے فرمایا کہ انکی رائے میں قومی زبان کے لئے ایک آزاد بورڈ بنایا جائے جس میں ناگری پرچارنی سبھا اور دکشنی بھارتیہ ہندی پرچارنی سبھا کے نمائندے شریک کئے جائیں، پھر انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو ہندی کے پرچار کے لئے ایک الگ وزارت قائم کی جائے جس میں ایسے لوگ رکھے جائیں جو ہندی کے پرچار کے لئے پورے دل سے کام کریں تاکہ دس گیارہ سال کے بعد ہندی سماج کے ہر شعبہ کا ایک لازمی جزو بن جائے، ان کی رائے میں بغیر اسکے وزارت تعلیمات ہندی کے پرچار کا کوئی حقیقی کام نہیں کر سکتی۔

سمیلن کے متعلق ٹنڈن جی نے کہا کہ وہ اس وقت ہندی کا سب سے بڑا ادارہ ہے جس کے ۱۰۰۰ مراکز ہیں اور جس کے امتحانوں میں ہر سال دو لاکھ آدمی شریک ہوتے ہیں..... لیکن پھر بھی مرکزی حکومت مرکزی یونیورسٹیوں اور جامعہ ملیہ کو تو امداد دیتی ہے لیکن سمیلن کی کوئی ہمت افزائی نہیں کرتی۔

سیٹھ گووند داس

کانگریسی ممبر نے وزارت تعلیمات پر یہ الزام لگایا کہ

"بھارتی" ہو گئی ہے۔ اس میں انگریزی کی بدبو آتی ہے، اور اسکی وجہ سے، اردو بھی ترقی کر رہی ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے گروبندی کا پرچار کرنے والے فرقہ پرست ہیں: سیٹھ صاحب نے کہا کہ فرقہ پرست تو وہ لوگ ہیں جو ہندوستانی کلچر کے دھارے کے خلاف انگریزی یا اردو کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت میں ان ہی پر فرقہ پرستی کا الزام عائد کرنا چاہیئے۔

انھوں نے کہا کہ:

اردو ملک کی تقسیم کی بنیاد ہے۔ اور تنبیہہ کی کہ اردو کی علاقائی حیثیت کو تسلیم کرنا THIN END OF THE WEDGE ہوگا۔ یعنی ایسا کرنے سے اندیشہ ہے کہ اردو والے انگلی پکڑ کے بھر پہونچہ پکڑ لیں!!...... (از راہ کرم) سیٹھ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ وہ علاقائی زبانوں کی ترقی کے خلاف نہیں ہیں۔

مولانا حفظ الرحمن پارلیمنٹ میں موجود تھے۔ طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ گلے رُکے رہے تھے اور چند روز پہلے سے بخار تھا مگر ان دو ممبروں کی تقریروں نے کچھ ایسا اثر کیا کہ آپ اپنا مرض بھول گئے اور حمایت حق کے ولولہ نے گلے کی شکایت بھی نظر انداز کر دی۔ آپ نے جذبات انگیز اور بصیرت افروز تقریر فرمائی وہ ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب ممبر پارلیمنٹ

آپ نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے اپنی بیس منٹ کی تقریر میں مسٹر ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس کے طرز عمل کے خلاف سخت احتجاج بلند کی اور کہا کہ یہ حضرات دوسروں کو مرعوب کرنے کے لئے پاکستان، مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے بھوت کھڑے کر دیتے ہیں۔ میں یہ بتانے کے لئے کھڑا ہوں کہ حق کی آواز کو ٹنڈن جی کا یہ طریقہ ہرگز نہیں دبا سکتا اور ہمیں ایک منٹ کے لئے بھی مرعوب نہیں کر سکتا۔ ہماری قوم پروری پنڈت نہرو یا دوسرے چوٹی کے قوم پرور لیڈروں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

مولانا موصوف نے فرمایا کہ اردو کو دیس نکالا دینے کی کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ پاکستان کی آڑ میں

مولانا حفظ الرحمن

اردو کی تحریک کا مخالف خود فرقہ پرست اور آئین کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہم نہ پاکستان کے لفظ سے مرعوب ہو سکتے ہیں اور نہ مسلم لیگ کے، ہماری قوم پروری پنڈت نہرو اور دوسرے چوٹی کے لیڈروں سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر یہاں مسلمان موجود ہیں تو اسلامی تمدن بھی زندہ رہیگا۔ اردو کو ختم کرنے کی کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ پاکستان کی آڑ میں ایسی باتیں جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہیں ناقابلِ برداشت ہیں۔

(ماخوذ روزنامہ الجمعیۃ دہلی)

ایسی باتیں کہنا جو کسی طرح بھی مناسب نہیں، ناقابلِ برداشت ہیں اور کوئی خوددار و محبِ وطن اس گمراہ طریقۂ کار کو برداشت نہیں کر سکتا۔

آپ نے ٹنڈن جی کو چیلنج کیا اور کہا کہ اگر یہاں مسلمان موجود ہیں تو اسلامی تمدن زندہ رہے گا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی پوری تقریر درج ذیل ہے۔ :۔

ڈپٹی اسپیکر صاحب !

وزیر تعلیمات کے مطالبہ زر کے سلسلہ میں بہت دیر سے مقررین کی تقریریں سن رہا ہوں۔ شری پرشوتم داس ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس کی تقاریر سن کر میں حیران رہ گیا۔ ان حضرات نے اردو کے خلاف جو رنگ اختیار کیا وہ نہ صرف میرے لئے بلکہ اس ایوان کے لئے بھی ضرور باعثِ تکلیف ہوا ہوگا۔

دلیل کی جگہ جذبات

یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں نے یہ ڈھنگ اختیار کر لیا ہے کہ ایسے معاملات جن کو پارلیمنٹری اصولوں پر سنجیدگی اور متانت کے ساتھ قوتِ دلیل سے سمجھانا چاہیئے۔ ان مسائل کو مشتعل جذبات کے ساتھ نہایت مکروہ رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہماری باتوں میں کوئی دلیل نہیں اور گمراہ کن جذبات کے سوائے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ان مسائل کے دوسرے پہلو اور دوسرے رُخ کو پیش کرنے کے لئے دوسروں کو مرعوب کرنے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے کہ فوراً ہی پاکستان، مسٹر جناح اور مسلم لیگ تین بھوت کھڑے کر دیئے جائیں گویا دوسرا کوئی شخص اگر ٹنڈن جی یا سیٹھ گووند داس کے خلاف بولنا چاہے تو وہ مرعوب ہو کر جرأت ہی نہ کر سکے۔

اسپیکر صاحب !

میں آج اس گمراہ کن طرزِ عمل کے خلاف پُرزور احتجاج کرنے اور یہ بتانے کے لئے کھڑا ہوا ہوں کہ حق کی آواز کو ٹنڈن جی کا یہ طریقۂ کار ہرگز دبا نہیں سکتا۔ اور ایک منٹ کیلئے بھی ہم کو مرعوب نہیں کر سکتا۔

ہم مرعوب نہیں ہو سکتے

ہم نہ پاکستان کے لفظ سے مرعوب ہو سکتے ہیں اور نہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے نام سے۔ اس لئے کہ ہماری قوم پروری پنڈت نہرو اور دوسرے قوم پرور لیڈروں سے کسی طرح کم نہیں ہے اور ہم پر اس قسم کے گمراہ کن مرعوب کرنیوالے الفاظ کا کوئی رتی برابر اثر نہیں پڑ سکتا۔

اُردو کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کو تسلیم کر لینے کے باوجود کہ ہندی راشٹر یہ بھاشا ہے۔ اور پورے ملک کی سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی ہے آیا اردو زبان کو یا دوسری علاقائی زبانوں کو اس ملک میں پھلنے پھولنے کا حق ہے یا نہیں۔

اس میں مطلق دو رائیں نہیں ہیں کہ ہم سب یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ملک کی سرکاری زبان ہندی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ اُردو کو جو اسی ملک کی پیداوار ہے اور ہندو مسلمانوں کے باہمی پریم ساگر کا ایک بہترین نشان ہے اس کو بھی تعلیمی اداروں اور سرکاری عدالتوں میں سرکاری حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔ جو لوگ اردو کو پاکستان کے ساتھ جوڑتے ہیں جیسا کہ ٹنڈن جی کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے یا جو لوگ اس کو

انگریزی کی جگہ دیس نکالا دینا چاہتے ہیں جیسا کہ سیٹھ گووند داس کی تقریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں اس ملک میں نہیں ہونے دی جائیں گی۔ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا اور ان کی پوری مخالفت کی جائے گی۔

شری ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اردو کے خلاف یہ کہہ کر کہ ہم اردو کے مخالف نہیں ہیں زہر اگلنا اور خواہ مخواہ بیچ میں اسلامی تمدن اور ہندو تہذیب و تمدن کی بحثیں لانا اور پاکستان کی آڑ میں ایسی باتیں کہنا جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہیں ناقابل برداشت ہیں اور کوئی خوددار اور محب وطن اس گمراہ کن طریقے کو برداشت نہیں کر سکتا۔

ٹنڈن جی کے غلط الزام کی تردید

ٹنڈن جی کا فرمانا کہ یوپی میں جو تحریک اردو کے بارے میں چلائی جا رہی ہے اور دوسرے پاکستان یا دوسرے مسلم لیگی نظریئے کو زندہ کرنا ہے۔ میرے نزدیک ہی نہیں بلکہ پورے ہاؤس کے نزدیک اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں ٹنڈن جی اور سیٹھ جی دونوں سے گزارش کروں گا کہ اردو کی تحریک کو جس طرح ہم لوگ چلا رہے ہیں وہ صرف مسلمانوں کی نہیں ہے۔ وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور یوپی کے بسنے والے ہر آدمی کی جو اردو سے تعلق رکھتا ہے ملی جلی تحریک ہے۔ اس لئے یا تو ٹنڈن جی فرقہ پرستی کے مفہوم سے واقف ہی نہیں ہیں یا جان بوجھ کر غلط الزام لگانا چاہتے ہیں اس لئے میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ اردو زبان کی تحریک جو یوپی میں چلائی گئی ہے اس کی مخالفت کرنے والا خود فرقہ پرست ہے۔ اور ملک کے آئین کا بہت بڑا مخالف اور دشمن ہے۔

پاکستان کس نے بنوایا مجرم کون کون ہیں

ہم کو خوف زدہ کرنے کے لئے بار بار پاکستان، مسلم لیگ اور مسٹر جناح کا نام نہ لیا جایا کرے۔ یہ توہین آمیز طریقہ ایک منٹ کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ پاکستان اردو نے نہیں بنوایا بلکہ سیاسی بے ایمانیوں، دلوں کے کھوٹ، تنگ نظری اور تنگ دلی نے اس کو چار چاند لگائے ہیں۔ اگر مسٹر جناح اس کے مجرم ہیں تو وہ لوگ بھی ان سے کم مجرم نہیں جن کے دلوں کا کھوٹ تنگ نظری اور تنگ دلی آج بھی نہیں جاتی۔ ہمیں پاکستان کا طعنہ کیا دیا جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب یہ مسئلہ کانگریس کے اجلاس میں زیر بحث آیا تھا تو اس وقت لیڈروں کی تقریروں کے بعد پہلا شخص میں تھا جس نے پورے زور کے ساتھ یہ کہا تھا کہ بزدلانہ طریقہ پر انگریز کی کرائی ہوئی تقسیم کو قبول نہیں کرنا چاہئے، اور تحریک آزادی کو آگے بڑھا کر اپنی قوت سے ملک کو آزاد کرانا چاہئے۔ آج اس بزدلی اور کھوٹ کو اردو کی مخالفت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ لچر بات:۔

سیٹھ گووند داس کا یہ فرمانا کہ آج اتر پردیش میں اردو کی تحریک کامیاب ہوئی تو کل یہی آواز بہار، مدھیہ پردیش، مدھیہ بھارت اور دوسری مختلف ریاستوں سے اٹھے گی اور اس طرح بیسیوں پاکستان بن جائیں گے میں نہیں

سمجھتا کہ پاکستان کا یہ بھوت سیٹھ جی کو اس درجہ کیوں پریشان کئے ہوئے ہے۔ اگر آئین کے مطابق بہار، مدھیہ پردیش، میسور، بھارت اور دوسری ریاستوں میں ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسی اردو بولنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ثابت ہو جائے جس کی بنا پر اردو کو سرکاری طور پر تعلیمی اداروں اور سرکاری عدالتوں میں سہولتیں حاصل ہوں تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ کیا علاقائی زبانوں سے پاکستان بن جایا کرتے ہیں۔ اتنی لچر بات شاید اس ہاؤس میں کبھی نہیں کہی گئی ہو گی۔

دِلوں کا چور فرقہ پرستی کی جڑ

ٹنڈن جی اور سیٹھ گووند داس جی کو یہ سخت صدمہ گذرا ہے کہ وزارتِ تعلیم نے شبلی اکیڈمی، انجمن ترقی اردو اور جامعہ ملیہ کو گرانٹیں کیوں دیں۔ اس سے انکے نزدیک بھارتیہ کلچر کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا، بلکہ ان کے الفاظ میں فرقہ پرستی کو فائدہ پہونچتا ہے۔ میں اس افسوسناک ذہنیت پر انتہائی اظہارِ افسوس کرتے ہوئے گذارش کروں گا کہ دلوں کا یہی چھپا ہوا چور ہے جو دراصل ملک میں فرقہ پرستی پیدا کر رہا ہے اور سچا پریم پیدا نہیں ہونے دیتا۔ جب بار بار کہا جا چکا ہے کہ ہندی سرکاری زبان ہے تو اس کے جس قدر بھی مختلف اداروں کو مدد دے کر قوت پہونچائی جائے ہمیں اس کی خوشی ہے اور ہم اس کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ مرکزی وزارتِ تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی لچر اور پوچ باتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نہ صرف اردو کو بلکہ تمام علاقائی زبانوں کو بھی جو اپنی ترقی کی کوشاں ہیں پوری پوری مدد کرے اور اس طرح ملک کی ہر علاقائی زبان اور ثانوی سرکاری زبانوں

پھلنے پھولنے کا موقع بہم پہونچائے۔

ٹنڈن جی کو چیلنج ......

ہر مذہب کا تمدن زندہ رہے گا

میں ٹنڈن جی کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر یہاں مسلمان موجود ہیں تو اسلامی تمدن، اگر ہندو ہیں تو ہندو تمدن، اگر سکھ عیسائی موجود ہیں تو سکھ عیسائی تمدن سب زندہ رہیں گے اور کوئی طاقت ان تمدنوں کو مٹا نہیں سکتی۔ اگر ٹنڈن جی اسلامی تمدن نہیں چاہتے تو یہ اُن پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ اگر یہ ہندو تمدن نہیں چاہتے تو وہ بھی ان پر زبردستی لادا نہیں جا سکتا۔

بھارتیہ تمدن کیا ہے؟ اس کو کس نے پیدا کیا اور پروان چڑھایا؟

کیا ٹنڈن جی بتا سکتے ہیں کہ جس چیز کا نام انھوں نے بھارتیہ سنسکرتی رکھا ہے کیا وہ یکبارگی ہی آکاش سے پھٹ کر آ پڑی تھی یا دھرتی سے نکل کر سامنے آ گئی تھی۔ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ اسلامی تمدن، ہندو، سکھ، عیسائی تمدن سبھی نے اپنی امتیازی حیثیت باقی رکھتے ہوئے مل جل کر جو مشترک تمدن بنایا ہے، وہ بھارتیہ تمدن یا سنسکرتی کہلا سکتا ہے، اور جس طرح باغ میں گلاب، چنبیلی، چمپا اور جوہی اپنی بہار دکھلاتے ہوئے گلدستہ کی نمائش بنتے ہیں۔ اسی طرح یہ تمام تمدن اپنی اپنی جگہ زندہ اور مضبوط رہتے ہوئے

ہندوستان کے مشترکہ تہذیب کا گلدستہ بناتے ہیں۔ یہ جو لوگ صوبائی زبان کے خلاف یا تہذیب کی بحث اٹھا کر پاکستان کا غلط حوالہ دے کر گمراہ کن جذبات ابھارتے ہیں، میں ان کے خلاف آواز بلند کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ایوان بھی اس بارے میں میرا پورا پورا ساتھ دے۔

وزارتِ تعلیم سے شکایت
مرکز کا فرض ہے کہ صوبوں میں اردو کو اس کا مقام دلوائے

مجھے تو مرکزی وزارتِ تعلیم سے یہ شکایت ہے کہ صوبائی وزرائے تعلیم کی میٹنگ میں جس کی صدارت مرکزی وزیر تعلیم نے کی تھی، اردو کے متعلق جو تعلیمی پالیسی طے پائی تھی آج پنجاب میں خصوصاً اور دوسرے صوبوں میں اس کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ اس لئے مرکز کا فرض ہے کہ وہ تمام صوبوں کو اس پالیسی پر عمل کرائے اور اردو کو وہ مقام دے جو اس کا حق ہے۔

اردو کے لئے کوشش قومی نظریہ پر مبنی ہے

میں اپنی تقریر کو ان مسائل کے بارے میں ان الفاظ پر ختم کر رہا ہوں۔ میں ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ اردو یا تمدن کے مسئلہ پر یا ایسے ہی دوسرے مسائل پر پاکستان، مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے حوالے دے کر آئندہ جذبات کو غلط طریقے ابھارنے کی کوشش نہ کی جائے۔ میرا تو یہ یقین ہے کہ حق کی یہ آواز کہ اردو اسی دیش کے میل ملاپ کی بہترین زبان ہے اور اس کا مقام دلانے کی جو کوشش کی جا رہی ہے وہ قطعاً قومی نقطۂ نظر پر مبنی ہے اسکو ہرگز اس قسم کی مرعوب کن باتیں دبا نہیں سکتیں۔ اردو کی تاریخ میں جس طرح مسلمان شاعر نظر آتے ہیں بالکل اسی طرح ہندو، سکھ اور عیسائی شاعر بھی پیش نظر آتے



[illegible] | رزق و دولت میں ترقی | لڑکے لڑکیوں کی شادی

حصول ملازمت | دست غیب | تسخیر محبت

کے علاوہ

جملہ حاجات

اور ڈھائی سو ۲۵۰ سے زائد مشکلات کیلئے

تیر بہدف عمل و وظائف نقش و تعویذ اور دعاؤں کا موثر مجموعہ

رہنمائے عملیات

مرتبہ: احمد مصطفٰے صدیقی راہی

جسمیں :- بطریق معتبر و مستند احادیث نبوی روایات اولیائے عظام و صوفیائے کرام دینی و دنیاوی فائدوں، جائز و حلال امور اور مشکلات کو آسان بنانے والے سیکڑوں بیش بہا عمل، اوراد و وظائف اور نقش و تعویذ کے علاوہ عملیات کے طریقے۔ جدول ساعت سیارہ شب و روز نقش لکھنے کا وقت۔ نقش بھرنے کی ترکیب اور علوم عملیات سے متعلق ضروری معلومات درج ہیں۔

ہدیہ :- صرف پندرہ ۱۵ روپے (محصول ڈاک علاوہ)

مجلد فوٹو آفسیٹ طباعت اور درجنوں تغروں کے فوٹو خوشنما گرد پوش

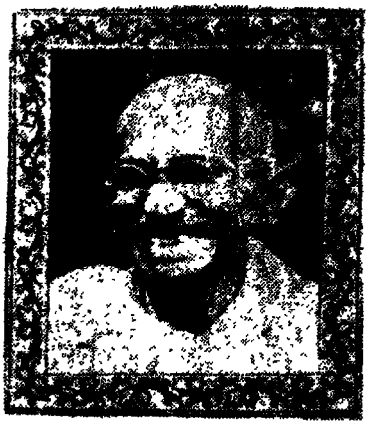
ملنے کا پتہ :- صدیقی اشاعت گھر ۴۸ سنٹرل روڈ جنگپورہ بھوگل نئی دہلی ۱۴

اردو زبان ۱۹۴۷ء کے بعد



(مسعود حسین خاں کے ایک مضمون سے)

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو زبان میں تبدیلیوں کی نوعیت کا تعلق زیادہ تر اس زبان کے ہندوستان میں منصب اور مقام سے ہے۔ اس لیے یہ ایک سیاسی اور عمرانی مطالعہ کا مواد فراہم کرتی ہے نہ کہ لسانیاتی تجزیہ کا۔ آزادی و تقسیم ہند کا سال نہ صرف سیاسی اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اردو زبان پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان زبان کی پوری تاریخ میں منفرد و یکتا ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آزادی سے قبل اردو کے سلسلے میں ایک کل ہند زبان کا تصور عام ہو رہا تھا۔ گاندھی جی کی قیادت میں برسوں تک اس ملک کی سب سے اہم سیاسی جماعت کا لسانی مسلک "ہندوستانی" رہا جو فارسی اور دیوناگری دونوں لپیوں میں لکھی جا سکتی تھی۔ گاندھی جی نے اپنے تحریروں میں فارسی رسم الخط سیکھنے کی ضرورت پر بارہا زور دیا ہے اور خود اس رسم الخط میں بعض دوستوں سے نامہ و پیام کر کے مثال بھی قائم کر دی تھی۔ جہاں تک ہندوستانی ہیئت ترکیبی کا تعلق تھا۔ عام بول چال کی زبان پر زور دیا جاتا رہا یعنی ایک طرف سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ سے گریز اور دوسری طرف عالمانہ و اصطلاحی عربی فارسی الفاظ سے اجتناب۔ ہندوستانی کا یہ تصور کسی لسانیاتی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی نیک نیتی اور مصلحت بینی پر قائم تھا۔ اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ ایک طرف ہندی کی نشوونما میں سنسکرت کا جو رول ہو سکتا تھا اس سے بچانا انجانا پن تھا اور دوسری طرف اردو کے ارتقا میں عربی فارسی کا جو حصہ رہ چکا تھا۔ اس سے دیدہ و دانستہ اغماض چاہا



مہاتما گاندھی

پر آزادی سے پہلے ہی تاریخ کے دھارے پر ہندوستانی کی نیا ڈگمگانے لگی تھی۔ اور اس کے دو کھویا یعنی مہاتما گاندھی اور مولوی عبدالحق اسے مختلف سمتوں میں کھینے کی کشمکش میں گرفتار ہو گئے تھے۔

آزادی آئی لیکن خون میں نہائی ہوئی شمشیر بن کر اس نے نہ صرف ایک ملک کی سیاسی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا بلکہ ایک تہذیب کے دو ٹکڑے کر دیے۔ ایک ہی زبان بولنے والوں کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔

ہندوستانی کا خواب یک لخت کافور ہو گیا۔ ایک مولانا اور ایک پنڈت کا خلوص اور نیک نیتی بھی اسے نہ بچا سکی اس لیے کہ ہندوستانی کوئی زبان نہ تھی بلکہ ایک سیاسی سمجھوتہ تھا۔ ہندوستان کے دو روپ اُردو اور ہندی کی راہیں بیسویں صدی کے آغاز ہی میں متعین ہو چکی تھیں دونوں کے ارتقا کی ڈگر وصل کی نہیں فصل کی تھی۔ دونوں کو علمی زبان کی سطح پر لانے کے لیے ضروری تھا کہ ایک طرف عربی فارسی جیسی کلاسیکی زبانوں کا سہارا لیا جائے اور دوسری طرف سنسکرت کے شبد بھنڈار کا جو ہندوستان کی بیشتر زبانوں کے لیے لازوال ماخذ کا حکم رکھتا ہے۔ تقسیم ہند سے فوراً قبل ہندی اُردو کو یکجا کرنے کی کوششیں بھی بار آور ہو رہی تھیں اور اس کا اثر کم و کم اُردو لغات پر پڑ رہا تھا۔ بیسویں صدی کے ربع الاوّل میں اتحاد و یک جہتی کا نقطۂ عروج تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون و ترک موالات کی شکل میں نمودار ہوا۔ اسی زمانے میں ہندی کے بعض لفظ اُردو صحافت اور خطابت کا لازمی جزو بن گئے تھے سودیشی ستیہ گرہ، اہنسا سماج، سامراج، دیش بھگتی، وغیرہ کا مطالعہ اردو میں اسی دور کی یادگار ہے۔

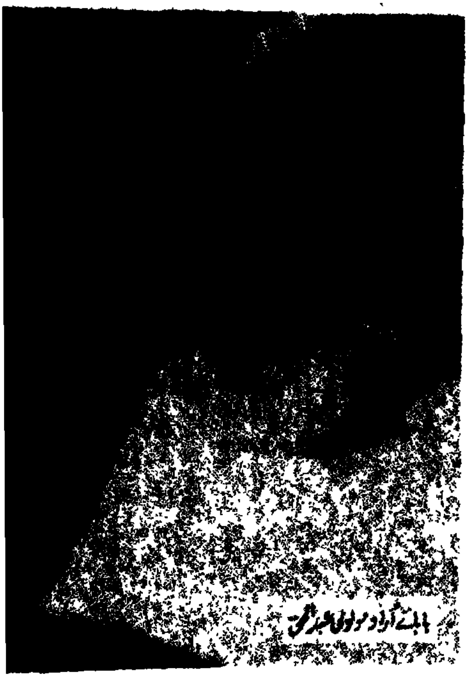
آزادی و تقسیم ہند کے بعد اردو کا منصب یک لخت بدل جاتا ہے تقسیم سے قبل ہندوستانی کی شکل میں اردو کم و بیش ہندی کے ساتھ برابری کی دعویدار تھی دستور ہند کے نفاذ کے بعد ہندی کی کل ہند حیثیت مسلم ہو جاتی ہے دستور ہند سے بہر حال اس ملک میں اردو کے مقام کا تعین ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہو گیا۔ اب اس کی حیثیت ایک ایسے تاجدار کی سی ہے جس کی کوئی مملکت نہ ہو ریاست جموں و کشمیر میں اس کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ حال میں آندھرا پردیش کے لنگویجز ایکٹ میں بھی اس کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ہماچل پردیش نے اسے ثانوی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ لیکن اردو کے گڑھ یعنی اتر پردیش ——— (اور بہار کے کچھ اضلاع میں اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے) نہیں ابھی اس زبان کو ثانوی زبان کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل جامعہ عثمانیہ نے اردو کے سلسلے میں جو بھی اچھا برا کام کیا تھا، اس کا خاتمہ ہو جانے کی وجہ سے اردو زبان میں ترجمہ و تالیف اور اصطلاحات سازی محدود ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پنجاب سے آئے ہوئے اردو دانوں کے سہارے اردو صحافت اور پاپولر لٹریچر کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ لیکن کسی بھی زبان کی اہمیت اور استحکام کا دارومدار پاپولر لٹریچر، فلم یا مشاعرہ پر

نہیں ہوتا۔ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے جب یہ اعلا تعلیمی اداروں، سرکاری انتظامیہ اور عدلیہ میں اظہار کا وسیلہ جانی جاتی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اردو کے شاعر آج بھی مقبول ہیں۔ فلم کی زبان آج بھی مقبول عام اردو ہی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج اردو کو یونیورسٹی کی سطح پر استعمال کیے جانے کے امکانات موہوم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس مخلف تفریحی رسائل کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ "معارف"، "اردو ادب" اور "نقوشِ ادب" جیسے رسائل اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے ہیں۔

اس پس منظر میں اگر سن ۱۹۴۷ء کے بعد اس زبان کی رفتار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حالات اطمینان بخش نہیں ہیں۔ علمی اصطلاحات کے مسئلہ ہی کو لیجیے۔ آزادی کے بعد کسی ادارے یا درس گاہ نے علمی اصطلاحات سازی کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس زبان کی علمی ترقی و توسیع بند ہوگئی ہے۔ علوم پر اردو میں بہت کم لکھا جا رہا ہے۔ صحافت میں بھی چند فنی اصطلاحات کے علاوہ کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ان چند اصطلاحات میں بھی کسی مستند ادارہ یا اکیڈمی کے موجود نہ ہونے کے باعث یکسانیت نہیں پائی جاتی مثلاً یو۔ این۔ او جیسی تنظیم کے لیے اردو صحافت ایک سے زاید اصطلاحیں استعمال کرتی ہے۔

اصطلاحات علمیہ سے قطع نظر کسی بھی زبان کے تجزیاتی نقطہ نظر سے تین سطحات ہوتی ہیں (۱) صرفی (۲) صوتیاتی (۳) نحوی۔

یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ صوتیاتی اور لہجاتی سطح پر سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو میں دوررس تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ تاہم بعض میلانات کی جانب اشارہ کیا جا سکتا ہے جو لسانی عوامل میں نمودار ہونے لگے ہیں۔



بابائے اردو مولوی عبدالحق

صوتیاتی سطح پر اردو اور ہندی میں مابہ الامتیاز فرق ان مستعار آوازوں کا ہے جو عرف عام میں حروف کہتے ہیں اسے جو عربی فارسی سے مستعار لی گئی ہیں۔ اور جن کے ذریعے اردو سماج سے تعلق رکھنے والے شخص کی شناخت با آسانی کی جا سکتی ہے۔ اسی کو عام بول چال میں شین قاف کا درست ہونا کہتے ہیں۔ اس ضمن میں حسب ذیل آوازیں آتی ہیں (ز ژ ع ف خ ق غ) یہ آوازیں اردو رسم الخط میں بعض اوقات دو تین بلکہ چار چار حروف سے ظاہر کی جاتی ہیں مثلاً ز ذ ض ظ سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل ان میں سے بعض کے صحت تلفظ کا اس درجہ خیال رکھا جاتا تھا کہ ہندی ساہتیہ سمیلن جیسے مقتدر ادارہ کی مطبوعات میں مختلف حروف کے تحت نقطے

انگریزی ج (زیڈ) کے مخصوص تلفظ کو ظاہر کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ سنہ ء کے بعد رفتہ رفتہ یہ التزام ختم ہو رہا ہے۔ خصوصاً ہندی بولنے والی نئی نسل اب ان اصوات کے تلفظ کی مطلق پروا نہیں کرتی ہے چونکہ ہندی کے علاقے میں اردو ساج سے تعلق رکھنے والی نسل میں ہندی میں روح بس گئی ہے۔ اس لیے ان مستعار آوازوں کے صحیح تلفظ کی جانب ان کی لاپروائی بڑھتی جا رہی ہے۔ دیہات اور قصبات کے اردو بولنے والے والدین جن کا شین قاف درست تھا ان کے بچے (ذ ج ق اور غ) جیسی آوازوں کا تلفظ صحت کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ ز اور ف کی صورت حال اس لیے بہتر ہے کہ ان آوازوں کو سیکھنے کے مواقع انگریزی کے ذریعے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ جہاں تک (ق) کا تعلق ہے اردو کو ادبی اور تہذیبی زبان کے طور پر استعمال کرنے والا بڑا طبقہ جس کا تعلق پنجاب اور دکن سے ہے اس کی صحیح مخرج سے ادائیگی پر غور نہیں کرتا۔ لازمی طور پر یہ پہلی آواز ہے جو زد پر آئے گی۔ (ژ) کا استعمال بہت محدود ہے اور تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ لائق اعتنا نہیں (غ) کی صورت (ق) سے بہتر ہے لیکن (ز اور ف) کے مقابلے میں یہ کمزور آواز ہے۔ جہاں تک لہجہ کا تعلق ہے ایک دلچسپ تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ کم از کم قصباتی اردو میں سنسکرت کے اکثر الفاظ رکنی (Syllabic) خاتمہ پر متحرک ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اردو ہندی میں یہ خاتمہ ساکن ہوتا ہے لیکن ہندی کے علاقہ میں اردو بولنے والے جو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ہندی مدرسوں کے سکھائے ہوئے لہجے کے مطابق اردو بھی اس طرح کی بول رہے ہیں۔ کاٹری چلتی ہے جو معیاری اردو یا ہندی لہجے کے منافی ہے کہ صحیح تلفظ دونوں میں چلتا ہے۔

صوتیاتی سطح سے قطع نظر صرفی تبدیلیوں کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ سنہ ء کے بعد اردو اسماء کے سلسلے میں چند اہم رجحانات پیدا ہو رہے ہیں۔ ہندی کے زیر اثر نئے ادیبوں کے یہاں "تدبھو" کے مقابلے میں "تت سم" الفاظ کا چلن اردو میں بڑھ رہا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سرکاری نظم و نسق کی زبان میں سنسکرت کے تت سم الفاظ رائج ہو رہے ہیں جن میں سے بعض اردو والوں کے لیے بھی ناگزیر ہو گئے ہیں۔ مثلاً لوک سبھا، راجیہ سبھا، پردھان منتری راشٹرپتی، اپ راشٹرپتی، راج بھون، پرپشد اور ودھان سبھا وغیرہ وغیرہ، ہر چند اردو والے ابھی تک "دینا" اور "وارانسی" کو ہضم نہیں کر سکے ہیں۔ لیکن کشن اور کرشن کے مقابلے میں کرشن چندر، کے مقابلے میں چندر، امرت کے مقابلے میں امرت کی طرف عام میلان ہو چلا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اردو والے جو اب تک صرف عربی فارسی الفاظ کے صحت کا خیال رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہندی کے صحت تلفظ کا بھی خیال کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ ولس کے مقابلے میں وِلّش عام ہو چلا ہے۔

ہندی کا اثر ایسے اسمائے عام کے تلفظ پر بھی پڑ رہا ہے جن میں ہائے ہوز کی بجائے ہائے مخلوط آتی ہے مثلاً اردو کا معیاری تلفظ دلہن ہے لیکن آج بعض شاعر تک اس کا تلفظ دُلھن یا دُلہن (بروزن مدفن) باندھ رہے ہیں۔

اردو اسماء کے تلفظات میں ایک طرف ہندی اثرات بڑھ رہے ہیں تو دوسری طرف سنہ ء کے بعد بڑے پیمانے پر اردو ادب کے ہندی رسم الخط میں منتقل کیے جانے کی وجہ سے تعین تلفظ کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔ اردو رسم الخط میں اعراب نہ لگانے کی وجہ سے الفاظ کا تلفظ تیزی سے پدلتا رہتا ہے۔ لیکن جب وہی عبارت ہندی رسم الخط میں لکھ دی جاتی ہے۔ اور اگر لکھنے والا اردو کے تلفظ سے

بجز اس حالت کے جو کوئی صحت تلفظ کی سند مل جاتی ہے مثلاً اردو میں "کیا" اور "کہا" اور "چھپا"، دور کا "پیاں" اور "دور کا پہاں" اعراب کی عدم موجودگی یا علامت حروف کی جانب سے لاپرواہی کی بنا پر مابہ الامتیاز نہیں۔ لیکن ہندی رسم الخط میں چھوٹے مصوتوں کے بجائے ماترا اور ان کے تقریباً استعمال کی وجہ سے یہ صورت حال ممکن نہیں۔

انگریزی سے روگردانی کے باوجود انگریزی کے الفاظ کے استعمال میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ تحریر و تقریر میں ان الفاظ کا استعمال جاری ہے۔ حتیٰ کہ ڈیڈی، ممی، جیسے الفاظ ہمارے گھروں میں گھس آئے ہیں جو ایک گہرے احساس کمتری کے غماز ہیں۔ اکثر اوقات یہ انگریزی الفاظ اردو میں غلط طور پر لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً "برادرز" کے بجائے "برادرس" اور "گرلز کالج" کی بجائے "گرلس کالج" وغیرہ۔

عربی فارسی الفاظ کے غلط استعمال کی مثالیں عہد جدید کے اکثر مصنفین کے یہاں مل جائیں گی۔ یہ رجحان بڑھ رہا ہے۔ شعرا کے مقابلے میں افسانہ اور ناول نگار اس کے زیادہ بڑے مجرم ہیں۔ ابھی تک خالفت کے بجائے جب کوئی غیر اردو داں "غلافت" کا لفظ استعمال کرتا ہے تو ہم ہنستے تھے لیکن نئی نسل جو فارسی سے بہت کم واقف ہے۔ اس قسم کی بہت سی غلطیاں، اردو کو عطا کر رہی ہے۔

جہاں تک افعال کا تعلق ہے مفرد کے مقابلے میں مرکب افعال کا استعمال اسم اور فعل کی ترکیب سے بھی بنتے ہیں۔ اور صفت اور فعل کی ترکیب سے بھی۔ قدیم اردو اور قصباتی زبان میں مفرد افعال کا کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ لیکن آج ہم ایسے عام بول چال کے مفرد فعل مثلاً کھرچنا، تیورانا، بخشنا، وسوسانا وغیرہ کو ادبی تحریروں میں لاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ اسی طرح جہاں



مولانا عبدالماجد دریا بادی

تک افعال میں زمانہ کا تعلق ہے عام رجحان صرف تین واضح زمانوں کی طرف ہے ان کی ذیلی اقسام کو استعمال کرتے ہوئے اکثر زبان داں گھبراتے ہیں۔ اس کی ظاہر وجہ یہ ہے کہ ذیلی اقسام سے نازک معنیاتی اختلافات کا ابھارنا مقصود ہوتا ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

اردو نحو عرصے سے انگریزی فقروں کے بے ڈھب کا شکار ہے مرحوم مولانا عبدالماجد دریا بادی کی یہ شکایت کہ آج بہت کم ادیب ہیں جو اردو کے فقروں کو انگریزی معنوی ترکیب کے ڈھنگ پر مرتب کرتے

ہوں، بالکل بجا ہے۔ ہماری علمی تحریروں، بالخصوص ناقدین ادب کے یہاں یہ خصوصیت کثرت سے ملتی ہے ذہن جن سانچوں میں سوچتا ہے وہی سانچے اردو نحوی ترکیب پر عائد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بتانا ذرا دشوار ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اس میں کوئی واضح تبدیلی ہوئی ہے۔ انگریزی کے اثرات اس باب میں بدستور قائم ہیں۔ ہمارے جملوں کا دروبست رموز اوقاف کی وجہ سے بھی انگریزی نما ہو جاتا ہے بالخصوص نیم وقفہ (کوما) کے بعد جملہ معترضہ کا داخلہ اکثر اوقات انگریزی انداز کا ہوتا ہے لیکن اس قسم کے اثرات کا سلسلہ ۱۹۴۷ء سے قبل بھی ملتا ہے۔

آخری مسئلہ اردو کے عروض کا ہے۔ کا ہر چند جدید نقطۂ نظر کے مطابق اس کا تعلق قواعد زبان سے نہیں مانا جاتا۔ تاہم قدیم قواعد نویسی کا یہ بھی ایک اہم باب رہا ہے، اس پہ چند باتیں اس سلسلے میں بھی گوش گذار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اردو شاعری اپنے آغاز کے وقت شیخ باجن، شاہ علی جیو گام دھنی، برہان الدین جانم ابراہیم عادل شاہ ثانی وغیرہ کے ہاتھوں میں ہندی عروض سے بھی آشنا رہی ہے۔ تاہم مجموعی طور پر قدیم زمانے سے لے کر تا حال اردو شاعری کا قالب عربی فارسی کا عروض ہی رہا ہے۔ ہندی پنگل کی جانب بیسوی صدی میں باقاعدہ طور پر توجہ عظمت اللہ خاں نے اپنے معرکۃ الآرا مضامین جو رسالہ اردو کے ۱۹۲۱ء کے شماروں میں شائع ہوئے تھے کی تھی۔ اس کے بعد اپنے گیتوں کے مجموعے سریلے بول میں انہوں نے اس کو عملی جامہ پہنانے کی ناکام کوشش بھی کی ۱۹۴۷ء کے بعد ہر چند گیتوں اور لوک گیتوں کی بھرمار ہو گئی ہے تاہم اس باب میں ابھی تک کوئی عظمت جیسا ادبی مجتہد پیدا نہیں ہوا۔ میرے خیال میں اردو گیت ابھی اس نسل کا منتظر ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہوئی ہے۔

مختصراً یہ کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کی اردو میں، ان تمام سیلانات کے بیج ملتے ہیں جن کو بارآور ہونے کے لیے غالباً تین چار دہوں کی ضرورت ہے لیکن ان کے بارآور ہونے کا تعلق ہندوستان میں اردو کے مستقبل اور بقا پر منحصر ہے اور اردو کے مستقبل کا قیاس موجودہ نسل پر نہ کیجئے جو ۱۹۴۷ء سے قبل کی نسل ہے اس کا اس نئی نسل کی نسبت سے کیجئے۔ جو ہندی کے علاقوں میں ہندی، پنجاب میں پنجابی، اردو دکن میں مراٹھی و تلگو پڑھ رہی ہے۔ وہ کیسی اردو لکھے گی۔ اس کا اندازہ دشوار ہے۔ یہ زبان تاریخ کے ایک بڑے سیلاب اور انقلاب کے ایک بھرپور آشوب کی زد پر ہے۔ دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا ●●

اُردو کا سفر

دہلی سے لکھنؤ تک اور ۱۹۱ھ کی آخری صحبت

• عبدالحلیم شرر



دہلی سے لکھنؤ میں کون کون سی چیزیں آئیں اور یہاں آکے انھوں نے کیا رنگ پکڑا؟ سب سے مقدم اردو زبان ہے جو دہلی کے اکثر شرفاء اور سرداران فوج کی زبان تھی جو اب برہان الملک بہادر کے ساتھ لکھنؤ میں آئے تھے۔ یہ زبان دہلی میں پیدا ہوئی اور اس کی شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ ولی گجراتی نے دہلی میں آکے اپنا دیوان پیش کیا اور اپنے نغمۂ پُردلکش سے اہلِ زبان کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ اس نغمے میں کچھ ایسا جادو تھا کہ سنتے ہی سب کی زبان پر یہی نغمہ جاری ہو گیا اور دہلی میں اُردو شاعری شروع ہو گئی۔

ابتداءً چند ہی بزرگ تھے جنھوں نے اُستادی کی شان سے دہلی میں دادِ سخن دینا شروع کی۔ مگر اس زمانے کو اگر اُردو زبان کی طفلی نہیں تو اُردو شاعری کا بچپن کہنا چاہیے۔ دنیائے اُردو کے اُن سابقین الاولین میں سب سے زیادہ صاحبِ علم و فضل اور سب سے بڑے باکمال خان آرزو تھے۔ جنھیں مولانا آزاد مرحوم نے دوسرے دورِ شاعری میں رکھا ہے۔ زمانۂ مابعد کے بڑے بڑے باکمال جن میں سودا، میر، میرزا مظہر جانِ جاناں اور خواجہ میر درد شامل ہیں، سب ان کے شاگرد تھے۔ شاعری اور کمال زبان دانی کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد

ان ہی استادِ اوّل خان آرزو سے پڑھی۔ نواب شجاع الدولہ کے ماموں سالار جنگ نے کمال قدر دانی سے انھیں لکھنؤ بلوایا اور ایک زمانے تک اودھ میں اقامت گزیں رہ کے وہ شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۶ء محمدی مطابق ۱۷۵۶ء) میں خاص لکھنؤ کے اندر رہ گرائے آخرت ہوئے۔ وہی پہلے استادِ اردو شاعری کے تھے اور اُن ہی سے اُردو شعر و سخن کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد پڑی مگر افسوس کہ اُن کی ہڈیاں سرزمین لکھنؤ کے دامنِ شوق سے چھین کے خاکِ دہلی کو سونپی گئیں۔

اس کے بعد اسی دَور کے دوسرے نامی استادِ سخن اشرف علی خاں فغاں نے جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے، قدر دانی کی تلاش میں لکھنؤ کی راہ لی۔ شجاع الدولہ نے نہایت ہی تعظیم و تکریم کی۔ ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک زمانے تک اپنے دربار میں رکھا۔ مگر شعرا نازک خیال سے زیادہ نازک دماغ ہوا کرتے ہیں۔ کسی خفیف سی بات پر رُوٹھ کے عظیم آباد چلے گئے اور شجاع الدولہ کی وفات سے دو برس پہلے وہیں پیوند زمین ہو گئے۔

اب مولانا آزاد کا مقرر کیا ہوا تیسرا دورِ شاعری شروع ہوا جب کہ خان آرزو کے شاگرد نظم اُردو پر حکومت کر رہے تھے۔ اس زمانے کی حالت دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ دہلی اپنے باکمالوں کو اپنے آغوش میں سنبھال نہیں سکی۔ ہر طرح کے صاحبِ کمال اس کی سواد سے نکلتے چلے جاتے ہیں اور جو جاتا ہے پھر نہیں آتا۔ اس کے مقابل لکھنؤ کی یہ حالت ہے کہ جو صاحبِ فن آتا ہے چاہے کہیں کا ہو یہیں کا ہو جاتا ہے۔ مرزا رفیع سودا، میر تقی میر، سید محمد میر سوز جو اس تیسرے دور کے پہلو سمجھے جاتے ہیں سب دہلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آئے اور یہیں پیوندِ زمین ہو گئے۔

اس کے علاوہ جو باکمالانِ سخن اس زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے اور یہیں کے ہو گئے۔ میرزا جعفر علی حسرت، میر حیدر علی حیران، خواجہ حسن حسن، میرزا فاخر مکین، میر ضاحک، بقاء اللہ خان بقا، میر حسن دہلوی، میر ضاحک کے فرزند صاحبِ مثنوی، اور ان ہی کے ایسے بیسیوں شعرا۔ میر قمر الدین منت، میر ضیاء الدین ضیا، اشرف علی خاں فغاں دہلی سے لکھنؤ میں آکے ایک مدت تک رہے اور یہیں چمکے، مگر آخر میں بیرونی قدر دانی کی کوشش سے نکلے اور عظیم آباد میں جا کے نذرِ اجل ہوئے۔ شیخ محمد قائم قائم کا انتقال اگرچہ اُن کے وطن نگینے میں ہوا مگر وہ بھی ایک مدت تک اسی لکھنؤ کی سبھا کے ایک ممبر تھے۔

صرف میرزا مظہر جانِ جاناں اور خواجہ میر درد کے ایسے چند بزرگ دہلی میں پڑے رہ گئے۔ جن کو فقیرانہ قناعت اور مرجعیت کی وجہ سے دہلی میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا اور سجادہ نشینی کی وجہ سے اپنی مسندِ درویشی کو نہ چھوڑ سکتے تھے۔ غرض شاعری کا یہ تیسرا دور وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کی سبھا وہاں سے اکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی اور لکھنؤ میں ایک جوش قدر دانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

اب چوتھا دور شروع ہوا۔ اس کے ارکان بھی اگرچہ دہلی و اکبر آباد وغیرہ کی خاک سے پیدا ہوئے تھے مگر سب کی شاعری لکھنؤ ہی میں چمکی۔ یہیں سے ان کا نام مشہور ہوا۔ یہیں کے مشاعروں کے میرِ مجلس تھے۔ یہ لوگ علی العموم یہیں سے نکلے، یہیں سب یہیں عروج پایا اور یہیں پر کھپ گئے۔ اس دَور کے رُکن رکین جرأت، سید انشا، مصحفی، قتیل اور رنگین وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اپنے عہد میں زبان پر حکومت کر رہے تھے، اور ان کی شاعری کا غلغلہ اس قدر بلند تھا کہ اُن کے سامنے کسی اُردو شاعر کا نام چمک ہی نہ سکا۔ ان سب کی ہڈیاں کہاں ہیں؟ لکھنؤ کی خاک میں۔

اس زمانے میں دہلی کے صاحبانِ مذاق جس کثرت سے لکھنؤ میں آ رہے تھے، اس کا اندازہ سید انشا کی ایک روایت سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے اس عہد کے ایک شریف وضعدار بڈھے اور نوراً نام ایک کسبی کی گفتگو نقل کی ہے جو بزرگ اور کسبی دونوں دہلی کے ہیں، مگر دونوں لکھنؤ میں باتیں کر رہے ہیں۔ بی نوراً کہتی ہیں: "ابی آؤ میر صاحب! تم



محمد حسین آزاد — صاحب اسلوب نثر نگار

تو عید کے چاند ہو گئے۔ دلی میں آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمہیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے۔ اب کی کربلا میں کتنا میں نے ڈھونڈھا کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہ آٹھوں میں بھی نہ چلو تمہیں علی کی قسم آٹھوں میں ضرور چلیو۔ اس کا جواب حضور صاحب نے دیا ہے وہ اگرچہ نہایت ہی دلچسپ ہے، مگر ہم طوالت سے بچنے کے خیال سے اسے چھوڑے دیتے ہیں۔ انھوں نے دلی و لکھنؤ کے موجودہ رنگ پر اعتراضات کئے ہیں اور معاصرانہ شعرا پر پھبتیاں کی ہیں جس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ اُس زمانے میں شرفاء و کملاء [illegible] لکھنؤ میں آ کے بستی جاتی تھیں اور جو رنگ دلی میں پھیلا والوں کی سیر کے رسیا تھے اب کربلا اور آٹھوں کے میلے میں اپنا رنگ جماتے تھے۔

قصص العلماء مولانا آزاد مرحوم نے بعد کے تمام شعرائے دلی و لکھنؤ کو بلا لحاظ امتیاز دو عہد ایک جگہ جمع کر کے اور زمانے کی مناسبت سے کھینچ کے پانچواں دور بنا دیا ہے، لیکن یہ بہت نا انصافی ہے۔ اصلی پانچواں دور صرف ناسخ و آتش کا تھا، جس میں زبان نے نئی وضع اختیار کی۔ بہت سے پرانے محاورے ترک ہو گئے۔ نئی بندشیں پیدا ہوئیں اور اس زبان کی بنیاد پڑی جو بعد کے شعرائے دلی و لکھنؤ میں یکساں طور پر مقبول ہوئی اور قریب قریب وہ زبان بن گئی جو اب ہندوستان میں مستند ہے اور یہی وہ زمانہ تھا جب شاعری کی قلمرو میں پہلے پہل لکھنؤ کا سکہ جاری ہوا۔

اس کے بعد چھٹا دور وہ تھا جب لکھنؤ میں وزیر، صبا، رند، گویا، رشک، نسیم دہلوی، اسیر، نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم صاحبان مثنوی کی شاعری کا نقطہ بلند ہوا اور دلی میں مومن، ذوق، غالب نور شاعرانہ سنا رہے تھے۔ اس دور نے یہاں تک ہے کہ زبان کو بلحاظ خیالات سب سے زیادہ ترقی کے درجے پر پہونچا دیا۔

اس کے بعد ساتواں دور امیر، داغ، منیر، تسلیم، مجروح

جلال، لطافت، افضل اور حکیم وغیرہ کا تھا۔

ان آخری دو صدیوں پر غائر نظر ڈالنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ فصاحتِ زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں کیسی مضبوط جگہ پکڑ لی تھی۔ چند ہی روز میں شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضعداری بن گیا، اور شعراء کی یہاں اس قدر کثرت ہو گئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں نہ ہوئی ہوگی۔ عورتوں تک میں شعر و سخن کا چرچا ہوا اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں، تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی۔

فارسی شاعری کا اصلی الٹھان مثنوی سے ہوا ہے اور یہ صنفِ شاعری ہمیشہ سب سے زیادہ اہم اور باوقعت سمجھی گئی۔ ابتداء فردوسی کی رزمیہ مثنوی شاہنامے سے پڑی پھر نظامی، سعدی، مولانا روم، خسرو، جامی اور ہاتفی وغیرہ نے اس میں اعلیٰ ترین شہرت و ناموری حاصل کی۔ اردو میں میر تقی میر نے چھوٹی چھوٹی بہت سی مثنویاں دہلی و لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں لکھی تھیں، مگر وہ اس قدر مختصر اور معمولی ہیں کہ مثنویوں کے تذکرے میں ان کا ذکر بھی بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی لکھنے کا آغاز اردو میں میر ضاحک کے بیٹے میر غلام حسن حسن سے ہوا۔ جو بچپن ہی میں اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہیں کی صحبت میں ان کا نشوونما ہوا تھا یہیں پرورش پائی تھی اور یہیں کی آب و ہوا کی آغوش میں ان کی شاعری پلی تھی، کیونکہ جس تعلیم اور جس سوسائٹی نے ان کی مثنوی بے نظیر و بدر منیر لکھوائی وہ خالص لکھنؤ کی تھی۔ اسی زمانے میں مرزا محمد تقی خاں ہوس نے مثنوی لیلےٰ مجنوں لکھی اور لکھنؤ میں مثنویت کا مذاق بڑھنا شروع ہوا۔ آتش و ناسخ کے زمانے میں تو ذرا خاموشی رہی، مگر پھر جو یہ مذاق ابھرا تو پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزارِ نسیم، آفتاب الدولہ قلق نے طلسمِ الفت اور نواب مرزا شوق نے بہارِ عشق، زہرِ عشق اور فریبِ عشق لکھیں اور انھیں اس قدر عام نمود و شہرت اور عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر ان مثنویوں کے اشعار چڑھ گئے۔ اس سے پیشتر کے زمانے میں کسی صاحب نے مثنوی میر حسن کے جواب میں لذتِ عشق نام ایک مثنوی لکھی تھی۔ وہ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کے ساتھ شائع ہونے کی وجہ سے انہی کی جانب منسوب ہو گئی، لیکن حقیقت میں نہ وہ ان کی ہے اور نہ ان کے زمانے کی ہے۔

ان سب مثنویوں کو دیکھتے ہوئے مثنوی گلزارِ نسیم باوجود عام مقبولیت کے صدہا غلطیوں سے مملو ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نازک خیال نومشق ہے جو ہر قسم کی شاعرانہ خوبیاں اپنے کلام میں پیدا کرنا چاہتا ہے، مگر قادر الکلامی کے نہ ہونے سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے اور کسی جگہ اپنے مقصد کو نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کے جواب میں آغا علی شمس نے جو ایک بہت ہی کہنہ مشق شاعر تھے اسی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی، جس میں غلطیوں سے پاک رہ کے تشبیہات استعارات اور رعایتِ لفظی کے کمالات دکھائے تھے، مگر افسوس وہ مثنوی مٹ گئی اور گلزارِ نسیم کو جو شہرت حاصل ہو چکی تھی اس پر غالب نہ آسکی۔ دہلی میں انہی دنوں مومن خان نے چند چھوٹی چھوٹی بے مثل مثنویاں لکھیں جو بہت ہی مقبول اور مشہور ہوئیں۔

مومن خاں کے مذاقِ شاعری میں نازک خیالی بڑھی ہوئی تھی۔ خیالی تشبیہوں اور استعاروں پر وہ اپنی سخن آفرینی کی عمارت قائم کرتے تھے۔ مثنویوں میں وہ زیادہ تر خیالی جذبات و صفات کو مشخص کر کے اپنے کلام میں ایک خاص لطف پیدا کیا کرتے تھے۔ مومن خاں کے ایک شاگرد نسیم دہلوی لکھنؤ میں آئے اور یہاں کے مشاعروں میں اپنا رنگ ایسا جمایا کہ بہت سے لوگ ان کے شاگرد ہو گئے۔ نسیم دہلوی نے لکھنؤ میں اپنے استاد کے رنگ کو خوب چمکایا اور ان کے شاگرد تسلیم لکھنوی نے اردو مثنویوں میں نظیری و عرفی و صائب کی سی خیال آرائیاں دکھا دیں اور نظمِ اردو میں جیتے جاگتے نیچی دلفیسیت لاکے کھڑے کر دیئے۔ ادھر آخر زمانے میں مولوی میر علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی نے شراب کی مذمت میں ساقی

نما مثنویے کے نام سے ایک ایسی بیانیہ اور اخلاقی نظم اُردو پبلک کے سامنے پیش کر دی کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ مومن خاں کی چند مختصر مثنویوں سے قطع نظر کر لی جائے تو اُردو مثنوی گوئی کا آغاز بھی لکھنؤ میں ہوا اور ترقی بھی یہیں ہوئی۔

بعض حضرات مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم کے ذریعے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مقابلہ و موازنہ کیا کرتے ہیں۔ جس خیال کو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اور زیادہ قوت دے دی۔ لیکن اوّل تو گلزار نسیم کو نظیر اکبرآبادی کے بنجارہ نامے کی طرح اگر شہرت مل بھی گئی تو اُسے مثنوی میر حسن کے مقابلے میں رکھنا اردو شاعری کی سخت تذلیل و توہین ہے۔ صحیح مقابلہ ہو سکتا ہے تو مثنوی میر حسن اور مثنوی طلسم اُلفت کا۔ اور اگر گلزار نسیم کی زبان زبردستی لکھنؤ کی زبان مان بھی لی جائے، تو مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم کا مقابلہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا نہیں۔ بلکہ خود لکھنؤ کی اگلی پچھلی زبانوں کا مقابلہ ہے۔ اس لئے کہ مثنوی میر حسن لکھنؤ کی پہلی زبان کا نمونہ ہے اور یہ آخری زبان کا۔

شاعری کی ایک اہم اور قدیم ترین صنف مرثیہ خوانی ہے۔ قدیم عربی شاعری میں زیادہ تر مرثیے اور رجز ہی شعر و سخن میں اظہارِ کمال کا ذریعہ تھے۔ فارسی میں مرثیہ خوانی کمزور رہ گئی تھی لیکن بعہدِ سلاطین صفویہ ایران میں مذہب شیعہ کو فروغ حاصل ہوا تو مصائب اہل بیت رسالتؐ کی یاد تازہ کرنے کے لئے شعراء کو مرثیہ خوانی کی طرف توجہ ہوئی۔ مولانا محتشم کاشی نے چند بندوں کا ایک بے مثل مرثیہ لکھا تھا جو عموماً مقبول ہوا۔ اس کے بعد سے رواج تھا کہ شعراء کبھی کبھی ماتم حسینؓ میں دو ایک مرثیے بھی موزوں کر دیا کرتے۔ لیکن شعر و سخن کی دنیا میں مرثیہ گوئی کی وقعت اس قدر کم تھی کہ مشہور تھا، بگڑا شاعر مرثیہ گو۔

پھر جب مذہبی اعتبار سے دولت صفویہ مرحومہ کی جانشین اودھ کی سلطنت قرار پائی، تو لکھنؤ میں مجالس کی ترقی و عزاداری کے جوش و خروش نے مرثیہ گوئی کی ایسی قدر دلائی کہ اس فن



حضرت امیر خسرو (؟)

کو غیر معمولی عروج حاصل ہونا شروع ہوا اور دراصل لکھنؤ کے عروج کا سارا راز اسی تاریخی واقعے میں مستتر ہے۔ ہندستان میں مغلوں کی سلطنت تھی جنھوں نے فارسی زبان کو درباری زبان قرار دیا اور فارسی معاشرت اُن کی امیرانہ زندگی اور اُن کے تمام کمالات کا مرکز تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایرانی ہندستان میں آتے ہی آنکھوں پر بٹھایا جاتا اور اس کی ہر حرکت اور ہر وضع مقبولیت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی۔ دہلی کی سلطنت میں بادشاہوں کا مذہب سُنّی ہونے کی وجہ سے ایرانی اپنی بہت سی باتوں کو چھپاتے اور وہاں کی محفلوں میں اس قدر شگفتہ نہ ہونے پاتے جس قدر کہ وہ اصل میں تھے۔ اودھ کا دربار شیعہ تھا اور یہاں کا خاندان حکمرانی خاص خراسان سے آیا تھا۔ اس لئے یہاں ایرانی بالکل کھل گئے اور اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہونے کی وجہ سے وہ جس قدر شگفتہ ہوئے اسی قدر زیادہ ہم مذہبی کے باعث یہاں کے اہل دربار نے اُن کے اوضاع و اطوار کو حاصل کرنا شروع کیا اور ایرانیت جو دراصل

سلسان اور عباسی شان و شوکت کے آغوش میں پلی ہوئی تھی چند ہی روز کے اندر لکھنؤ کی معاشرت میں سرایت کر گئی۔

غرض سودا و میر کے زمانے میں میاں سکندر، گدا، مسکین اور افسردہ مرثیہ گو تھے جو چھوٹی چھوٹی نظمیں شہادت حسین کے بیان میں تصنیف کر کے مجلسوں میں سُنا دیا کرتے۔ ان کے بعد میر خلیق اور میر ضمیر نے مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی اور مرثیوں کی موجودہ وضع ان ہی کے زمانے میں ایجاد ہوئی۔ یہاں تک کہ زمانہ میر ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر اور میر خلیق کے صاحبزادے میر انیس کو ناموری کے شہ نشین پر لایا اور ان دونوں بزرگوں نے مرثیہ خوانی میں ایسے ایسے کمالاتِ شاعری دکھائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کے چمکے۔ وہی مقابلہ جو میر و سودا اور آتش و ناسخ میں رہا تھا، اب میر انیس اور مرزا دبیر میں قائم ہوا۔ مرزا دبیر میں شوکت الفاظ تھی۔ بلند خیالی تھی اور علم و فضل کا زور تھا۔ میر انیس میں سادگی بے تکلف اور جذباتِ انسانی پر حکومت کرنے والی زبان کی وہ خوبیاں تھیں جو سوا مبدء فیاض کی عنایت کے سیکھنے سے نہیں آسکتیں۔ ان دونوں بزرگوں نے فنِ مرثیہ گوئی کو شاعری کی اور تمام اصناف سے بڑھا دیا اور ادب اردو میں وہ نئی چیزیں پیدا کر دیں جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبیعتیں ڈھونڈھنے لگی تھیں۔

انیس و دبیر نے مرثیہ گوئی کو اس درجہ کمال پر پہونچا دیا تھا کہ اب مرثیہ گوئی بجائے معیوب ہونے کے سب سے بڑا شاعرانہ ہنر بن گئی تھی۔ تمام اہل لکھنؤ ان دونوں بزرگوں کے اس قدر معترف و مدّاح ہوتے کہ سارا شہر دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر شخص یا انیسیا تھا یا دبیریا۔ یونانیوں کے بعض مقرروں اور خطیبوں کی نسبت سُنا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تقریروں میں اثر پیدا کرنے کے لئے خاص خاص کوششیں کی تھیں اور آواز کے نشیب و فراز اور اوضاع و اطوار کے تغیرات سے گفتگو میں اثر پیدا کرتے تھے اسلام کی اس طولانی عمر میں اس نہایت ضروری فن کو اصول کے ساتھ خاص میر انیس نے زندہ کیا۔ الفاظ کے مناسب آواز کے تغیرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے۔ کلام کو اعضا و جوارح کے متناسب حرکات اور رفتار و حال کے اشارات سے قوت دینے کا فن خاص لکھنؤ کی اور وہ بھی میر انیس کے گھرانے کی ایجاد ہے۔ جس کی ترقی میں اب تک کوششیں جاری ہیں اور ہمارے اسپیکر اپنی فصیح البیانی میں اثر پیدا کرنے کے لئے اگر ان باکمالوں کی شاگردی کریں تو نہایت ہی کامیاب اسپیکر ثابت ہوں۔

ڈراما کا فن سخن جو مغربی شاعری کی جان ہے اس سے عربی و فارسی کا ادب مطلقاً خالی تھا اور فارسی کی شاگردی کی وجہ سے اُردو میں بھی اس کی طرف کبھی توجہ نہیں کی گئی سنسکرت میں اعلیٰ درجے کے ڈراما تھے۔ مگر ان سے ہندوستان کی آخری سوسائٹی بالکل ناآشنا ہو چکی تھی۔ رام چندر جی اور سری کرشن جی کے کارنامے البتہ ہندوؤں میں مذہبی آداب کے ساتھ دکھائے جاتے تھے، مگر اُردو شاعری کو اُن سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ رام چندر جی کے حالات انگلستان کے اُلمپیا کی طرح کھلے میدانوں میں رزمیہ نقالیوں کی شان سے دکھائے جاتے اور سری کرشن جی کے حالات رقص و سرود اور موسیقی کے پیرائے میں مذہبی اسٹیجوں پر بعینہٖ اوپیرا کی طرح سے نظر آتے جو "رہس" کہلاتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی اور رہس کے پلاٹ سے ماخوذ کر کے انھوں نے اپنا ایک ڈراما تیار کیا جس میں وہ کنھیا جی بنتے یا عشق کے ستائے ہوئے جوگی بن کے دھونی رماتے اور بہت سی عورتیں، پریاں اور عاشق مزاج گوپیاں بن کے انھیں ڈھونڈھتی پھرتیں۔ پھر جب قیصر باغ کے میلوں کا دروازہ عوام الناس کے لئے بھی کھل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈراما کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور شعرا بھی اس زمانے کے مذاق کے موافق طبع آزمائیاں کرنے اور ڈراما لکھنے لگے۔

واجد علی شاہ کے شوق کے ساتھ ہی میاں



انیس و دبیر ـــ اپنا اپنا رنگ ہے۔

امانت نے جو ایک مشاق شاعر تھے ، اندر سبھا لکھی اور موجودہ عہد کی کمپنیوں کی طرح شہر میں جابجا مختلف جماعتیں ان کی "اندر سبھا" کو اسٹیج پر کھیلنے لگیں، جن میں کہیں عورتیں اور کہیں لڑکے ایکٹ کرتے۔ اس "اندر سبھا" میں اصولِ موسیقی کے مطابق دلکش دھنیں قائم کی گئیں اور سارا شہر "اندر سبھا" کے جلسے دیکھنے کا مشتاق ہوا۔ میاں امانت کی اندر سبھا کی کامیابیاں دیکھ کے اور لوگوں کو بھی شوق ہوا اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے ایجاد ہو گئے اور سب کا نام "سبھا" قرار پا گیا۔ چنانچہ شہر میں مداری لال وغیرہ کی بہت سی سبھائیں قائم ہو گئیں جن کے پلاٹ بدلے ہوئے تھے۔

سبھا کے نئے رنگ نے شہر میں ایسی زندہ دلی پیدا کر دی کہ سوا اندر سبھا کے لوگ کسی اور قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ ہر طرف سبھاؤں کی دھوم تھی اور اس کی بنیاد پڑ گئی کہ سوسائٹی کے مذاق کے مطابق اگلے عاشقانہ قصے نقل کے طور پر اچھی نظموں میں اور دلکش مضمون کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ پارسی تھیٹر والوں نے اپنی انتظامی خوبیوں اور نمائشی دلفریبیوں کی وجہ سے سبھاؤں کا رنگ پھیکا کر دیا، لیکن یہ نہ سمجھو کہ ڈراما کا دوہرا مذاق جو لکھنؤ میں ایجاد ہو کے مروج ہوا اختتام کو پہنچ گیا۔ اوّل تو پارسیوں نے بھی اس چیز کو لکھنؤ سے لیا ہے۔ ان کا پہلا عام کھیل امانت کی اندر سبھا تھا اور باوجود اس کے لکھنؤ کے تمام قومی جلسوں میں آج تک سپیرے، ہرش چندر وغیرہ کے ایسے بیسیوں پر فارمس ہو رہے ہیں اور اس مذاق کے ایکٹروں کا ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا تھا جو شرفا میں سے قومی مذاق اٹھ جانے پر بھی عوام کو محظوظ کرتا ہے۔ بہر تقدیر اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ڈراما کی بنیاد خاص لکھنؤ ہی میں پڑی اور یہیں سے سارے ہندوستان میں اس کا رواج ہوا۔

اردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہے۔ یہ خاص قسم کے عاشقانہ مسدس ہوتے ہیں۔ اور ان کا مضمون عموماً یہ ہوتا ہے کہ پہلے اپنے عشق کا اظہار۔ اس کے بعد معشوق کا سراپا، اس کی بیوفائیاں، پھر اس سے رُوٹھ کے اُسے یہ باور کرانا کہ ہم کسی اور معشوق پر عاشق ہو گئے۔ اس فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف کر کے معشوق کو جلانا، چھیڑنا، جلی کٹی سنانا اور یوں اس کا غرور توڑ کے پھر ملاپ کر لینا۔ نظم اردو کی یہ قسم لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی۔ زمانۂ وسطی کے قریب قریب تمام شاعروں نے واسوخت لکھے ہیں اور ان میں بڑے بڑے لطف پیدا کیے ہیں۔ دہلی میں بھی بعد کے زمانے میں مختلف واسوخت

لکھے گئے۔ خصوصاً مومن خاں نے کئی بہت اچھے واسوخت لکھے، مگر آغاز لکھنؤ ہی سے ہوا۔

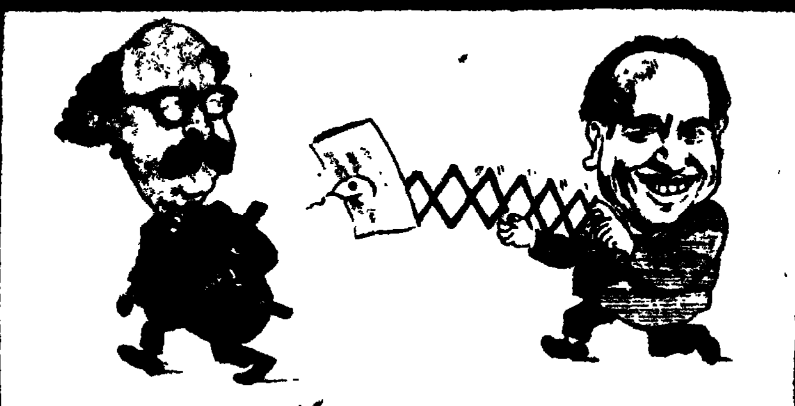
اُمراء کی عیاشانہ طبیعتوں نے شاعری کی کئی اور صنفوں کو بھی پیدا کیا جن کا آغاز دہلی ہی سے ہوا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مبتذل ہزل گوئی ہے اور کسی قدر پُرلطف ریختی ہے۔ ہزل گوئی کا آغاز دہلی میں جعفر زٹلی سے ہوا جو غالباً محمد شاہ کے زمانے میں تھے۔ اُن کے کلام کو میں نے اوّل سے آخر تک دیکھا ہے۔ سوا فحش گوئی اور حد سے گزری ہوئی بیحیائی کے نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر آتا ہے اور نہ زبان کا کوئی لطف ہے۔ اس کے بعد دہلی ہی کی خاک نے صاحبقراں تخلص بگلا کے ایک ہزل گو لکھنؤ میں آ کے اور یہیں چمکے۔ ان کا نام سید امام علی تھا۔ اور آصف الدولہ کے زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے مبتذل مذاق والے رئیس زادوں میں اُن کا نشو و نما ہوا۔ اُن کا دیوان ملتا ہے اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسوں دور ہے مگر پھر بھی اس میں ایک بات ہے۔ شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ زبان اور محاوروں کا پورا لطف ہے، لیکن اس فن کو لکھنؤ کے آخری دَور میں میاں مشیر نے جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے کمال کے درجے کو پہونچا دیا۔

مجھے اس موقع پر یہ لحاظ اس کے کہ شیعوں اور سنیوں کے متعصبانہ جذبات کا لحاظ کروں، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ میں جب شیعہ سلطنت قائم ہوئی تو شیعیت نے اپنے اصلی رنگ کو قائم رکھ کے کمال آزادی کے ساتھ اپنے ہر اصول میں ترقی شروع کی۔ مذہب شیعہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک تولّا یعنی اہل بیت کرام اور خاندان نبوت کے ساتھ اظہارِ محبت اور دوسرا تبرا یعنی اس خاندانِ محترم کے دشمنوں سے اپنی برأت ظاہر کرنا۔ جس نے باہمی رقابت و تعصب کے بڑھنے سے سبّ و شتم کی صورت اختیار کر لی...

اصولاً اس عقیدے میں سُنی بھی ان کے ساتھ شریک ہیں، مگر فرق یہ آ پڑا کہ پہلے تینوں جانشینانِ رسالت کو اہلِ سنت افضل الناس بعد انبیاء و رسل اور سچے جانشینانِ رسالت مانتے ہیں اور شیعہ اُن کو غاصب و ظالم بتاتے ہیں اور جب یہ بزرگ بھی اُن کے عقائد میں خاندانِ رسالت کے دشمن قرار پائے تو اُن سے بھی اُن کے عقائد میں تبرا واجب ہو گیا۔ جس کو مہذب اور صاحبِ علم لوگوں نے اگر حرف برأت کے صحیح معنوں کی حد تک رکھا تو عوام شیعہ اپنے مذاق کے مطابق ان پر زبانِ سبّ و شتم دراز کرنے لگے۔ اور یہی چیز سُنی شیعوں کے باہمی تعصب کی بناء قرار پا گئی۔

ان دونوں مذہبی چیزوں نے لکھنؤ کی شاعری پر نہایت ہی عمدہ اور مناسب اثر ڈالا۔ تولا نے مرثیہ گوئی کے فن کو اپنے آغوش میں لے کے جملہ اصناف شاعری سے بڑھا دیا، تو دشمنانِ خاندانِ نبوت سے تبرا کرنے کے جوش نے پُرانے ہجو گوئی کو اختیار کر کے اسے ہزلیہ گوئی کے نام سے ترقی دی اس فن کے متعدد باکمال لکھنؤ میں مشہور ہوئے، مگر افسوس یہ چیز بالتخصیص اہل سنت کو ناگوار گزرنے والی تھی۔ عہد شاہی میں اس پر تلواریں نکل پڑا کرتی تھیں اور انگریزی عہد میں بھی آج تک کبھی کبھی فوجداریاں اور مقدمہ بازیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہزلیہ گوئی و ہزلیہ خوانی کو مکانوں کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اگر ہزلیہ گوئی کا عام سبجکٹ ایسا محدود اور مابہ النزاع نہ ہوتا، تو زمانہ دیکھتا کہ لکھنؤ کے ہزلیہ گوؤں نے اپنی بیہودہ گوئیوں اور فحاشیوں میں بھی کیسے کیسے کمال دکھائے ہیں۔

اس فن میں سب سے زیادہ شہرت مرزا دبیر کے شاگرد میاں مشیر کو حاصل ہوئی۔ ہجو گوئی اور فحاشی پہلے بھی تھی۔ مگر مشیر نے جس قسم کے محاورات سے کام لیا۔ بندشِ الفاظ طرزِ ادا اور استعمال تشبیہات میں جیسی مضحکہ خیزی پیدا کی اور صحبت کو مارے ہنسی کے لٹا دینے اور سامعین کے پیٹ میں بل ڈال دینے کے لئے جو زبان اور جیسا اسلوبِ سخن اختیار کیا اس کی خوبیاں اور جدتیں بیان سے باہر ہیں ابتذال میں لطف پیدا کر کے اُسے شائستہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے



چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر تاثیر — دل لگی کے موڈ میں!

کے قابل بنا دیا ان کا خاص جوہر تھا جو اُن سے پہلے اور ان کے بعد کسی کو نہیں نصیب ہوا۔

ہزل گوئی ہی کے سلسلے میں میاں جان صاحب کا نام بھی لینا چاہئے۔ لکھنؤ کے زمانۂ وسطیٰ میں ماشور علی خاں نام کے ایک زندہ دل اور نہایت ہی قابل و با مذاق رئیس تھے۔ اُن کے وہاں کی صحبت اس وقت کی سوسائٹی کا ایک اکمل ترین نمونہ تھی۔ اُن ہی کی صحبت نے جان صاحب اور رنگین کو پیدا کیا۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان ہی کی صحبت میں صاحبقران کا بھی نشوونما ہوا تھا۔ جان صاحب اپنے شعر میں بیشاب پاخانے کی رعایت رکھتے اور ان کے اشعار سے ایسی تعفن آتی ہے کہ نام سنتے ہی ہمارے ناظرین کے دماغ سڑ گئے ہوں گے، مگر چونکہ ان کو ایک قسم کی خصوصیت تھی، ہم نے اُن کا ذکر کر دیا اُن کے کلام میں بعض شاعرانہ خوبیاں اور اچھی تشبیہیں بھی ہیں، مگر اُن کے مذاق نے اُن خوبیوں کو بھی گندہ اور پلید کر دیا ہے۔

لیکن ریختی کا فن باوجود غیر مہذب ہونے کے دلچسپ ہے اور جان صاحب کی شاعری کی طرح اذیت رساں نہیں مردوں

اور عورتوں کے محاوروں اور لہجے میں تھوڑا بہت فرق ہر زبان میں ہوا کرتا ہے، مگر اتنا نہیں جتنا ہمیں اپنی زبان میں نظر آتا ہے۔ فارسی عربی سب زبانوں میں یہ امتیاز موجود ہے، مگر اُردو اس خصوصیت میں بڑھی ہوئی ہے۔ فارسی اور عربی کا بڑا مذاق تھا کہ عورتیں شعر کہتیں تو اپنی زبان میں کہتیں اور مرد بھی عورتوں کی زبان سے کوئی خیال ادا کرتے ہیں تو زبان میں لطف پیدا کرنے کے لئے اُن کی زبان اختیار کر لیتے۔ یہی حال انگریزی کا ہے۔ اُردو شاعری ہمیشہ سے صرف مردوں کی زبان میں رہی۔ یہاں تک کہ اس میں عورتیں لکھتی بھی ہیں تو مرد بن کے کہتی ہیں۔ مردوں ہی کی زبان اختیار کرتی ہیں اور اپنے لئے ضمیر تک مذکر استعمال کرتی ہیں۔ اگر شاعر کا نام نہ معلوم ہو تو کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ کسی مرد کا کلام ہے یا عورت کا۔

اردو شاعری کا تیسرا پانچواں دور تھا کہ شوخ طبع جوانوں میں خیال پیدا ہوا کہ ریختہ کی طرح ایک ریختی ایجاد کی جائے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی میں ضرورت کے موقعوں پہ یہ زبان موزوں کی تھی، مگر وہاں تک مضائقہ نہیں تھا لیکن

رنگین نے اس رنگ کو مستقل طور پر اختیار کیا جو دہلی کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کی صحبتوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ ابتداءً مہذب لوگوں کی صحبت نے اس رنگ کو بے شرمی اور خلافِ تہذیب جانا۔ چنانچہ سید انشاء کی زبانی ہم نے لکھنؤ میں دہلی کے جن مہذب سن رسیدہ بزرگ اور وہیں کی ایک رنڈی نورا کی گفتگو لکھی ہے، اس میں وہ بزرگ فرماتے ہیں: "اور سب سے زیادہ ایک اور مسخرے کہ سعادت یار خاں کا بیٹا انوری ریختہ اپنے کو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر کھایا ہے۔ ہرچند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدرِ منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سالنے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعر کیونکر کہتے ہیں۔ ہمارے لوگ دلی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لے کے مرد تک پڑھتے ہیں

چلی وہاں سے دامن اٹھاتی ہوئی
کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

سو اس بے چارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلّم لیکن بیچارے برچھی بھالے کا چلانے والا تیغے کا چلانے والا تھا، تو ایسا قابل کہاں سے ہوا، اور شہدپن مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے، تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔

اس واسطے کہ بھلے آدمی کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کریں۔ بھلا یہ کلام کہا جو۔

زرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو
یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

مرد ہو کر کہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کم بخت میں ماری جاؤں۔ اور ایک کتاب بنائی ہے اس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے، جس میں اوپر ڈالیاں چلیں، اوپر والی چادر، اجلی دھوبن، وغیرہ وغیرہ ہیں۔

مگر مہذب بڑے شکایت کرتے کرتے مر گئے۔ نوجوانوں کی رنگینی نے رنگین کے مذاق کو ترقی دے ہی کے چھوڑا۔ اور ریختی اردو کا ایک فن ہو گیا جس کی ایجاد گو ایک دہلی ہی کے شاعر سے ہوئی تھی، مگر لکھنؤ میں ہوئی۔ اور یہیں اسے فروغ ہوا۔ قصے کے سلسلے میں اس زبان کو میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق نے جس اعلیٰ درجۂ کمال کو پہنچا دیا تعریف نہیں ہو سکتی صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے۔ یہی نہیں پتہ چلتا کہ مولدوں کہنے میں شاعرانہ مزدوروں نے بولنے کی زبان پر کہیں کچھ تصرف بھی کیا ہے یا نہیں، لیکن غزل گوئی میں رنگین کے جانشینی جان صاحب نے کی جو لکھنؤ کے ایک معمولی شخص تھے اور عاشور علی خاں کی خرادگی پڑھ کے تیار ہوئے تھے گو کہ جان صاحب کے بعد اور ریختی گو بھی لکھنؤ میں پیدا ہوئے، مگر جان صاحب پر کمال اور شہرت کا خاتمہ ہو گیا۔ انھوں نے غزلیں کہیں۔ واسوختیں کہیں اور بھی کئی نظمیں کہیں۔

ریختی میں اگر فحش اور بدکاری کے مذاق سے پرہیز کر کے پاکدامنی کے جذبات اختیار کئے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابل ترقی ہوتا، مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد ہی بدکاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات پر تھی۔ اس لئے ریختی گویوں کا قدم ہمیشہ جادۂ تہذیب و اعتدال سے باہر ہو گیا اور اس سے زبان کو چاہے کسی حد تک فائدہ ہوا ہو مگر اخلاق کو نقصان پہونچا۔ ●●

اردو کیوں اور کہاں پیدا ہوئی؟

(ماخوذ)



(محمد حسین آزاد • حافظ محمود شیرانی • نصیر الدین ہاشمی
ڈاکٹر محی الدین زور • حکیم شمس اللہ قادری اور
عبدالقادر سروری کی تحقیق کی روشنی میں)

اردو زبان کیوں اور کہاں پیدا ہوئی۔ اس معرکہ کا آغاز مولانا محمد حسین آزاد کے اس مشہور نظریہ سے ہوتا ہے "ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔" یہ نظریہ آبِ حیات کی پہلی اشاعت ۱۸۸۰ء میں سامنے آیا۔ اس نظریہ پر مختلف ماہرین لسانیات نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کچھ آرا مخالف اور کچھ موافق موجود ہیں۔ البتہ اس امر میں سب کا اتفاق ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی اختلاط اور میل جول سے پیدا ہوئی۔ باہمی تبادلۂ خیالات کے مواقع پیدا کرنے کے لئے یہ زبان خود بخود وجود میں آگئی۔ مسلمان فارسی، عربی اور ترکی بولتے تھے اور ہندوستان کے مقامی باشندے اپنے اپنے علاقوں کی مختلف زبانیں۔ مسلمان فاتحین جہاں بھی گئے۔ اپنی زبان اپنے ساتھ لے گئے۔ میل جول، لین دین کی یہ زبان ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مختلف ناموں سے پکاری جانے لگی۔ "اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے جو لشکر

یا فوج کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اُردو کو کتنے ناموں سے محققین نے اپنی اپنی تصانیف میں یاد کیا ہے۔ اس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں موجود ہے۔

محققین نے اُردو کو غلط فہمی کی بنا پر ہندی یا سندھی یا برج بھاشا یا کھڑی بولی کی بیٹی سمجھ کر لاطائل بحثوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا اور اپنے اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے پوری پوری کوشش کی۔ جس سے غلطیوں اور غلط فہمیوں میں اضافہ ہی ہوتا گیا یہ غلط فہمیاں یورپ کے ماہرین لسانیات نے پیدا کی ہیں۔ جن پر ہمارے ملک کے محققین نے تحقیق و تدقیق کی ہے اور اس کے نتائج پر بھی کماحقہٗ روشنی ڈالی ہے۔ اُردو اور پنجابی کے اصل تعلق کو یورپ والے نہیں سمجھ سکے جسے پروفیسر شیرانی نے "پنجاب میں اُردو" میں تفصیل سے لکھا ہے۔ سندھ میں اُردو، گجرات میں اُردو، مدراس میں اُردو، دکن میں اُردو، دلّی میں اُردو، کے قابل احترام مصنّفین نے اس معرکے میں حصّہ لیا ہے چند دوسرے ناقدین بھی اس ضمن میں آگئے ہیں انھوں نے بھی اپنا اپنا نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے جس سے یہ مسئلہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اُردو زبان کی داغ بیل اور تعمیر اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب ۱۰۲۷ء میں غزنوی فوجیں اپنے متوسلین کے ساتھ لاہور میں بس گئیں۔ اہل غزنہ کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال رہی یہ قدرتی بات ہے کہ لین دین کی زبان کی بنیاد پڑ چکی تھی قطب الدین ایبک نے ۵۸۹ھ میں دہلی اور میرٹھ کو فتح کیا اور وہی زبان ساتھ لے گئے جو پنجاب میں پیدا ہو چکی تھی لشکر میں چونکہ پنجابیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لئے دہلی کے کوچہ و بازار اس زبان سے گونج اُٹھے گجرات میں اُردو ۱۲۹۷ء میں علاءالدین خلجی کے فتح گجرات کے بعد پہونچی۔ دکن میں محمد تغلق نے ۱۳۲۶ء میں چڑھائی کی اور دولت آباد کو پایۂ تخت بنایا۔ گجرات اور دکن کی زبان ایک ہی ہے۔ معمولی فرق کہیں کہیں مل جاتا ہے ملک کافور نے ۷۱۰ھ (م) ۱۱-۱۳۱۰ء میں مدراس پر حملہ کیا۔ دکن میں اُردو کی ابتدا علاؤالدین خلجی کی افواج نے کی۔ خلجی کے حملے ۱۲۹۶ء اور ۱۳۱۱ء کے درمیان ہوئے۔

یہ معرکہ مختلف ناقدین اور مبصرین کی اپنی اپنی زبان میں ان کی تصانیف سے لیا گیا ہے تصانیف کے حوالے جابجا دیئے گئے ہیں تاکہ مزید تحقیق کرنے والے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

سندھ میں اُردو

"جس ملک میں ہم آپ آباد ہیں، یہاں ہمارے اسلاف جن اغراض اور اسباب سے بھی یہاں آئے۔ یہاں بہرحال اب ہمیں اسی دیس میں رہنا اور سرزمین میں جینا اور مرنا ہے۔ آیئے ہم آپ تھوڑی دیر کے لئے غور کریں کہ اس ملک کو ہمارے بزرگوں کی آمد سے کیا خیر و برکت نصیب ہوئی زبان کے لحاظ سے اس ملک میں بھانت بھانت کی بولیاں تھیں اور ہیں چنانچہ پیمائش لسانی کے محققین کے نزدیک اس میں آج بھی تین سو سے زیادہ بولیاں مروّج ہیں۔ ان بولیوں کو چھوڑ کر یہاں صرف ممتاز زبانوں کو لیا جائے تو بھی تعداد دہائی سے کم نہ ہوگی۔

مسلمانوں نے جب اس ملک میں قدم رکھا اور بولیوں کی کثرت کے شاکی نظر آئے ۲۷۰ھ میں سندھ کی اسلامی حکومت پر پونے دو سو برس گزر چکے تھے۔ منصورہ (بھکر واقع سندھ) میں ایک ایسا عراقی مسلمان شاعر تھا جو ہندوستان کی مختلف زبانوں سے واقف تھا اس نے الرا (الور سندھ) کے راجہ کی فرمائش سے قرآن کا ترجمہ ہندی (شاید سندھ کی کسی زبان) میں کیا تھا۔ (عجائب الہند بزرگ بن شہریار م۳ پیرس) مسعودی

جو ۳۰۳ھ میں ہندوستان آیا تھا۔ ہندوستان کی ملکی اور لسانی پریشان حالی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"بعد ازیں ہند کے لوگوں کے خیالات مختلف ہو گئے اور مختلف گروہ پیدا ہو گئے اور ہر رئیس نے اپنی ریاست الگ کر لی تو سندھ پر ایک راجہ بنا اور قنوج میں دوسرا اور کشمیر میں تیسرا اور مانکیر پر جو بڑا علاقہ ہے (گجرات کاٹھیاواڑ) بلہرا (دلبھ رائے) کی حکومت ہوئی..... اور ان ریاستوں میں باہم اختلاف ہیں۔" (مروج الذہب مسعودی جلد اوّل پیرس) یہی مؤرخ آگے چل کر لکھتا ہے۔

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے...... اور مانکیر (یعنی گجرات) کی زبان کیری ہے۔ اور اس کے ساحلی شہروں جیسے چیمور، سوبارہ اور تھانہ (بمبئی) کی زبان لاری ہے۔" (مروج الذہب مسعودی جلد اوّل ص۳۸۱ پیرس)۔ ابن ندیم بغدادی نے الفہرست ۳۷۷ھ میں ترتیب دی ہے۔ سندھ کی نسبت لکھتا ہے۔

"یہ لوگ مختلف زبانوں اور مختلف مذہبوں والے ہیں اور ان کے لکھنے کے خط بھی کئی ہیں۔ ایک شخص نے جو اس ملک میں خوب گھوما پھرا تھا۔ بتایا ہے کہ وہاں دو خط مستعمل ہیں۔" (کتاب الفہرست مصر ص۲۴)

ابوریحان بیرونی نے جو سلطان محمود غزنوی کا معاصر تھا اور جو ہندوستان میں سالہا سال رہ کر یہاں کے علوم و فنون اور زبانوں کو سیکھتا تھا۔ ایک موقع پر ہندوستان کے رسم خطوں کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

"ہندی خط بائیں طرف سے چلتا ہے۔ اس کے مشہور رسم خط کا نام سدھ ماترک ہے۔ کشمیر کی طرف عموماً منسوب ہے اور یہی بنارس میں جاری ہے اور یہی مدھ دیش یعنی صوبۂ متوسط میں جو قنوج کے اطراف کا نام ہے جس کو آریاورت کہتے ہیں چلتا ہے۔ مالوہ کے صوبہ میں ایک خط جاری ہے۔ جس کو ناگر کہتے ہیں اور اسی کے بعد اردھ ناگری خط ہے یعنی آدھا ناگر کیونکہ یہ ناگر اور دوسرے خطوں سے ملا جلا ہے اور یہ بھاتیہ۔ اور پھر سندھ میں مروج ہے اس کے بعد ملواری خط ہے جو ملوشا یعنی جنوبی سندھ میں رائج ہے اور کنتری کرناٹک میں اور انتری (آندھری) انتر (آندھرا) میں اور دراوڑی دراوڑ دیش میں اور لاری لار دیش (گجرات کاٹھیاواڑ) اور گوڑی بنگالی پورب دیش میں اور بھیکشک اودے پور میں اور یہ بودھوں کا خط ہے۔" ص ۸۲

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں بیسیوں زبانیں مروج تھیں۔ (مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی تصنیف نقوش سلیمانی میں ان تمام زبانوں کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں رائج تھیں امیر خسرو نے نہ سپہر میں اور ابوالفضل نے آئین اکبری میں ان زبانوں کے نام اور ان پر مسلمانوں کے اثرات گنائے ہیں جو اس زمانے میں رائج تھیں۔ (نقوش سلیمانی طبع معارف پریس اعظم گڑھ ص ۳۱۔۳۰) ہندوستان کے ہر صوبہ میں الگ الگ بولی تھی۔ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے تھے اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اس وادی سندھ میں تیار ہوا ہو گا۔ عربی و فارسی بولنے والے مسلمان تاجر عراق، بندر ابلہ، سیراف اور بصرہ سے نکل کر سندھ کے بندروں سے گزر کر گجرات ہو کر بحر ہند کے کنارے سفر کرتے تھے۔ آخر پہلی صدی کے آخر یعنی ساتویں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ یہ اسلامی لشکر شیراز اور عراق

سے مرتب ہو کر آیا تھا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس لشکر کے لوگ فارسی اور عربی بولتے تھے۔ اس کے بعد جو سوداگر اور تاجر یہاں آکر بود و باش اختیار کرنے لگے تھے۔ وہ بھی عربی و فارسی بولتے تھے۔ جہازرانوں کی زبان بھی عربی و فارسی سے مرکب تھی۔ خود سندھیوں کی آمد و رفت بھی عراق میں لگی رہتی تھی۔ خصوصاً ۱۳۲ھ میں خلافت کا مرکز شام سے عراق منتقل ہو گیا اور سندھ کے پنڈتوں نے بغداد جاکر اپنی زبان سے عربی میں کتابوں کے ترجموں میں مدد دینے اور وہاں کے مختلف علمی و طبی منصوبوں پر سرفراز ہونے لگے۔ اس زمانے میں عربی میں ہندی کے بہت سے اصطلاحی لفظ اور دواؤں اور خوشبوؤں کے نام داخل ہوئے مثلاً بیڑہ جس کی عربی شکل بارجہ۔ پلنگ جس کی عربی صورت بلنجہ ہے۔ جہاز کی خوابگاہ کے معنوں میں عرب ملاحوں نے اس کو استعمال کیا ہے۔ اسی طرح خوشبوؤں میں صندل (چندن) کافور (کپور) قرنفل (کرن پھول) وغیرہ لفظ ہیں۔ دواؤں میں سب سے عجیب مجھے "بہط" معلوم ہوتا ہے جس کو خوارزمی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا مفاتیح العلوم میں نقل کیا ہے۔ جو ہمارے ہاں "بھات" کی خرابی ہے۔ پھلوں میں انبج (آنب) آم اور لیموں ہیں۔

عربی و فارسی کا میل جول ہندوستان کے جس حصے میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے۔ جس کی حد اس زمانے میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھہ کے سواحل تک پھیلی تھی۔ اس زمانے میں ایران، ترکستان اور خراسان سے ہندوستان آنے کا راستہ براہِ راست ملتان ہو کر تھا۔ چنانچہ محمود غزنوی بھی اسی راستے سے ہندوستان آیا۔ اس کا اثر یہ تھا کہ ان ملکوں سے علم و فن کے کامل اور شعر و ادب کے ماہر اسی راستے سے آکر ہندوستان کے جس پہلے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ وہ ملتان تھا۔ چنانچہ سلطان ناصر الدین قباچہ کے زمانہ تک جو التمش کا معاصر و حریف تھا۔ ملتان ہی اسلامی علوم و فنون کا مرکز اور اسلامی تعلیم کی درس گاہ تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ مرکز نقل ملتان سے لاہور اور پھر لاہور سے دہلی کو منتقل ہو گیا۔

اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی اور ملتانی ہے۔ پھر پنجابی اور بعد ازیں دہلوی۔ سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے چنانچہ ہماری اردو کی طرح سندھی بھی عربی و فارسی الفاظ سے اسی طرح گرانبار ہے اور سب سے عجیب یہ کہ اس کا رسم الخط آج تک ٹھیٹھ عربی نسخ ہے اور عربی کے بہت سے خالص الفاظ مستعمل ہیں۔ مثلاً پہاڑ کو جبل اور پیاز کو بصل کہتے ہیں۔

سندھی ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی ہیں۔ تینوں میں بہت سے الفاظ کا اشتراک ہے۔ تینوں میں عربی و فارسی لفظوں کا میل ہے۔ صیغوں کے طریق میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضرور ہے جس کے رو سے عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اردو ان ہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے۔ یعنی جس کو ہم اردو کہتے ہیں اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دارالسلطنت دہلی کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری زبان بن گئی اور پھر دارالسلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی۔ علامہ بیرونی المتوفی ۴۲۰ھ جس نے ہندوستان میں شاید ملتان اور سندھ میں رہ کر کتاب الہند کا مسالہ مہیا کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں جس بہادر

فرزاد ایسے ہندی الفاظ لکھے ہیں ان سے ماہرینِ ادب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ملتانی اور سندھی شکل میں ہیں۔

جب غزنین میں آلِ سبکتگین کی حکومت قائم ہوئی اور سبکتگین اور اس کے نامور فرزند ہندوستان پہ پے در پے حملے کرتے ہیں۔ ان حملہ آوروں کی مادری زبان ترکی، مگر علمی و ادبی زبان فارسی تھی۔ سلطان محمود غزنوی المتوفی ۴۲۱ھ نے گجرات تک دھاوا کیا مگر اس کی سلطنت بالآخر پنجاب و سندھ میں سمٹ کر رہ گئی۔ جہاں تقریباً دو سو برس تک وہ قائم رہی اس میل جول کا اثر یہ ہوا کہ ترکستان، ایران اور کابل کے ہزاروں لاکھوں آدمی ہندوستان آکر بس گئے اور ہزاروں ہندوستانی ان ملکوں میں جا پہونچے اور ہندی غلاموں اور کنیزوں کی گھر گھر فراوانی ہوئی۔ (علاوہ تاریخوں کے دیکھو قابوس نامہ "بندہ خریدن") غزنویوں کی فوج میں بہت سے ہندو افسر اور سپاہی نوکر تھے اور حدودِ سلطنت میں موقع بموقع بھیجے جاتے تھے۔

سلطان محمود کے دربار میں ہندی مترجم تلک نام کا ایک ہندو تھا، جس کی تعلیم و تربیت کشمیر میں اور اصفہان جاکر اس نے فارسی سیکھی تھی۔ سلطان مسعود کے زمانے میں ۴۲۱ھ میں تخت پر بیٹھا تھا اس عہدہ پر ایک ہندو بیربل نام کا سرفراز تھا۔ سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے ادبا رہتے تھے۔ فضلائے ہند بھی ان کے پہلو بہ پہلو تھے کالنجر کے راجہ انند نے ۴۱۳ھ میں ہندی میں بادشاہ کے لئے مدحیہ شعر لکھے۔

"انند بزبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ۔ نزد او فرستادہ سلطان آں را بفضلائے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ ہمگی تحسین و آفرین کردند"
(فرشتہ)



اس اختلاط اور میل جول کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ اہلِ ولایت کی زبانوں پر ہندی الفاظ اور ہندوؤں کی زبانوں پر فارسی الفاظ چڑھ جائیں۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ غزنوی عہد کے بعض ان شعراء کی زبانوں سے بھی ہندی الفاظ ادا ہوئے ہیں۔ جنھوں نے ہندوستان کا منھ تک بھی نہ دیکھا تھا۔ حکیم سنائی غزنوی (۴۶۴ھ ۔ ۵۴۵ھ) جو بہرام شاہ غزنوی کے معاصر تھے۔ وہ اپنے ایک قصیدہ میں زبانوں کے اختلاف کو غیر اہم بتاکر فرماتے ہیں۔

تو بے مرگ ہرگز بجائے نہ یابی
زشکِ نعمتہائے اینی و آنی

اسلامی دریں عالم است ارنہ حاشا
چہ آب و چہ نان و چہ میدہ چہ پانی
(کلیات سنائی بمبئی ص۹۶)

عہد غزنوی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان جو خاص لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی نسبت عوفی اور امیر خسرو نے لکھا ہے وہ عربی فارسی کے علاوہ ہندی کا

بھی شاعر تھا اور اس زبان میں اپنا ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا۔ اس کے دیوان میں ایک شعر کا دوسرا مصرع ہے۔ کہ

برآمد از پسِ دیوارِ حصن مارا مار

ان شعروں میں پانی اور مارا مار (پنجاب میں اردو) اور شاید میدہ ہندی لفظ ہیں۔ (لفظ میدہ فارسی لغات میں گو ملتا ہے (مؤید الفضلاء) مگر خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندی ہے کیونکہ یہاں شاعر نے آب اور پانی کو جس طرح بالمقابل استعمال کیا ہے ویسے نان اور میدہ کو بالمقابل شاید رکھا ہے۔ بطور لف و نشر غیر مرتب) ۔ جو اہلِ ولایت کی زبانوں پر چڑھ گئے تھے۔ اب ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں غوریوں کا دَور شروع ہوا۔ جنھوں نے بہت جلد لاہور اور ملتان سے آگے بڑھ کر اصل ہندوستان پر قبضہ کیا اور دہلی کو اپنا پائے تخت بنایا۔ اب اس مشترکہ زبان کا قدم اور آگے بڑھا ان کی حکومت پشاور سے گجرات اور بنگال تک قائم ہوگئی۔ اس پورے ملک میں جہاں کہیں کبھی بول چال کی ایک زبان نہ تھی۔ ایک مشترک زبانِ ہند کا ہیولیٰ تیار ہوگیا۔ قاضی سراج منہاج جو ۶۲۴ھ میں سندھ اور ملتان کی راہ سے ہندوستان آئے تھے۔ اپنی تاریخ کوچ بہار اور اس کے قرب و جوار کے فتوحات کا سلسلہ لکھتے ہیں۔

"وایں را زبانِ دیگر است میانِ ہند و تبت" صفحہ ۱۵۲ کلکتہ

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کی ایک زبان پنجاب سے لے کر بنگال تک پیدا ہو چکی تھی۔ جس کے برخلاف وہاں کی زبان ہندوستانی زبان اور تبت کی زبان بیچ میں تھی۔

دہلی کے سب سے پہلے سلطان قطب الدین ایبک کو رعایا نے اس کے جود و کرم کے صلہ میں "لکھ بخش" کا خطاب دیا تھا۔ (فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۶۳) یعنی لاکھوں کے دینے والا۔ اس کے زمانے کی تعریف میں اہلِ ہند "کال قطب الدین" کہتے ہیں "و کال زمانہ را گویند" (فرشتہ جلد اوّل ص۶۳ نولکشور) اس عہد کے سکوں پر بادشاہ کے نام کے ساتھ (شری امیر) لکھا ملتا ہے۔ شری کا لفظ آج بھی ہندوؤں میں شری مہاراج کی ترکیب میں مستعمل ہے۔ مگر اس وقت کی اس ترکیب "شری امیر" پہ ذرا غور کیجئے۔

شمس الدین التمش نے اپنے خواجہ تاش، لیکن حریف ناصر الدین قباچہ کو ۶۱۵ھ میں شکست دے کر ملتان اور سندھ کو بھی دہلی سے ملا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اطراف کے بہت سے تاجر اور سوداگر دہلی آ گئے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ "ملتانیاں" کا لفظ اسی زمانہ میں سوداگرانِ پارچہ کے ہم معنی ہوگیا تھا (تاریخ فیروز شاہی) اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اب ملتان اور لاہور اور دہلی کی مشترکہ خدمات اس متحدہ زبان کے بنانے میں شامل ہو گئی تھیں۔ اس کی سند میں ایک ایسی بزرگ ہستی کا نام لینا ہے۔ جن کی پیدائش اور تعلیم و تربیت ملتان اور سندھ میں ہوئی۔ مگر روحانی اکتسابِ فیض دہلی میں فرمایا اور آخری سکونت اور دائمی آسودگی لاہور کی مملکت میں اختیار فرمائی یعنی حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ۔ (اقتباسات از نقوشِ سلیمانی از سید سلیمان ندوی طبع معارف پریس اعظم گڑھ صفحہ ۲۰-۲۸)

اردو سندھی کے لسانی روابط میں شرف الدین اصلاحی اس موضوع پر رقم طراز ہیں۔

"اردو کے تولد یا ارتقا کے ذکر میں یہ بات بالعموم کہی جاتی ہے کہ وہ دو تہذیبوں کے اختلاط اور دو قوموں کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں آکر آباد ہوگئے اور ان کا ربط ضبط یہاں کے مقامی لوگوں سے ہوا۔ تو فاتح اور مفتوح کی زبانوں نے مل کر ایک

کی زبان کا رنگ روپ نکھارا اور اس طرح ہماری اُردو وجود میں آئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اُردو اپنے انفرادی وجود اور امتیازی خال و خط کے لئے سرتاپا عربی فارسی عناصر اور اسلامی اثرات کی رہین منت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں اور بقول شخصے اس نے کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا جمع کر کے بھان متی کا کنبہ جوڑا ہے۔ (مزے کی بات ہے کہ اُردو کی طرح سندھی کے متعلق بھی یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ ایک مخلوط اور مرکب زبان ہے آفتاب ادب کے مصنف حکیم فتح محمد سیوہانی لکھتے ہیں: "یہ حقیقت ہے کہ موجودہ سندھی سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی اور کسی قدر انگریزی کی ترکیب ہی سے تیار ہوئی ہے" صفحہ ۴۴ ترجمہ) اُردو کا تعلق اس زبان سے ہے جو آریہ قبائل اپنے ساتھ لائے۔ اسی اصل سے ہزاروں سال ارتقاء کے بعد اُردو معرض وجود میں آئی"۔

اُردو کے مخلوط زبان ہونے کا خیال صرف اس حد تک درست ہے کہ اس نے مختلف زبانوں سے اپنا الفاظ کا خزانہ بھرا ہے۔ ورنہ جہاں تک اس کے بنیادی ڈھانچے کا تعلق ہے دوسری ہند آریائی زبانوں کی طرح وہ بھی باقاعدہ اپنا شجرۂ نسب رکھتی ہے اور قدیم ہند آریائی کے ساتھ اس کا بھی وہی تعلق ہے۔ جو اس کی ہم عصر بولیوں کا ہے۔ اُردو کے مخلوط زبان ہونے کا یہی غلط تصور تھا۔ جو بعض اہل علم کے اس لسانی مغالطے کا سبب بنا کہ اُردو کا مولد سندھ ہے۔

یہ نظریہ سب سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی نے پیش کیا۔ (نقوش سلیمانی صفحہ ۳۱، ۸۷، ۸۷) اس کی تغلیط خود سید صاحب کے اپنے ایک مضمون سے ہوتی ہے۔ معارف جولائی ۱۹۳۳ء میں "اُردو کیوں کر پیدا ہوئی" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

موجودہ معیاری اُردو دہلوی زبان، دوسری زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ آج کل بعض فاضلوں نے "پنجاب میں اُردو" اور بعض اہل دکن نے "دکن میں اُردو" اور بعض عزیزوں نے "گجرات میں اُردو" کا نعرہ بلند کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ممتاز صوبے کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے۔ ان سب کا نام "اُردو" رکھ دیا گیا۔ حالانکہ ان کا نام پنجابی۔ دکنی۔ گجراتی یا گجری وغیرہ رکھنا چاہیئے۔ جیسا کہ اس عہد کے لوگوں نے کیا ہے۔ یہ تغیرات جب ممتاز صوبوں میں ہو رہے تھے تو خود پائے تخت دہلی میں تو اور زیادہ ہوتے۔

سید صاحب نے اپنے مضمون میں اُردو کی پیدائش کے متعلق نعرہ بلند کرنے والے مختلف مکاتب خیال کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر اس نعرے کو نظر انداز کر دیا ہے جو انھوں نے خود بلند کیا یعنی "سندھ میں اُردو" کا نعرہ جس طرح پنجاب، دکن، گجرات میں ہندو مسلم اختلاط یا مقامی بولی کے ساتھ عربی فارسی کے میل سے جو زبانیں وجود میں آئیں۔ اُردو نہیں بلکہ پنجابی۔ دکنی۔ گجراتی یا گجری تھیں۔ اسی طرح سندھ میں جس زبان کا ہیولیٰ تیار ہوا وہ اُردو نہیں سندھی تھی۔ ڈاکٹر زور اس نظریے کی نسبت فرماتے ہیں۔

بہرکیف یہ نظریہ کہ اُردو کا مولد سرزمین سندھ ہے۔ اگرچہ علم و تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہ اترے۔ لیکن اتنی بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن عوامل نے ہندوستان کی ایک آریائی زبان کو ہماری اُردو کا قالب عطا کیا۔ وہ سب سے پہلے سندھ میں کارفرما ہوئے۔ جس کا نتیجہ موجودہ سندھی زبان ہے۔ سندھی

اور اُردو کے اشتراک و تشابہ کا ایک پہلو ہے جو صرف انہی عوامل کا مرہونِ منت ہے۔ ہماری مراد عربی فارسی اثرات سے ہے جو انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد قبول کی۔ (اُردو سندھی کے لسانی روابط ص ۴۸ - ۱۴ طبع مرکزی اُردو بورڈ - لاہور)

یہ کتنی عجیب دل خوش کن بات ہے کہ سندھ میں اُردو شاعری کا سراغ اُس زمانے سے ملتا ہے جو کہ اس کا قدیم ترین عہد کہا جاتا ہے۔ یعنی دکنی دور اور جبکہ شمالی ہند میں اُردو ادبیات کی ہنوز ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ جدید تحقیقات کی رُو سے اُردو کا سب سے پہلا صاحبِ دیوان شاعر سلطان قلی قطب شاہ ہے۔ جس کا زمانۂ حکومت ۹۸۸ھ - ۱۰۲۰ھ ہے

جس زمانے میں قلی قطب شاہ دکن میں اُردو شاعری کا بول بالا کر رہے تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں بکھر سندھ میں فاضل بکھری اُردو شاعری کا چراغ روشن کر رہے تھے۔ میر فاضل "تاریخِ معصومی" کے مصنف میر معصوم بکھری کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اور ان کے اُردو کلام کی شہادت "ذخیرۃ الخوانین" سے ملتی ہے۔ ذخیرۃ الخوانین کے مصنف کا بیان ہے "شعر بہ زبانِ ہندی از قسم کافی بکمال فصاحت می گفت و قبولیت داشتہ، فاضل بکھری کا سنہ ولادت یا سنہ وفات دستیاب نہیں ہو سکا اندازاً وہ دسویں صدی ہجری میں گزرے ہیں اس لئے کہ ان کے بھائی معصوم بکھری کی وفات ۱۰۱۹ ہجری میں ہوئی یہ کوئی واحد مثال نہیں۔ ایسے سندھی شاعروں کا پورا ایک سلسلہ عہد بہ عہد ہے۔ جنھوں نے اُردو میں طبع آزمائی کی ہے۔ اگر کاوش کی جائے اور تلاش و تحقیق میں ہمت سے کام لیا جائے۔ تو دکن اور شمالی ہند کے دوش بدوش تقریباً ہر دور میں اُردو کے سندھی شاعر ملیں گے۔ (اردو سندھی کے لسانی روابط ص ۸۸ - ۸۹)

"سندھ کے شرفاء میں ذاتی کتب خانوں کا رواج عام ہے۔ یہاں کے خاندانی رؤسا کے کتب خانے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں پیر سید حسام الدین راشدی۔ پیر پگارو پیر سرہندی، مخدوم بالائی اور تالپور خاندان کے کتب خانے اپنے قدیم سرمائے اور نوادرات کے اعتبار سے علم و ادب کے انمول خزانے ہیں۔ ان کتب خانوں میں عربی، فارسی اور سندھی کے دوش بدوش اُردو کتابوں کی قطاریں بھی کثرت سے نظر آتی ہیں۔ اس سے جہاں شرفائے سندھ کی علم دوستی اور ادب پروری کا ثبوت ملتا



حافظ محمود شیرانی — دنیا کا علم گھول کے پی گئے

ہے۔ ان کی اردو نوازی بھی آشکار ہوتی ہے ان کتب خانوں میں اُردو کے بعض ایسے نادر و نایاب شہ پارے موجود ہیں جو آج کل کی بڑی بڑی لائبریریوں میں بھی نہیں پائے جاتے۔" (اُردو سندھی کے لسانی روابط ۹۶)

اُردو اور سندھی کے مشترک مصادر حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ اُردو سندھی کے لسانی روابط میں صفحہ ۲۸۸ سے صفحہ ۳۰۴ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جن سے دونوں زبانوں کے اشتراک پر روشنی پڑتی ہے۔"

اُردو زبان کی پیدائش کے متعلق اردو ادب کے مؤرخین تین گروہ میں منقسم ہیں۔ ان میں ہر ایک کا نظریہ اُردو زبان کی پیدائش کے متعلق علیحدہ ہے۔

پہلے گروہ کی ترجمانی مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں۔ دوسرا نظریہ قائم کرنے والے پروفیسر نصیر الدین ہاشمی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اُردو نے پہلے پہل جنوبی ہندوستان میں جنم لیا اور تیسرے خیال کو حافظ محمود خان شیرانی مرحوم نے ادبی دنیا سے رُوشناس کرایا اور پنجاب میں اُردو کی ابتدائی نشو و نما کا حال بیان کیا۔ چوتھا نظریہ بھی ہے کہ اُردو زبان نے سب سے پہلے سندھ میں جنم لیا ہے۔ اس صوبے کو جہاں باب الاسلام ہونے کا شرف حاصل ہے وہاں اُسے اُردو زبان کو ہندوستان سے روشناس کرنے کی بھی عزت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ وہ حصّہ ہے جہاں سب سے پہلے عربی اور فارسی زبانیں آئیں اور مقامی زبان سے اختلاط پر ایک نئی زبان پیدا ہوئی۔ جسے اُردو کہتے ہیں۔ ۹۳ھ سے قبل صوبہ

سندھ کی حدود تقریباً موجودہ مغربی پاکستان کی حدود پر مشتمل تھیں۔ اس وقت سندھ نہایت زرخیز اور تجارتی ملک تھا۔ اس لئے تجارتی تعلقات چین چینی ترکستان، ایران، افغانستان اور عراق سے تھے۔ جس کی تصدیق مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالہ "اُردو کیوں کر پیدا ہوئی" سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک منصورہ اور ملتان میں عربی اور سندھی بولی جاتی تھی۔ جب عربی، فارسی اور سندھی بولی جاتی تھی۔ تو یقیناً مخلوط الفاظ اور جملے بھی بولے جاتے ہوں گے اور وہی مخلوط الفاظ یا جملے موجودہ اُردو کی ابتدائی شکل ہوگی۔ عربی، فارسی اور سندھی بولے جانے کا پتہ ہم کو حسبِ ذیل سیاحوں کے سفرناموں سے ملتا ہے۔

اصطخری:۔ منصورہ (ضلع نواب شاہ) اور ملتان اور اُن کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے۔ اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے۔ (صفحہ ۷۷ طبع لائیڈن)

ابن حوقل:۔ منصورہ اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے۔ (سفر نامہ ابن حوقل صفحہ ۲۳۲ لائیڈن)

اس کے چند سال بعد ۳۷۵ھ (۶۹۸۵) میں بشاری مقدسی ملتان آیا۔ وہ لکھتا ہے "اور یہاں فارسی زبان سمجھی جاتی ہے۔" (سفر نامہ بشاری صفحہ ۴۸۱ لائیڈن)

مندرجہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عربی فارسی اور یہاں کی مقامی بولی نے آگے چل کر اُردو زبان کی دایہ گیری کی خدمت انجام دی۔ عربوں کی قوت کو جب سندھ میں زوال آیا ——— تو سندھ پر سلاطین غزنویہ اور غوریوں کا تسلط ہوا۔ اسی طرح پھر مغلوں کا بھی قبضہ عرصہ دراز تک رہا۔ لیکن جب مغلوں کے اقتدار میں کمزوری ہوتی تھی تو سندھ کے رئیس خود مختار ہو جاتے تھے۔ مسلمانوں کی حکومت سے پیشتر ہی سندھ میں مسلمانوں کی آمد و رفت تجارت کی وجہ سے بہت بڑھ چکی تھی لیکن قیامِ حکومت کے بعد عراق اور عرب سے ہزاروں خاندان اگر "دیبل" سے لے کر "ملتان" تک آباد ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ افغانستان اور دیگر ممالک سے مختلف زبانوں کے بولنے والے سندھ میں آگئے، جو فارسی یا ترکی بولتے تھے، مگر درباری زبان فارسی ہی تھی۔ سندھ میں کئی صدیوں کی بود و باش نے سندھ کی زبان میں ہزاروں الفاظ فارسی اور عربی کے شامل ہو گئے۔ انھیں شمالی ہند کی بولیوں کا نام "اُردو" ہے۔

جب ہندوستان پر مغلوں کا مکمل قبضہ ہوگیا اور فارسی زبان کا دور دورہ ہوا۔ تو اس زمانے میں سندھ کے کئی شہر اسلامی علوم و فنون اور صنعت و تجارت کے مرکز تھے اور مغربی ممالک سے دہلی جانے کے لئے سندھ کے مشہور شہروں ہی سے گزرنا ہوتا تھا۔ ان میں ملتان۔ بھکر۔ ٹھٹھہ اور اچھ زیادہ مشہور ہیں۔ اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ مخدوم جلال الدین جہانیاں جہاں گشتؒ کے دادا ساتویں صدی ہجری میں بخارا سے پہلے بھکر آئے پھر اچھ میں سکونت اختیار کی۔ حضرت جلال الدینؒ سے سلطان فیروز شاہ تغلق کو بڑی ارادت تھی اور حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کئی مرتبہ اس بادشاہ کی درخواست پر دہلی تشریف لے گئے تھے۔ ہمارے لئے یہ اہم معلومات "جمات شاہی" (ملفوظات حضرت شاہ عالمؒ) میں محفوظ ہیں کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی راجو قتالؒ کے حق میں یہ حکم فرماتے ہیں کہ "انسان خوب ہے۔ قتال راجے" خود حضرت قتال نے فیروز شاہ تغلق کو اُردو زبان میں خطاب کیا ہے اور یوں مزاج پرسی کی "کا فیروز چنگا ہے" پھر فقیر نصیر الدین ہاشمی اور دوسرے فضلاء کے

نظریات کی اہمیت کم ہو جاتی ہے جبکہ سندھ میں ۱۵۱ھ کے بعد سے برابر اردو کے نمونے ملتے ہیں۔ گویا سندھ میں اردو زبان تقریباً چھ سو سال سے رائج ہے۔ سید سلیمان ندوی اس نظریہ کی ان الفاظ میں تائید کرتے ہیں "ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی نشوونما دکن میں پایا۔ تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی، لیکن تہذیب اور سلیقہ لکھنؤ میں سیکھا۔ (نقوش سلیمانی ص۳۰ طبع کلیم پریس کراچی)

جہاں تک تحقیق کی گئی ہے۔ قدیم اردو میں باقاعدہ شاعری کا آغاز قطب شاہی دربار میں ہوا اور محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ تا ۱۰۲۰ھ) پہلا شاعر تھا جس کا کلام مختلف اصنافِ سخن میں دکنی اردو میں شائع ہوا مگر ٹھیک اسی زمانے میں سندھ کے اندر بھی ایک بہت مقبولِ عام اردو شاعر کا سراغ ملتا ہے۔ اس شاعر کا نام میر محمد فاضل بکھری تھا۔ تاریخ معصومی کے مصنف میر معصوم بکھری کا چھوٹا بھائی تھا۔ (مقدمہ سندھ کے جدید اردو شعراء ص۱۳-۱۴)

سندھ میں اردو شاعری کے پانچ ادوار قائم کئے جا سکتے ہیں:-

پہلا دور ۱۷۰۰ء / ۱۱۱۲ھ سے لے کر ۱۷۸۴ء / ۱۱۹۸ھ تک اس زمانے میں سندھ پر "کلہوڑا" خاندان حکمران تھا (مقدمہ سندھ کے جدید اردو شعراء ص۱۴) جن کی زبان سندھ کی سرائیکی زبان تھی۔ جس کا لب و لہجہ اور الفاظ اردو سے ملتے جلتے ہیں۔ فارسی درباری زبان ہونے کی وجہ سے بہت مقبول تھی۔ اور بیشتر فارسی شاعر موجود تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس دور میں ایران کے بڑے بڑے شعراء مثلاً مرزا صائب اور شیخ علی حزیں وغیرہ سندھ آئے اور ایک مدت تک علمی مجلسوں میں شرکت کرتے رہے۔ ہندوستان سے بھی اس دور میں بلگرامی سادات وقائع نویسی کے سلسلے میں سندھ تشریف لائے۔ جو اپنے زمانے کے بڑے عالم اور فارسی شاعری میں یگانہ روزگار تھے۔ بلگرام کے میر عبدالجلیل اور غلام علی آزاد کے بھی اردو شعر ملتے ہیں۔ یہ دور مغلیہ سلطنت کے انحطاط کا دور تھا۔ مگر دلی سے سندھ میں لوگ آتے رہتے تھے۔ بعض اردو شعراء بھی تھے۔ مثلاً سید محمود صابر رضوی استرآبادی جو دہلی میں پیدا ہوئے اور ٹھٹھہ میں مستقل سکونت اختیار کی اور وہیں انتقال کیا۔ مقالات الشعراء میں لکھا ہے:-

بزبانِ ہندی و فارسی دیوانہا متعدد در مرثیہ و بعضے در غزلیات و مناقب درست کردہ

"شعراء کی آمد و رفت سے سندھ کے شعراء کو بھی اردو میں شاعری کا شوق پیدا ہوا ہوگا اور فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شاعری کی ہوگی۔ وہ سندھی نژاد اردو شاعر جو اس دور میں ملتے ہیں مقالات الشعراء میں ان کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:-

شیخ دریا درد۔ عبدالسبحان فائز ٹھٹھوی۔ سید حیدرالدین کامل۔ مخدوم محمد معینی بیراگی۔ میر حفیظ الدین علی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی:

شیخ درد کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو اور صرف یہی ایک شعر مقالات الشعراء میں ہے

اللہ یا ایہا المفتی شدہ ریش تو جنگلہا
اکھاڑوں بال یک یک کر بناؤں خوب کمبلہا

مصرعِ ثانی دیکھئے وہی زبان ہے جو آج کل ہم بولتے ہیں۔

سید حیدرالدین کامل (المتوفی ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۲ء)
یہ فارسی، سندھی اور ہندی تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

لب دلبر نے میرے قتل کا بیڑا اٹھایا ہے
خدایا خوف سوں میرے تو اس کوں سرخرو کرنا

چاک ناموس کا ہے سینہ میں
نام کا زخم ہے نگینہ میں

خال رخسار کا اچنبا ہے
گال کے کھیت میں اگا ہے تل

شاہ عبداللطیف بھٹائی، سندھ کے مشہور سندھی شاعر کا نمونۂ کلام ہے

بلبل روئے رین دن کہاں بھئی گلزار
ان کی قیامت آج ہے جن کے بچھڑے یار

لا الٰہ کر آرسی الا اللہ سے دیکھ
محمد صورت رب کی اس میں نہ میکھ

(اقتباسات از مقدمہ سندھ کے جدید اُردو شعراء ص۱-۱۸)

اہل تحقیق کی رائے ہے کہ ملتانی اور سندھی ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے ایک تھیں۔ اور آج بھی سندھی بولنے والے کے لئے سرائیکی اور سرائیکی بولنے والے کے لئے سندھی زبان اجنبی نہیں ہے۔ جس طرح ملتانی و پنجابی سے اُردو کا گہرا رشتہ و تعلق ہے۔ اسی طرح سندھی سے بھی اُردو کا ویسا ہی بنیادی و قدیم رشتہ ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں اُردو زبان اس علاقے میں تیزی سے پروان چڑھی جہاں مختلف اقوام کو سیاسی اور معاشرتی سطح پر ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی ضرورت پیش آئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے سندھ میں ہوئی۔ عربوں کی حکومت سندھ و ملتان پر ۷۱۲ء سے ۱۰۲۶ء تک قائم رہی۔ انھوں نے اپنے نظامِ خیال کی قوت سے ان علاقوں میں وحدت کا نقش پیدا کر کے معاشرتی زندگی کی رفتار کو نہ صرف تیز کر دیا بلکہ تہذیبی و لسانی عوامل میں بھی ایک نئی روح پھونک دی۔

اس نئی سیاسی و معاشرتی صورتِ حال نے لسانی سطح پر ایک ایسی زبان کی ضرورت کو ابھارا جس کے ذریعے اس علاقے میں رہنے اور بسنے والی مختلف اقوام ایک دوسرے سے ابلاغ کر سکیں۔ سندھ جس اسلامی لشکر نے فتح کیا۔ اس میں فارسی اور عربی بولنے والے لوگ شامل تھے۔ وہ عمل جو عربوں کی فتح نے سرزمینِ ایران میں کیا وہی عمل سندھ میں کیا۔ یہ سیاسی تقاضہ بھی تھا اور وقت کی اہم ضرورت بھی۔ جب مسلمان سندھ اور پنجاب پر قابض ہو گئے۔ تو یہاں بھی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔

"یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے۔ اور یہیں ان کی زبان عربی اور پھر فارسی کا ہندی زبانوں سے ارتباط و اختلاط شروع ہوا۔ لہٰذا یہ ایک واضح اور یقینی امر ہے کہ اُردو کا اصلی مولد سندھ ہے"

(پیر سید حسام الدین راشدی۔ رسالہ اُردو کراچی اپریل ۱۹۵۱ء)

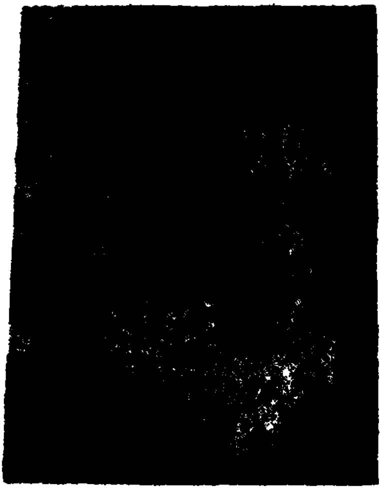
غرض کہ یہ زبان اپنی ابتدائی شکل میں سندھ اور ملتان کے علاقے میں عربوں کے زیرِ اثر بننی شروع ہوئی محمود غزنوی کے بعد آلِ غزنہ نے سندھ و پنجاب اور میرٹھ تک کے علاقے پر اپنی حکومت قائم کر کے لاہور کو اپنا دارالحکومت بنایا تو یہ "نئی زبان" ۱۰۲۶ء سے ۱۱۸۲ء تک اپنے خد و خال اس علاقے میں بناتی اور سنوارتی رہی۔ غوریوں کے ساتھ جب دہلی زیرِ نگیں آگیا اور قطب الدین ایبک برِ عظیم کا پہلا بادشاہ بنا تو اختلاط و ارتباط کا عمل تیز ہو گیا۔ ۱۲۱۰ء میں التمش اپنا دارالحکومت لاہور سے دہلی لے گیا اور اس کے ساتھ پنجاب ملتان اور سندھ کی اس کھچڑی زبان کا اقتدار دہلی پر بھی قائم ہو گیا۔ یہاں اس کا واسطہ دہلی اور دہلی کے قرب و جوار میں بولی جانے والی بولیوں سے پڑا۔

جنھوں نے اس کی ہیئت، ساخت اور شکل و صورت کو شدت سے متأثر کر کے اُسے ایک نیا رُوپ دے دیا۔ مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ یہ زبان گجرات، دکن مالوہ اور دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئی اور سارے برِعظیم میں واحد مشترک زبان کی حیثیت سے اُبھر نکلی۔ (تاریخِ ادبِ اُردو (جلد اوّل) از ڈاکٹر جمیل جالبی اقتباس از صفحہ ۴۷-۴۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے تاریخِ ادبِ اُردو جلد اوّل میں قدیم شعرائے اُردو کے کچھ نام اور ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔ تاریخ معصومی، ہندوستان عربوں کی نظر میں۔ عجائب الہند۔ مقالات حافظ محمود شیرانی جلد اوّل، تاریخِ فیروز شاہی، ذخیرۃ الخوانین (قلمی) منتخب التواریخ، برہان پور کے سندھی اولیاء، تاریخِ شعرائے سندھ، سندھ میں اُردو شاعری۔ مقالات الشعرا سے قدیم شعرا، علما و دربار کے نام منتخب کیے ہیں۔ شمس سراج عفیف، شیخ فرید بھکری، خنجر بیگ چغتائی میر محمد فاضل۔ سید محمد میر عدل۔ شاہ عبدالکریم بلڑی والے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی۔ سید ثابت علی ملتانی۔ سُر بیراگی ہندی۔ میر حیدر الدین کامل۔ میر محمود صابر میر حفیظ الدین علی (خسرو ثانی) میاں محمد سرفراز عباسی روحل خان روحل۔ حافظ عبدالوہاب سچل سرمست۔ مراد شاہ وغیرہ۔ (تاریخِ ادبِ اُردو (جلد اوّل) از ڈاکٹر جمیل جالبی اقتباس از صفحہ ۶۷۵-۶۹۵)

مولوی عبدالحق "بابائے اُردو" نے ایک خطبۂ صدارت جو مرکزِ علم و ادب (وادیٔ مہران) کے کنونشن (میرپورخاص) میں بتاریخ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۹ء پڑھا تھا۔ ہم اس خطبے سے چند ضروری اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ جس کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے:

پاکستان کی ساری زبانیں ہماری اپنی زبانیں ہیں۔ اور وہ سب ہمیں یکساں عزیز ہیں اور ان کی ترقی



مولوی عبدالحق "بابائے اُردو"

پاکستان کی ترقی ہے۔ ہر شخص کو مادری زبان عزیز ہوتی ہے اور عزیز ہونی چاہیئے۔ اسے ترقی کا پورا حق حاصل ہے اور اس کی راہ میں کسی رکاوٹ کو حائل نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ایک علاقائی زبان خواہ کیسی ہی جاندار اور پُرمایہ ہو بہرحال علاقائی زبان ہے۔ اور اس کے نفوذ و اثر کا دائرہ ایک ہی علاقے تک محدود رہتا ہے۔ لیکن ہر ملک میں ایک ایسی زبان بھی ہوتی ہے۔ جو ہر علاقے میں بولی، سمجھی پڑھی یا لکھی جاتی ہے۔ یہی زبان پورے ملک کی قومی زبان کہلاتی ہے اور یہی زبان بلا اختلافِ مذہب و ملت سارے باشندگانِ ملک کی تہذیب تمدن اور ان کے نظریات، تصورات، خیالات اور رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں اُردو زبان کو یہی حیثیت حاصل ہے اور اس لئے یہی ہماری

قومی زبان ہے۔ ہمارے اسلاف نے اس زبان کی ترقی اور فروغ میں اپنی مادّی ذہنی اور رُوحانی قوتیں صرف کی ہیں اور اسے اس رُتبے تک پہونچا دیا ہے کہ ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اور اس کا سرمایہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان سے نکل کر دُور دُور تک جا پہونچی ہے۔ ہم یہ تمام سرمایہ علاقائی زبانوں کی نذر کرتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ جب علاقائی زبانیں قومی زبان اُردو سے مل کر اپنے ادب کے فروغ و ترقی کے لئے کوشش کریں گی، تو وہ بہت بڑی قوت بن جائیں گی۔

ہم سندھ میں یہی پیغام لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ اور اس یقین اور اعتماد کے ساتھ کہ اہلِ سندھ اپنی روایتی مہمان نوازی کے ساتھ اس پیغام کا خیر مقدم کریں گے ہمیں سندھ اس لئے عزیز ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے اسی سرزمین پر اسلام کی روشنی پہونچی اور یہیں سے توحید کی صدائیں بلند ہو کر ایک طرف ہمالیہ کی برفپوش چوٹیوں سے ٹکرائیں اور دوسری جانب جنوب کی معطر فضاؤں اور مشرق کے سبزہ زاروں میں گونجیں۔ ہمیں سندھ اس لئے عزیز ہے کہ یہیں حجازی تہذیب اور عربی ثقافت ہندِ قدیم کی تعلیم و روحانیت سے ہمکنار ہوئی اور پھر اس اشتراک و اتحاد سے ایک نئی تہذیب و ثقافت وجود میں آئی اور ہماری یہ قومی زبان اردو اسی تہذیب و ثقافت کا شاہکار اور اس کی زندۂ جاوید یادگار ہے۔

ہمیں سندھ اس لئے عزیز ہے کہ یہیں سے اسلامی علوم و فنون کی اشاعت ہوئی اور یہیں کے محدثین، فقہاء، علماء، فضلاء، اولیاء اور صوفیہ نے نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سادہ، پُر اثر اور انسانیت نواز تعلیمات کو ملک کے دوسرے گوشوں تک پہونچایا۔ ہمیں سندھ اس لئے عزیز ہے کہ اسی سرزمین سے شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اور حضرت جلال الدین بخاری ایسے صاف باطن اور پاک مشرب بزرگوں کے روحانی فیوض و برکات کے چشمے پھوٹے اور سندھ ہمیں اس لئے بھی عزیز ہے کہ اس کی خاک کا ذرّہ ذرّہ لعل شہباز قلندر، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست ایسے خدا رسیدہ بزرگوں کے سرمدی نغموں سے سرشار اور ان کے وجدان و عرفان کا آئینہ دار ہے۔

"اے اہلِ سندھ!
آپ کی تہذیب دُنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ہے۔ اور آپ کے بزرگوں نے تہذیب اور شائستگی میں جو عروج حاصل کیا تھا۔ آج بھی موہن جو ڈارو کے کھنڈر زبانِ حال سے اس کی عظمت کی داستانیں سنا رہے ہیں اور یہ بات بھی آپ کے لئے کچھ کم باعثِ فخر نہیں کہ جب آریاؤں کے قدم اس سرزمین پر آئے۔ تو پہلے پہل یہیں سے رگ وید کے رُوح پرور نغمے بلند ہوئے پھر محمد بن قاسم نے یہاں عربوں کی شوکت و سطوت کا پرچم بلند کیا۔ تو اس مردم خیز خطے نے ایسے ایسے جوہرِ قابل پیدا کئے کہ خود اہلِ عرب نے ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا۔ اگر میں سندھ کے ان تمام بزرگوں اور دانشوروں کا تذکرہ کروں جنھوں نے شام اور عراق میں سندھ کے نام کو چار چاند لگائے۔ تو اس کے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہوں گے۔ شاید آپ کو سُن کر حیرت اور تعجب ہو کہ اس دور میں یہاں سے ایک صاحب جن کا نام ابومعشر سندھی تھا۔ جنگی قیدیوں کے زمرے میں حجاز پہونچے تو انھوں نے وہاں علمِ حدیث میں اس درجہ



مولانا ظفر علی خاں — اور انکے محاذ

کمال حاصل کیا کہ ائمہ حدیث میں شمار ہونے لگے اور امام شافعیؒ کے استاد امام وکیع، امام ثوری اور واقدی جیسے مشاہیر وقت نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ حافظ ابو محمد خلف بن سالم اور ابو نصر سندھی بھی اس دور کے مشہور محدثین میں ہیں جن کی روایتوں کو امام سنائی اور امام دار قطنی نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ علم حدیث میں سندھ کے اگلے بزرگوں نے جو امتیاز حاصل کیا تھا۔ وہ صدیوں برقرار رہا۔ چنانچہ دہلی، لاہور، جون پور، برہان پور جیسے بڑے علمی اور تہذیبی مرکزوں کے اہل علم حتیٰ کہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی یہاں کے باکمالوں سے علم حدیث حاصل کیا۔ عربی ادب اور شعر میں بھی اس مردم خیز خطے نے ابو العطا سندھی اور ابو ضلع سندھی ایسے خوش گفتار اور سخن سنج پیدا کئے۔ اہل زبان کو بھی ان کا لوہا ماننا پڑا۔ غرض کہ صدیوں سندھ کی علمی مرکزیت اور ادبی اہمیت پورے برعظیم کے لئے قابل رشک رہی اور آخر وہ وقت بھی آ پہونچا کہ یہاں کی ساری علمی روایات داستان پارینہ بن کر رہ گئیں اور وہی سندھ جو کبھی علمی و ادبی حیثیت سے میر کارواں کی حیثیت رکھتا تھا۔ پستی و پسماندگی کا شکار ہو گیا اور انگریز حکومت کے دور میں تو یہ زوال اپنی آخری حد کو پہونچ گیا۔

اہل سرحد باوجودیکہ ان کی مادری زبان اردو نہیں۔ اردو پر ایسی ہی قدرت حاصل کر لیتے ہیں، جیسی اہل زبان کو ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اہل سندھ کو بھی اردو پر وہی ملکہ اور عبور حاصل نہ ہو سکے۔ سندھی اور اردو کا رسم خط ایک ہے۔ دونوں کا ذخیرۂ الفاظ بھی بڑی حد تک مشترک ہے اور دونوں کی صرف و نحو بھی ملتی جلتی ہے۔ ان آسانیوں

کے باوجود بھی اگر اہلِ سندھ اُردو کو ایک مشکل زبان سمجھ بیٹھیں تو یہ ان کی بڑی بھول ہوگی۔ اردو زبان سندھ کے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں اور بعض محققین کا تو یہاں تک خیال ہے کہ اردو زبان کا مولد و منشا روادیٔ مہران ہے۔ اس دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ اُردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول اور اُن کے تہذیبی و ادبی اختلاط سے پیدا ہوئی ہے اور چونکہ پہلے پہل یہیں عربوں کی حکومت قائم ہوئی اور اس لئے لامحالہ اُردو نے بھی یہیں جنم لیا ہوگا۔ اُردو سندھ میں پیدا ہوئی یا گجرات اور دکن میں۔ یہ موقع اس سوال کے چھیڑنے کے لئے مناسب اور موزوں نہیں، لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ صدیوں پہلے بھی یہاں اُردو کے استعمال کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ محمد تغلق نے ٹھٹھہ کی تسخیر کے لئے سندھ پر فوج کشی کی اور پھر یہیں کی خاک کا پیوند ہو کر رہ گیا اور دس برس بعد دوبارہ پھر فیروز تغلق نے ٹھٹھہ پر چڑھائی کی اور رسد کی عدم فراہمی کی وجہ سے اسے جب اپنا ارادہ منسوخ کرنا پڑا تو یہاں کے لوگوں نے اسے اپنے یہاں کا ایک پیرِ کرامت قرار دیا اور یہ جملہ ضرب المثل کی طرح زبانوں پر رواں ہو گیا:۔

"برکت شیخ پٹھا ایک موا ایک ہٹا۔"

انگریزوں کی عملداری سے بہت پہلے سندھ کے صاحبانِ فہم اور یہاں کے شرفاء فارسی اور سندھی زبانوں میں شعر کہنے کے ساتھ اُردو میں بھی فکرِ سخن کرتے تھے۔ چنانچہ مقالات الشعراء کے مصنف میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے جو کبھی کبھی خود بھی اُردو میں شعر کہتے تھے۔ اپنے تذکرے میں شیخ درد عبدالسبحان فائز ٹھٹھوی۔ سید حیدر الدین کامل میر حفیظ الدین ملتمی پرسرام مشتری اور دیگر سندھ نژاد اردو شعراء کا ذکر کیا ہے۔ تو پھر اے دوستو! جب آپ کے اسلاف اب سے پہلے زبان دانوں کی طرح اُردو شعر کہنے پر قادر تھے تو پھر یہ غلط خیال کیونکر آپ کے ذہنوں میں پیدا ہوا کہ آپ جو اُن کے جانشین اور یادگار ہیں اردو زبان اور ادب کے میدان میں کسی سے پیچھے رہ جائیں گے۔ جس اردو زبان کو آپ کے بزرگوں نے اپنا کر اس میں امتیازی مقام حاصل کیا آپ بھی آج اُن کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی اہمیت ثابت کر سکتے ہیں۔ (خطباتِ عبدالحق اقتباسات از صفحہ ۵۹۹۔ ۶۰۵)

زبان اور علم زبان میں پروفیسر عبدالقادر سروری رقمطراز ہیں:۔

"عربی و فارسی بولنے والے لوگ سب سے پہلے سندھ میں آباد ہوئے اور تقریباً ڈیڑھ، پونے دو سو سال تک اس علاقے پر ان کا تسلط رہا۔ اس بنا پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کا قیاس ہے کہ اردو کا ہیولیٰ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔ لیکن ہمارے پاس اس وقت اس زمانے کے تحریری آثار موجود نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں شاید ملتان کا علاقہ جو سندھ اور پنجاب کی سرحدوں پر واقع ہے کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مقام اسماعیلی کی حکومت سندھ کے زمانے میں اور بعد میں بھی علماء کا بڑا مرکز رہا اور دکنی جو دکن آنے والے ابتدائی دور کے مسلمانوں کے ساتھ اس علاقے میں آئی تھی۔ بعض خصوصیتوں میں ملتانی سے مشابہت رکھتی ہے۔ شیخ فرید گنج شکرؒ، جن کا کچھ اردو کلام دستیاب ہوا ہے اور اُردو کے اولین آثار میں سے ہے ملتان ہی سے دہلی آئے تھے۔"

حافظ محمود شیرانی نے اُردو کا نشوونما پنجابی سے بتایا ہے اور اپنے خیال کی تائید میں تاریخی اور لسانی حقائق پیش کئے ہیں کہ غوریوں کے غزنین پر قبضہ کر لینے کے بعد محمود غزنوی کی اولاد اپنے مشرقی علاقہ پنجاب میں منتقل ہو گئی تھی اور کوئی پونے دو سو سال برس تک پنجاب پر اُن کی براہِ راست حکومت رہی اس دوران میں مسلمان علماء اور مبلغین کی تبلیغ کے اثر سے "ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد اسلام

بولی کی بنیاد تھی۔ ہندوستانی مسلمان ظاہر ہے کہ ایرانی
نہ تھے لیکن مذہبی اور تہذیبی تعلق کی وجہ سے وہ
فارسی بولنے والوں سے گہرا ربط رکھنے پر مجبور تھے۔ چنانچہ
اس ربط کا نتیجہ اُردو زبان کے آغاز کی صورت میں ظاہر ہوا۔
(دکن میں اُردو طبع ششم صفحہ ۸ طبع نسیم بک ڈپو لکھنؤ)

جناب نصیرالدین ہاشمی نے دکن میں اردو کے عنوان سے
اظہارِ خیال کرتے ہوئے سندھ میں اُردو کے متعلق اپنی رائے
اس طرح قائم کی ہے:۔

• یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور
ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے
جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور
دکن سے ہوئی۔ ایک حد تک غلط نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مسلمانوں
کی آمد سب سے پہلے ان ہی مقامات پر ہوئی سندھ میں اسلامی
حکومت کا آغاز ۹۲ھ سے ہو چکا تھا۔ صدیوں تک وہ یہاں
حکومت کرتے رہے۔ حکومت کی رواداری اور ہندو مسلمانوں
کے عام طور سے ملنے جلنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے
اور باہمی تبادلۂ خیالات کے مواقع پیدا ہو گئے اور ان
حالات کے مدنظر اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ہندو اور مسلمانوں کے
امتزاج سے جو زبان بنی اس کا آغاز اسی مقام سے ہوا ہے،
جو غلط نہیں ہو سکتا، لیکن تحقیقات ہوئی ہے۔ اس کے
لحاظ یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان فاتحوں کی اصلی زبان
عربی تھی۔ اس لحاظ سے جو زبان عالمِ وجود میں آئی وہ
عربی اور سوراسنی سے مشترک ہوتی، مگر چونکہ اس میں فارسی
کا حصہ زیادہ ہے اس لئے ہم یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہیں
کہ اردو کی ابتدا سندھ سے نہیں ہوئی۔ سندھ کے بعد مسلمانوں
کی آمد ساحل ملیبار اور کرناٹک پر ہوئی۔ شیوخِ عرب اور سادات
آلِ ہاشم تجارت اور تبلیغِ دین کی دھن میں صدہا میل سمندر
کی راہ طے کر کے پُرامن طریقے سے سواحلِ ہند پر پہونچے اور اپنی
کوشش اور جدوجہد سے سواحل کے ہندوؤں میں خاص
رسوخ حاصل کر لیا اپنی ملنساری اور نیک مزاجی سے اُن کے
دلوں میں گھر کر لیا اور سواحل سے گزر کر اندرونِ ملک میں
دور تک پہونچ گئے۔ اپنی مسجدیں تعمیر کیں، چھوٹی حکومتیں قائم
کیں اپنے مذہب کی اشاعت کی اپنی تعلیم کی تلقین کی (دکن
میں اُردو طبع ششم صفحہ ۸ طبع نسیم بک ڈپو لکھنؤ)

سندھ میں عربوں کی حکومت کے عنوان سے حکیم
سیّد شمس اللہ قادری اپنی تالیف "اردوئے
قدیم" میں فرماتے ہیں:۔

• فارسی اور انگریزی مؤرخین کا یہ بیان کہ محمد بن قاسم
کے بعد سندھ کی اسلامی حکومت تباہ ہو گئی
اور ملک پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا۔ بلکہ عربی
تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ الواثق باللہ
(۲۲۷ھ/۲۳۲ھ) کے زمانہ تک دربارِ خلافت
سے سندھ میں گورنر مقرر ہو کر آتے تھے اور
منصورہ ان کا مستقر حکومت تھا جب خلافتِ
بغداد کو انحطاط شروع ہوا تو سندھ میں خلفاء
کی حکومت برائے نام رہ گئی۔ اور ملک میں
عربوں کے جو قبائل آباد تھے۔ اُن کے سرداروں
نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں۔ یہ حکومتیں
کشمیر کی سرحد سے بحرِ فارس اور سیستان اور مکران
تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے حکمران سلاطین
غزنویہ کے تسلط تک ملکِ سندھ پر قابض و متصرف
رہے (اردوئے قدیم از حکیم شمس اللہ قادری
صفحہ ۴۵ طبع کراچی)

عربوں کے دورِ حکومت سندھ میں سندھ کی اسلامی آبادی:
• سندھ کے فاتحین عرب مسلمان تھے۔ یہ لوگ
جب سندھ میں آئے تو اپنے ساتھ عربی زبان اور
عربی تمدن لیتے آئے اور اسے ملک میں اس قدر
پھیلایا کہ سندھ شام و عراق کا نمونہ بن گیا سندھ
میں کم و بیش پانچ سو سال اُن کی حکومت رہی ہے
اس عرصہ میں عراق و عرب کے سینکڑوں قبائل نے

آکر سندھ میں حکومت اختیار کر لی اور یہاں کے باشندوں کے ساتھ اس قدر اختلاط بڑھا کہ دونوں میں امتیاز کرنا اجنبی کے لئے دشوار ہو گیا۔" ابن حوقل (ابن حوقل نے ۳۳۱ھ سے ۳۵۹ھ تک بلادِ اسلامیہ میں سفر کیا۔ اور ۳۶۷ھ میں اپنا سفرنامہ مدون کیا۔ جس کا نام المسالک الممالک ہے۔) جو چوتھی صدی کا مشہور سیاح ہے جب سندھ میں آیا، تو دیکھا یہاں کے ہندو مسلمان ـ کی ایک سی معاشرت ہے۔ دونوں ایک زبان بولتے ہیں۔ سندھ میں عربی اور ہندی بولی جاتی ہے۔ ملتان میں ملتانی اور فارسی کا رواج ہے۔" (اردوئے قدیم ص۱۳ طبع کراچی)۔

جو اقتباسات اوپر بیان کئے جا چکے ہیں ان کی روشنی میں فاتحینِ اسلام کا سندھ میں ورود اور ان کا سندھ کے اہلی باشندوں سے اختلاطِ عربی و فارسی ترکی کا قدیم زبان سے میل جول تاجرں اور مسافروں کی برابر آمد و رفت سے ایک مرکب بولی کا پیدا ہو جانے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور سید سلیمان ندوی کا یہ فرمان آج تک زیرِ بحث آ رہا ہے کہ:۔

"جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہو گا"

(نقوشِ سلیمانی ص۳۱)

زبانِ اردو

"درج ذیل مضمون ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جو رسالہ مخزن بابت ستمبر ۱۹۰۲ء میں مدیر مخزن شیخ عبدالقادر کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔ ڈاکٹر رائٹ برجنٹ صاحب نے جن کو السنۂ مشرقیہ کے ساتھ بالخصوص دلچسپی ہے۔ یہ مضمون انگریزی میں لکھا جس کا ترجمہ علامہ اقبال نے اردو زبان میں کیا جو ذیل میں درج ہے۔ اس سے اردو زبان کی ابتداء کے متعلق روشنی پڑتی ہے"

اردو زبان کی ابتداء شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) کے عہد سے ہوئی۔ ہمایوں کے عہد میں سلطنتِ مغلیہ پنجاب اور مضافات دہلی و آگرہ تک ہی محدود تھی۔ مگر اکبر کی ذکاوت اور اس کی قوتِ انتظام نے چھوٹے سے علاقے کو ایک عظیم سلطنت بنا دیا جو کابل اور قندھار کی سرحد سے شروع ہو کر اڑیسہ اور حدود آسام تک پہونچتی تھی۔ اس کا دار الخلافہ کبھی دہلی ہوا کرتا تھا۔ کبھی آگرہ اور ان شہروں کے درمیان اضلاع کی زبان مغربی ہندی کی ایک شاخ تھی۔ جس کو برج بھاشا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غالب خیال یہ ہے کہ اکبر کے عہد تک مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ میل جول کرنے میں برج بھاشا بولا کرتے تھے مگر شہنشاہ مذکور کے زمانے سے اس تغیر کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ضرورت نے نئی زبان پیدا کر دی۔ اکبر کے کئی وزراء بالخصوص وزیر مال ہندو تھے۔ جن کو تقاضائے وقت کی وجہ سے اس وقت کی درباری زبان یعنی فارسی سیکھنی پڑی۔ جس طرح انگلستان میں شاہانِ نارمن کے عہد میں اینگلو سیکسن اور نارمن فرنچ کی آمیزش سے انگریزی زبان کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں فاتحوں اور مفتوحوں کی زبان کی آمیزش سے یا یوں کہو کہ فارسی اور برج بھاشا کے ازدواج سے اردو زبان پیدا ہوئی۔ فارسی بولنے والے مسلمان سپاہی کو روزمرہ کے کاروبار میں دہلی اور آگرے کے باشندوں کے ساتھ برتاؤ کرنا پڑتا تھا۔ اس آمیزش کے اور بھی ممد ہوئے۔ یہاں تک کہ ہندی مغربی قشون شاہی

اُردو زبان کی ابتداء شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) کے عہد سے ہوئی



ی اُردوئے معلیٰ کے نام پر اُردو کہلانے لگی۔
حکومتِ مغلیہ کی توسیع کے ساتھ ساتھ شمالی اور
ی حد تک جنوبی ہندوستان میں بھی تعلیم یافتہ لوگوں
یں اس زبان کی ترویج ہوتی گئی اور ہندوستانی مسلمان
مصنفین کی فارسی تواریخ و اشعار کے ساتھ اس نئی
زبان کا علم ادب بھی ترقی کرتا گیا۔ دو صدیوں تک تو
مدیہ علم ادب صرف مذہبی اور عاشقانہ نظموں تک محدود
تھا۔ جن کے مطالعہ سے زبان کی تدریجی نشوونما کا
سراغ ملتا ہے۔ لیکن سولھویں صدی کے اختتام سے
بیشتر مسلمان شعراء کی طبع آزمائیاں شروع ہوتی ہیں۔
ہہان کا عروج اور ان کی زبان زیادہ تر ہندی
مثل کی ہیں ۱۶۵۰ء کے قریب اُردو شعراء فارسی
ور کا استعمال شروع کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ فارسی
الفاظ و محاورات اُردو زبان میں کثرت سے داخل
ہوتے جاتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے اختتام کے

قریب ۱۷۹۰ء میں اُردو نثر کا پہلا نمونہ یعنی شاہ
عبدالقادر صاحب کا ترجمۂ قرآن شریف شائع ہوتا ہے
مگر چونکہ اس کے مصنف نے عربی محاورات و الفاظ و
استعارات کی اندھا دھند تقلید کی ہے اس واسطے
یہ ترجمہ تصانیف ادبیہ میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے
آخر انیسویں صدی کے شروع میں اردو مصنفین
نے یہ محسوس کیا کہ نثر اظہارِ خیالات و تاثراتِ قلبی کا
ایک موزوں آلہ ہے اس میں شک نہیں کہ اُردو نثر
کے نشوونما میں ایک بے جا تعویق لاحق ہوئی ہے۔
تاہم یہ تعویق اپنے فوائد سے خالی نہیں وہی مسٹر جیمز
فرماتے ہیں:۔

"بدقسمتی سے ہر ہندوستانی زبان کا یہی
حال رہا ہے کہ جب مصنفین نے ایک زبان
میں لکھنا شروع کیا۔ تو ان کی طرزِ تحریر سے
قدرتی رنگ معدوم ہو گیا اور تصنع اور بناوٹ

نے یہاں تک زور پکڑا کہ متاخرین نے متقدمین کی طرزِ تحریر کو بغیر کسی تبدیلی کے اختیار کر لیا۔"

لیکن اُردو زبان اس قید سے مستثنیٰ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں بعض فارسی تصنیفات کی تقلید سے اُسے نقصان پہونچا تاہم یہ صحیح ہے کہ اُردو نثر نویسوں نے بالعموم ایسی طرزِ تحریر کو اختیار کیا جو وقت کے تقاضے سے خود بخود پیدا ہوئی اور جو بناوٹ سے آزاد ہونے کی وجہ سے عوام کے فہم اور سمجھ کے عین مطابق ہے۔

موجودہ صدی میں اُردو نثر کی ترقی کے تین بڑے قوی اسباب ہوئے ہیں:-

اوّل۔ چھاپہ خانہ کی ترویج جو مسیحی واعظوں بالخصوص سیرام پور کے واعظین کی وساطت سے ہوئے۔

دوم۔ زبانِ انگریزی نے جو ۱۸۳۲ء میں مسیحی واعظوں اور بالخصوص ڈوف صاحب کے مساعی جمیلہ سے ہوئی اور جس نے ہندوستان کی زبانوں پر مغربی علمی خزائن کے دروازے کھول کر ان پر وہ احسان کیا جس گم شدہ یونانی علم و ادب کی دریافت نے یورپ کی زبانو پر کیا تھا۔ مغربی علوم و فنون کی ہوا نے اُردو زبان میں ایک نئی رُوح پھونک دی ہے اور شاید ہندوستان کی کوئی اور زبان اس مغربی اثر سے اس قدر متاثر نہیں ہوئی جس قدر کہ یہ زبان ہوئی۔

سوم۔ اُردو زبان کا فارسی کے بجائے درباری زبان قرار دیا جانا اس واقعہ کے اثر نے پٹنہ اور پشاور کے درمیان ممالک کو اُردو کے زیرِ نگیں کر دیا ہے اور چونکہ دہلی اور آگرہ کو اب دارالخلافہ ہونے کا شرف نہیں رہا۔ اس واسطے زبانِ مذکور کے ادبی تحریکات کے مرکز لاہور اور الٰہ آباد قرار پا گئے ہیں۔

اُردو کی ماں یعنی برج بھاشا کا اثر تو دہلی اور آگرہ تک ہی محدود تھا مگر اس کی بیٹی کو خدا نے وہ شرف بخشا کہ آج شمالی ہندوستان میں تین لاکھ مربع میل پر اس کا دَور دَورہ ہے بلکہ جنوبی اور غربی ہندوستان کے بعض وسیع اضلاع بھی اس کی حکومت سے آزاد نہیں۔ اس کے علاوہ کئی مقامات ہیں۔ جن میں مقامی بولیوں کے علاوہ گویا زبانِ ثانی تصور کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُردو بولنے والوں کی تعداد کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔ باوجود اس اشکال کے ہم گریرسن صاحب کی تحقیقات کے مطابق زبان مذکورہ بولنے والوں کی تعداد درج کرتے ہیں اور صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جنھوں نے ازروئے کرم ہمیں اپنا مسودہ عطا فرمایا۔

راجپوتانہ وغیرہ	۵۲۹۰۸۹	پنجاب	۵۸۹۴۱۱
ممالک متوسط	۱۵۵۰۱۴	صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ	۳۴۸۹۳۶
حیدرآباد	۲۷۰۴۰۰	بنگال	۱۹۷۲۴۸۸
بمبئی	۱۳۰۱۲۲۲		

میزان ۸۰۰۱۸۴۳۱

مدراس کے اُردو بولنے والوں کی تعداد میں کچھ بہت بڑا اضافہ نہیں کر سکتی لہٰذا مندرجہ بالا تعداد کم و بیش ہندوستان کے خالص اُردو بولنے والوں کی سمجھی جانی چاہیئے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ جزئی طور پر اُردو زبان کی وسعت ان حدود سے وسیع تر ہے۔ مثلاً پنجاب کے ایک کروڑ مسلمان باشندوں اور ایک کروڑ ۵۵ لاکھ مسلمان بنگالی بولنے والوں کے درمیان اُردو جزواً مروّج ہے۔ مزید برآں مندرجہ بالا ۸۰ لاکھ اُردو بولنے والوں میں غالباً لکھ پڑھ سکنے والوں کی تعداد شاید اس قدر ہے کہ کسی اور دیسی زبان کے بولنے والوں میں اس قدر نہ ہوگی یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اُردو کو بطور ثانی استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے اکثر مثلاً اہلِ پنجاب نے اُردو مدرسوں میں پڑھ کر سیکھی ہے۔

بعض مغربی مصنفین کی رائے ہے کہ اُردو ہندی

سے کوئی الگ زبان نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی صرف و نحو کلیتہً ہندی اصل کی ہے۔ جیمز صاحب فرماتے ہیں کہ اُردو کو ہندی زبان سے متمیز کرنا غلطی ہے۔ اگرچہ ہندی بولنے والے مقامات میں مقامی بولیوں کے درمیان بہت سا اختلاف ہے تاہم ایک عام مشترک بولی متعارف ہے۔ جس کو تمام تعلیم یافتہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اس مشترک بولی کی ابتدا مضافات دہلی سے ہوئی اور ہندی کی وہ شکل جو اس شہر کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ ایک نئی زبان سمجھ کر اختیار کر لی گئی۔ جیمز صاحب ٹھیک فرماتے ہیں مگر وہ اس امر کو نظر انداز کرتے ہیں کہ اس نئی زبان کا اختیار کیا جانا ہی گویا اُردو زبان کی ابتدا تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو برج بھاشا شمال مغرب ہندوستان کے ایک تھوڑے سے حصّے تک محدود رہتی اور اس کی حیثیت ایک معمولی بولی کی حیثیت سے بڑھ کر نہ ہوتی۔ ڈاکٹر ہارنل نے ٹھیک کہا ہے کہ اُردو، برج بھاشا کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے جس نے بھاشا کی گردانوں کے اُلجھاؤ سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے اور بعض صیغے جو "پنجابی اور مارواڑی" کے ساتھ مختص ہیں۔ رکھ لئے ہیں۔ پس اُردو بلحاظ صرف و نحو کے ہندی الاصل ہے۔ جس میں کچھ مارواڑی اور پنجابی اجزا بھی شامل ہیں اور بلحاظ الفاظ و اصطلاحات کے اس کی اصل کچھ ہندی اور کچھ فارسی و عربی وغیرہ بلکہ اس کے مصنفین نے کئی ملکی محاورات کا ہندی ترجمہ کر کے اپنی زبان کے ذخیرۂ محاورات کو زیادہ کیا ہے۔ مثلاً محنت کھینچنا پھل لانا۔ وغیرہ محنت کشیدن اور بار آوردن کا ترجمہ ہیں۔ کتابی ہندی کی ابتدا اسی صدی سے ہوتی ہے یہ گویا اس اثر کا نتیجہ ہے جو انگریزی تعلیم نے زمانۂ حال کے ہندوؤں پر کیا ہے اگرچہ حقیقت میں یہ کتابی ہندی وہی اُردو ہے جس میں غیر ملکی الفاظ و محاورات



قاضی عبدالودود — جن کے حافظے میں ویبریاں آباد ہیں

کی جگہ تصنع سے ہندی محاورات اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی زبان بولنے والے ممالک کے تعلیم یافتہ ہندو کتابی ہندی کو آسانی سے سمجھتے ہیں اور برج بھاشا بولنے والے اس فہم سے عاری ہیں۔ ہمارے نزدیک ڈاکٹر ہارنل نے جو اُردو مشرقی ہندی اور مغربی ہندی میں امتیاز کیا ہے بالکل صحیح نہیں اور اُردو مشرقی اور مغربی ہندی سے اس طرح ممیز ہے جس طرح انگریزی ڈچ اور جرمن سے فی زمانہ انگریزی زبان کی طرز تحریر اُردو زبان پر بہت اثر کر رہی ہے۔ اُردو اخبارات اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی بولی انگریزی زبان کے الفاظ و محاورات سے معمور ہوتی ہے۔ اگرچہ مستند

اُردو مصنفین کی تحریروں میں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کو چنداں دخل نہیں ہے۔ تاہم بہت سے الفاظ آہستہ آہستہ ان تحریروں میں آتے جاتے ہیں مثلاً توبۃ النصوح کے مصنف نے الفاظ انٹرسٹ، انٹرنس اہم، فری میسن۔ ربڑ، پنسل، ڈاکٹر وغیرہ کو استعمال کیا ہے اور ان کی طرزِ تحریر اور لکھنے کا ڈھنگ انگریزی طرزِ ادا سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ اس اثر کا نتیجہ خود واضح ہو جائے گا۔ جیمز صاحب اس امر کے متعلق یوں پیشگوئی کرتے ہیں:۔

غالب گمان یہ ہے کہ ریلوں، سڑکوں اور دیگر وسائل آمد ورفت کی توسیع سے پنجابی اور راجپوتانہ کی دیگر مقامی بولیاں معدوم ہو جائیں گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اٹک سے راج محل تک اور ہمالیہ سے وندھیاچل تک ایک ہی زبان "ہندی مغربی" یعنی اُردو کا دور دورہ ہو جائے گا۔ اس وقت اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ سے بھی زیادہ ہو گی اور یہ زبان اپنی عظیم الشان وسعت اور روز افزوں وقعت کے باعث اپنی ہمسایہ زبانوں پر بھی ایک بڑا اثر ڈالے بغیر نہ رہے گی۔ جوں جوں مقامی اتحاد کے وسائل اور ملک کے مختلف حصوں کے تعلقات بڑھتے جائیں گے توں توں یہ سادی شستہ بانکی اور ہر قسم کے مطالب کو ادا کر سکنے والی اُردو زبان جو ہندوستان کے اکثر حصوں میں بولی جاتی ہے اور جو حکمران قوم کو انگریزی زبان کے ساتھ تشابہ رکھنے کے باعث بالخصوص مرغوب ہے۔ ہندوستان کی اکثر دیگر زبانوں پر غلبہ حاصل کرتی جائے گی اور بالآخر وہ وقت آجائے گا۔ جب کہ تمام آریا ہندوستان کی زبان ایک ہو جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو زبان اور انگریزی زبان کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور ولیم کوپر شاعر انگلستان کے دلفریب الفاظ دونوں پر صادق آتے ہیں"۔

"اے انگلستان اس مدتِ مدید کے بعد بھی تیری زبان پر تیرے فاتحین کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ شستگی، بانکپن اور لطفِ ادا اس کے خاص جوہر ہیں اور یہ خیالات و الفاظ کے گرانمایہ موتیوں سے دمک رہی ہے۔ جو تیرے فاتحین پیچھے چھوڑ گئے ہیں"۔

(اقبال کے نثری افکار از (صفحہ ۲۶ تا صفحہ ۴۲) از عبدالغفار شکیل طبع انجمن ترقی اُردو ہند دلی)
(ماخوذ از نقوش ادبی معرکے نمبر)

●●



لکھنؤ کا چہلم

اردو زبان کی فصاحت اور سلاست کا ایک نمونہ

• رتن ناتھ سرشار

خانہ بدوش وخانہ برباد میاں آزاد ایک دن تڑکے جو کلبلا کر اٹھتے ہیں تو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا۔ ہر سمت تیرہ و تار۔ ظلمات کی سی کیفیت نمودار۔ کوئی شے نظر ہی نہیں آتی۔ نور کافور۔ سرا بھر میں نہ ایک دیا ٹمٹماتا ہے نہ چراغ جھلملاتا ہے۔ کوٹھری کے باہر آئے تو چو طرفہ دل بادل۔ قبلہ کی طرف سے جھومتی ہوئی گھٹا اٹھی۔ کالی گھٹا متوالی گھٹا۔ گھنگھور گھٹا۔ ٹھنڈری گھٹا ابر اٹھکھیلیوں پر ہے۔ شاخیں مستوں کی طرح جھوم رہی ہیں۔ ہوا اس زناٹے سے چل رہی ہے کہ کلیجہ لرزا جاتا ہے۔ مرغان خوشنوا گھونسلوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ پرندہ پر نہیں مارتا۔ ایک دفعہ ہی بجلی کوندی اور رعد نے گرجنا شروع کیا۔ پھر تاریکی نے وہ زور باندھا کہ کالے کوسوں تک کالی کالی گھٹا ہی نظر آتی تھی اور ہوائے سرد سن سن کرتی جاتی تھی ؎

آتش گل کا دھواں بام فلک تک پہونچا
جم گیا منزل خورشید کی چھت پہ کاجل

جوگیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبھوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمل

ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے
برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل

جس طرف سے گئی بجلی پھر ادھر آ نہ سکی
قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل

کبھی ڈوبی کبھی اُچھل منہ توڑی کشتی
بحرِ الحمزہ میں تلاطم سے پڑی ہے ہل چل

ایک دفعہ ہی پھر دامنی دمکی اور بجلی چمکی تو اندھیری رات میں بس یہی معلوم ہوا کہ سونا کسوٹی پر کسا گیا۔ چشم زدن میں برق چشمک زن الوپ انجن تھی۔ پھر اندھیر اگھپ میاں آزاد چپ۔ سرا میں سناٹا، سیر نہ سپاٹا۔ فقر دھونے ہی کو تھے کہ بادل کی صورت دیکھ کر کنکوا ہتھے پر سے اُکھڑ گیا۔ وہ کاٹا۔ اتنے میں ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگیں اور بی بھٹیارن نے الاپنا شروع کیا کہ ؎

برسن کو آئیں گھٹا کاری کاری
اودری دھمری کاری بھری کی اجیاری

کارے کارے بیرے بیرے بدرا لئے سنگ
بدرا کی گرج سنت جمیر الرجت برسن کو آئی گھٹا کاری کاری

مگر ہوا نے پھر وہ زور باندھا کہ بادل اوپر ہی اوپر اڑنچھو ہو گئے۔ کچھ یوں ہی سی بدلی تھی، تو دیکھتے کیا ہیں کہ دھانی دوپٹہ پھڑکاتی ایک حسین مہ جبیں چمکتی چلی آتی ہے۔ واہ اودی اودی گھٹا اور وہ ہلکا دھانی دوپٹہ۔ فصل کی چیز ہر دلعزیز پوچھا کہاں سواری چلی۔ مسکرا کر بصد ناز و ادا جواب دیا۔ (لکھنؤ کا جہلم دیکھنے) میاں آزاد تو لکھنؤ کے محرم الحرام اور مجالس عزا کی دھوم دھام پر لٹو ہو گئے تھے۔ ٹھان لی کہ جہلم کی جہل پہل بھی دیکھیں گے۔ اور ضرور دیکھیں گے۔ ایک ذقن بھرنے کی دیر تھی کہ لکھنؤ کے اسٹیشن پر دن سے داخل ہو گئے۔ بگھی پر سوار ہو کر ہوا سے باتیں کرتے کھٹ سے تال کٹورے کی کربلا پہونچے۔ اللہ اللہ جہاں تک پیکِ نظر کی رسائی ہے۔ بگھیوں اور یکوں اور گھوڑوں اور ہاتھیوں اور رتھ اور بہل اور ڈولیوں اور فنسوں کا تانتا لگا ہے۔ جدھر جاؤ دھوم جدھر دیکھو ہجوم۔ بانکے۔ ترچھے۔ تیکھے۔ گنڈے نقے۔ لُقند نے دو دانگل کی نکے دار ٹوپیاں آنکھیں سے ستک گاہ پر جمائے۔ انکھڑیوں میں سُرمہ لگائے۔ بانڈی ٹیکتے۔ آنکھیں سینکتے پھرتے اینڈتے تنتے۔ اینٹھتے۔ شرعی کی تہمن کمر توڑی اور ادبھی چھلی کے انگرکھے پھڑکاتے ہوئے جانے جا رہے ہیں۔ جواد بھی بنا لٹھ بل پر بل کرتا ہے۔ صوفیانِ صافی ہو حق کی صدا بلند ہے۔ مگر افشائے راز میں زبان بند ہے۔ خوش باش بھی بو قدر ہے جاتے ہیں۔ اِدھر اُدھر دل بہلاتے ہیں۔ چانڈو باز بڑھ بڑھ کر دم لگاتے ہیں۔ جب گرماتے ہیں تو دھوئیں بتے اڑاتے ہیں اور غین ہو جاتے ہیں۔ میاں آزاد گھبرائے کہ ایں! یہاں بھی چانڈو خانہ یہ چانڈو کا ٹھیکہ دار ہے یا دیوانہ۔ بھلا چانڈو خانہ اور بابو کا یہاں کیا کام ہے۔ واللہ کتنا اژدحام ہے۔ امرا و رؤسا، عمائد شہر پھولداریوں شامیانوں جس کے بنگلوں اور خیموں میں تین دن سے گھیر ہے اڑار ہے تھے، مگر مومن پاک اللہ سے لو لگا رہے تھے۔ امرا کی شان ہی اور تھی۔ رؤسا کی آن بان ہی اور تھی۔ کشمیر جنت نظیر کی شالباقوں کا بار منت سب کی گردن پر تھا۔ دو شالہ دو سالہ زیب دوش تھا کوئی چاندی کی گڑگڑی گڑ گڑا تا ہے، کوئی مشکبو دھواں دھار پیچواں پیتا ہے۔ زیر انداز پر جوبن ہے۔ حقہ کیا دُھن ہے ؎

حقہ نہیں عصا ہے یہ موسیٰ کے ہاتھ میں
بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

آگے بڑھتے ہیں تو اربابِ نشاط کے جمگھٹے۔ معشوقوں کے جمگھٹے وہ چھب وہ ادا، وہ ناز، وہ غمزہ کہ زاہد صد سالہ کی تسبیح و تہلیل بھول جائیں اور صوفی کے بھی ہاتھ پاؤں پھول جائیں۔ میاں آزاد گو رنگین طبع، سودائی مزاج، رند مشرب، بے باک آدمی تھے، مگر دیکھتے ہی بگڑ گئے اور ایسے گرمائے جیسے جلنے پر پانی چھڑک دیا۔ لاحول ولا قوۃ انھوں نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اس متبرک مقام سے بھی مُنہ نہ موڑا۔ ایک عاشق تن سُنتے ہی لال بھبوکا ہو گئے اور میاں آزاد کی طرف گھور کر کہنے لگے کہ ؎

دھواں بھبھتی سے اٹھ کر یا الٰہی ابرِ رحمت ہو
کہ چھینٹ زاہدانِ خشک تر دامن کی عزت ہو

اتنے میں باجے کی آواز کان میں آئی۔ لوگوں نے کہنا



مسعود حسن رضوی۔۔ کتابیں سینے کی ٹھنڈک

شروع کیا کہ جناب نواب ممتاز الدولہ بہادر کا تعزیہ آتا ہے بڑی دھوم دھڑکے سے اٹھتا ہے۔ میاں آزاد بھی ایک اونچے ٹیکرے پر کھڑے ہو گئے کہ کل کیفیت دیکھیں۔ اللہ اللہ کوسوں تک جلوس ہے۔ ۴۵ ہاتھی دیتلے۔ ایک دنتے۔ مست۔ دُم کٹے۔ کوئی زنجیر کو سونڈ سے اُچھالتا ہے، کوئی... جھومتا ہوا آتا ہے۔ کوئی سر پر خاک ڈالتا ہے۔ ہستیوں کے دُھتی۔ گھوڑے جھانکی کی لت۔ اونٹ بلبلاتے ہیں۔ شتر غمزے کرتے جاتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ کیا کاواک لمحہ سمجھا کہ جانور ہے۔ ماشاء اللہ کیا قطع ہے۔ یہ گردن ہے یا شیطان کی آنت۔ باجے والے وردیاں ڈانٹے گھوڑوں پر اکڑے بیٹھے ہیں۔ طاق عرش بریں پہ ہے۔ نیچے زمین آسمان بالائے سر ہے۔ حاکے پلٹن کے چار سو تلنگے رپ رپ کرتے جا رہے ہیں۔ برچھی برداروں کی لال لال وردی پہ گُل لالہ کھلا تھا۔ شرخا

شرخ۔ بیر بہولی بنے ہوئے۔ بان بردار بان چمکاتے۔ پھریرے اڑاتے بڑے دھڑلے سے ساتھ ہیں۔ بادبہاری شہید کربلا کی سواری طنبورے چھیڑ رہے ہیں۔ باجے نے وہ رنگ جمایا کہ راگ اور راگنی نے مرحبا کا طنطنہ بلند فرمایا۔ نشان کی وہ آن بان کہ ع عجب تیری قدرت عجب تیری شان۔ کشتیوں کی قطار اور ان پر گلاب پاش عنبر بار گنگا جمنی پر بہار انگیٹھیوں میں مشک اذفر نافہ و عنبر۔ چوبدار عصائے نقرئی و طلائی لئے۔ جلوس کا زیب و زین ہے کسی سمت آہ و بکا اور صدائے بین ہے۔ چپراسی لال لال پگیاں جمائے مُہر کی صورت بنائے۔ ہاتھ میں خوشنما لکڑیاں اور ان میں پیتل کی پھلیاں پھکیت کنکے لئے اکڑ رہے ہیں۔ گھانی اور چھوٹ لڑ رہے ہیں۔ طمانچہ دکھایا اور ہاتھ گھمایا۔ پاہرد دیا اور ہنسلی کا ہاتھ لگایا۔ کنکہ سو قدم پر اچھل گیا۔ ہاتھوں

ہاتھ سیر بھر حلوا سوہن لیا۔ یہ چمکا یا وہ کڑک کر پالٹ کا پھر پورا ہاتھ لگایا۔ واہ استاد اس صفائی کے قربان کیوں نہ ہو، واہ پہلوان۔ پھر ایک دفعہ ہی تین کی دوہری مات کی تو پرے کے پرے صاف تھے۔ بیچ کھیت گھمسان لڑتے ہیں۔ کلّے پہ کلّے پڑے ہیں۔ اب ماتم داروں کا نام لیا تو کروبیوں نے عرش بریں کو تھام لیا۔ زمین کا گہوارہ ڈانواں ڈول تھا ہزاروں کا غول تھا۔ حسنؑ اور حسینؑ کی صدا نہ کرسی آسمان تک بلند تھی۔ گریہ وزاری بکا و اشکباری اور برسوں سے وہ چند تھی۔ ہزارہا عزادار شریک ماتم سینہ مجروح آنکھیں پُرنم، مرثیہ خوان خوش الحان۔ گریہ کنان چہان چہان جا رہے ہیں۔

واحسرتا کہ ماہِ محرم گذر گیا
اور چہلم امام دو عالم گذر گیا

تیسرا مصرع محل میں سن نہ سکے
ماتم رہا یہ موسم ماتم گذر گیا

اک دن اسی طرح سے یہ دنیا تمام ہے
پھر شاہ کربلا کی عزا کا اہتمام ہے
اور یوں بیان کرتے تھے سجاد خستہ حال
بندی بنا کے لے چلے دیکھو یہ بدخصال
سر ننگے بال کھولے میرا کارواں تھا
سب اونٹ پہ سوار تھے میں ساربان تھا

اتنے میں ریلا آیا تو ٹیپ کا شعر سننا درکنار ٹوپی چپت گاہ سے ایڑی پر آ رہی۔ اس کے بعد کوئی ۳۵ تعزیے آئے۔ ایک سے ایک خوشنما۔ ہر ایک ضریح مبارک قابل دید تھی بلکہ دید تھی نہ شنید تھی۔ چو طرفہ علم اور سونے کے پنجے اور سہرے اور ان میں گوہر شاہوار لٹکتے اور دُرِّ یتیم و آبدار جھلکتے۔ پھولوں کی بوباس سے دماغ طبلۂ عطار بن گیا۔ دلدل، سبحان اللہ سبحان اللہ۔ اشہب آہو شکار، تند خو راہوار۔ سمند و خا پسند۔ کرنگ نقرہ خنگ جری لے جنگ کمیت اور شرنگ سونے کی رکھی۔ گنگا جمنی لٹو۔ ڈھال ڈھال اُس کے برابر شمشیر خارا شگاف و خوش غلاف لٹکی ہوئی۔ چادر میں خون کے ایسے دھبے جس نے عزاداروں کو خون رُلایا۔ ہر چشم پاک آنسو بھر لایا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ دُلدُل سوار نے ابھی زخم کھایا ہے اور فرس سلیقہ شعار اس سانحۂ ہوش رُبا کی خبر لایا ہے اور میدان کارزار سے سیدھا چلا آیا ہے۔ باگ ایک طرف کٹی ہوئی ہے۔ ہائے یہ واقعہ بھی کیسا جگر خراش ہے۔ سب سے سینہ پاش پاش ہے۔ اِدھر تیر اُدھر کمان۔ اِدھر دستانہ اُدھر عمامہ۔ حضرت فردوس آشیاں فخرِ زمین و زمان۔ پل پہ مجمع خاص و عام تھا خاتونانِ بلقیس منزلت اور بیگمات لکھنؤ کا بند گاڑیوں میں اژدحام تھا لوگ پلے پڑتے تھے چپے چپے پر لڑتے تھے۔ ساقنوں کی دکان دھواں دھار ایک دم میں لو آسمان کے پار۔ میاں آزاد یہاں سے بھاگے تو افتاں و خیزاں کربلا میں دم لیا۔

...ں میاں یہ قبر کس کی ہے۔ ایک جوان طناز باسینۂ ...ریاں و دیدۂ گریاں یوں اٹھا کر یہ مقام فشار ہے۔ تیر غم ...گر کے پار ہے۔ ارے نادان یہ حسنو جان کا مزار ہے۔ یہ ...ل فگار ہے۔ چشم اشکبار ہے۔ ادھر ادھر گلاس اور پٹڑیوں ...قطار۔ بیچ میں سرو گلوں کی بہار۔ قبر پر زربفت کی چادر ...یقیش کی جھالر۔ چوطرفہ کرن۔ قبر پہ بادلہ سنہری ...ہتروں کی امرد گوں۔ کھنڈریاں لگی ہیں۔ ان سب پر ...ربفت کا شامیانہ ستم ڈھاتا ہے۔ دل ہے کہ امڈا آتا ہے۔ ...بے اچھے وضعدار اور گرد گھڑے آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں ...ق اور جنون کے صدقے میں عقل سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ ...اں آزاد کا دل بھی بھر آیا اور زار زار رونے کا تانتا لگایا۔ ...نے میں جھنیا کلاوان کی صورت جو دیکھی تو بدن پر رعشہ ...لیا، ہاتھ کانپنے لگے، پاؤں ڈگمگائے۔ رنگ فق ہو گیا ...بے غش ہو گیا۔ یا خدا یہ کس کی صورت دکھائی۔ آنکھ کھولی پھر وہی سر نظر آئی۔

میاں آزاد سرا پہنچے تو سر شام ہی سے آنا چٹ ...لم کی چہل پہل اور کربلائے عشق کی سرگزشت سے لیے ...ھک گئے، پاؤں درد کرنے لگے۔ سوئے تو کب اٹھے جب ...رغانِ خوشنوا چہکنے لگے اور گلہائے معنبر مہکنے لگے۔ اٹھتے ہی ...منہ دھویا اور رشک پری ایک جلسۂ یاران سر پل میں گذرا ...وا تو عجب گفتگو سننے میں آئی۔ ایک صاحب نے اپنی بپتی ...ردات یوں سنائی۔ بھئی قسم ہے خدا کی جیسے ہی جنگل میں ...پہنچا ہوں۔ عجب تماشا دیکھا۔ واللہ باللہ ثم باللہ دیکھتا ...ہوں کہ ایک شیر ببر دم پھلاتا درخت کے سائے میں ...ڑا ڈکار رہا ہے اور آپا جان کی قسم یہ دیکھئے واللہ ہے کہ ...پہت اور اس سے کوئی چار ہی پانچ قدم کا فاصلہ ہو گا۔ ...بری اٹھتی جوانی اور گینڈا بنا ہوا، اور بھائی اللہ گواہ ہے ...میں اپنی طاقت آزمائی بھی کر چکا تھا۔ ایک دفعہ مکنا ...ہی کو پکڑ کر طمانچہ مارتا ہوں تو دم دبا کر یہ بھاگا وہ بھاگا ...مر سیاہ زخم بچا تو نہیں تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بس

ارے نادان یہ حسنو جان کا مزار ہے۔
ہے ہے دل فگار ہے۔ چشم اشکبار ہے

شیر کو ایک دفعہ ہی ڈپٹ دیا۔ بھلا یہ آگے قدم بڑھایا اور میں نے بھرپور ہاتھ جمایا۔ تب تو شیر دو بھی غرایا۔ بس اس پہ مجھے غصہ بھی آ گیا۔ پھر تو حضرت قسم ہے جناب باری کی بندۂ درگاہ بھی جم گئے اور زناٹے سے بدن تول کر ولایتی کا ہاتھ جو چھوڑا تو شیر نے تیورا کر منہ موڑا۔ میں نے کہا... او گیدی نامعقول تو شیر ہے۔ یا بجنبے ہے۔ یہ کہہ کر میں جھپٹ پڑا اور جھپٹتے ہی میاں کی دم جو دبائی تو ہاتھ میں تھی پھر تو میں نے غل مچایا کہ ابے او لنڈورے۔ (سوچنے لگے)۔ دلچکی سے بڑھ کر ایک ہاتھ ولایتی کا دیا کاسۂ سر کاٹتی ہوئی چیر کے بر تک پہنچ گئی۔ اتنے میں مجھے خیال آیا کہ اس بار خلاف مسلح وہ ہرتا۔ یہ تقاضائے شجاعت نہیں۔ معاذ اللہ واہ سے تلوار پھینک کر جھپٹ گیا (پھر سوچنے لگا)

اتھوں ہاتھ دستی کھینچی اور کولے پر لاد کر دم سے زمین پر دے پٹکا۔ چاروں شانے چت۔ وہ پچھاڑا ہے یہ حضور تال ٹھونک یا علی کہہ کر اٹھا۔ مگر آپا جان کی قسم اس وقت داد دینے والا کوئی نہیں۔ ادھر ادھر دیکھا سناٹا۔ اتنے میں جنگل کے بھوسے ریچھ نے اکڑ کر ڈنڈ پیل دیئے۔

میاں آزاد چپکے چپکے سن رہے تھے، جب داستان ختم ہوئی تو اٹھ کر میاں شیر افگن کی کھوپڑی پر ہاتھ سے لگا کے دن آنکڈ نے ایک چپت جمائی۔ تڑ سے۔ اتنا جھوٹ۔ کیوں بھئی۔ یہ ریچھ کا ڈنڈ ملنا کیا معنی۔ ریچھ بھی کوئی آپ کا چچا تھا اور آپ ماشاء اللہ لیے کرارے ہیں کہ شیر ببر سے تم نے مقابلہ کیا اور یہ بات بات میں قسم کھاتا اور جناب باری کو درمیان میں لاتا ہے لاحول ولا۔ خبردار جو کبھی گپ اڑائی یا قسم کھائی تو دست پناہ سے زبان کھینچ لوں گا اور منہ میں دھول بھر دوں گا۔

●●

غزل

بیخود دھلوی

محبت میں اک انقلاب آگیا — انھیں آج مجھ سے حجاب آگیا
وہ چھوڑیگا اب زندہ کسکو یہاں — قیامت سے پہلے شباب آگیا
ترے ہجر میں ہم کو جینا پڑا — اجل کی طرف سے جواب آگیا
ہجومِ تمنا خدا کی پناہ — پیامی مرا کامیاب آگیا
زباں ہم نے کی آبِ زمزم کہ پاک — اگر لب پہ ذکرِ شراب آگیا
کہوں کس سے ناکامیاں عشق کی — وہ آئے لحد پر تو خواب آگیا
زمانے کے سب غم غلط ہو گئے — مرے ہاتھ جامِ شراب آگیا
سزاوار زاہد کو ہے ذکرِ غم — کہ چہرے پہ رنگِ شباب آگیا
زمیں پر اُتر آئی خُلدِ بریں — کہ زاہد بھی پی کر شراب آگیا
محبت زمانے سے رخصت ہوئی — زمانہ کچھ ایسا خراب آگیا
ہنسانے کو چھیڑا تھا میں نے اسے — تبسم کے بدلے عتاب آگیا
تمھیں تو ہے فتنے اٹھانے سے کام — قیامت نہ آئی شباب آگیا

جو جاگے بھی بیخود تو جاگے ہیں کب
لبِ بام جب آفتاب آگیا

اردو میں طنز و مزاح آزادی کے بعد



احمد جمال پاشا



اردو میں طنز و مزاح کا آزادی کے بعد جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ان ظریفوں پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جو آزادی کے ساتھ ہمیں ملے یا آزادی سے پہلے میدانِ ظرافت میں اہم کارنامے انجام دے چکے تھے اور آزادی کے آنے کے ساتھ ہم سے آملے۔

اردو نظم میں زار ہند، جوش، لق لق، احمق پھپھوندی، شاد عارفی، سید محمد جعفری ناصر، اسد ملتانی، مجید لاہوری، فرقت کاکوری اور نثر میں عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، پطرس، رشید احمد صدیقی، ملک پیا سالک، سندباد جہازی، جگین کاظمی، چودھری محمد علی ردولوی، منظور، شفیق الرحمان اور کنہیا لال کپور ان میں بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے کئی ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے ہیں۔

کاروانِ ظرافت کے قدیم سالاروں میں اب رشید احمد صدیقی، شفیق الرحمان، فرقت کاکوری، سید محمد جعفری، کنہیا لال کپور، آوارہ حیدر آبادی، فکر تونسوی اور بھارت چند کھنہ ہمارے ساتھ ہیں۔

رشید احمد صدیقی آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی اردو نثر میں سب سے بہتر اور برتر طنز نگار تسلیم کیے گئے اور کیے جاتے ہیں۔ یوں تو رشید احمد صدیقی صاحب کو بخشوانے کے لیے ان کا شاہکار مضمون "ارہر کا کھیت" یا ان کے معرکۃ الآرا مضامین کا



رشید احمد صدیقی
بہترین طنز نگار، مزاح نگار، خاکہ نگار، مرقع نگار اور سوانح نگار

مجموعہ "مضامین رشید" بہت کافی تھا، مگر انہوں نے خنداں، لکھ کر اردو ظرافت کو خاکہ نگاری کی ایک نئی راہ دکھائی۔ "خنداں" کے خاکے چٹکلے ہلکے پھلکے ہیں "گنج ہائے گراں مایہ" "ذاکر صاحب" اور "ہم نفسان رفتہ" کے خاکے اتنے ہی وقیع اور پرشکوہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ "مضامین رشید" کے بعد جہاں رشید احمد صدیقی کے طنز اور خیالات میں گہرائی آتی گئی۔ وہاں ان کی شوخی اور خوش طبعی میں کمی ہوتی گئی "مضامین رشید" کے مصنف اور "عزیزان ندوہ" کے مصنف "ارہر کا کھیت" لکھنے والے اور "سرگذشت عہد گل" اور "مضامین رشید" ایک طنز و مزاح نگار کے شاہکار ہیں۔ "عزیزان ندوہ" اور "سرگزشت عہد گل" یا بعد کے مضامین ایک مفکر اور فلسفی کے خیال پارے ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی مقابلہ نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ رشید احمد صدیقی بہترین طنز نگار، مزاح نگار، خاکہ نگار، مرقع نگار اور سوانح نگار ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ "آشفتہ بیانی میری" سے بہتر نمونہ ہمارے ادب میں نہیں ملتا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ عمر، تجربے، مشق اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ظرافت، سنجیدگی میں بدلتی چلی گئی۔ ان کی تازہ تحریریں انہیں ایک بیدار مغز مفکر کے روپ میں تو ضرور پیش کرتی ہیں، مگر مضامین رشید والی تہہ دار ظرافت اور لطیف تحریری طنز کا ان میں کوئی بھی پرتو نہیں ہوتا۔ جذبے پر عقل واستدلال کی یہ برتری اردو ادب کے لیے فال نیک ہو تو ہو مگر اردو ظرافت کے لیے محرومی کے سوا کچھ نہیں پھر بھی رشید احمد صدیقی نے اردو ادب کو طنز و مزاح سے جتنا مالا مال کیا ہے اور اسے جو بلندیاں اور وسعتیں عطا کی ہیں۔ ان تک نئے ظریفوں میں نہ کوئی پہنچا اور نہ اس راہ پر کامزن نظر آتا ہے۔

شفیق الرحمان اردو طنز و مزاح میں خالص ظرافت کے امام ہیں "کرنیں" "لہریں" "پچھتاوے" "مد و جزر" "شگوفے" "حماقتیں" "مزید حماقتیں" اور "پرواز" وغیرہ ان کے رومانی اور مزاحیہ مضامین و افسانوں کے مجموعے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شفیق الرحمان کے یہاں مزاح پیدا کرنے کے لیے لطائف کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مگر اردو یا کسی دوسری ترقی یافتہ زبان کا کوئی ایسا مزاح نگار ہے جس کے یہاں لطائف کا اہتمام نہ ہو خود اردو میں کیا مرزا غالب کے یہاں لطائف نہیں ملتے یا رشید احمد صدیقی کے یہاں لطائف کا اہتمام نہیں ملتا۔ شفیق الرحمان کے یہاں لطائف کو کھپانے کا جو سلیقہ ہے۔ اس کی مثال ہمیں اردو ظرافت میں دوسری جگہ نہیں ملتی۔

یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ شفیق الرحمان کی ظرافت میں مقصدیت نہیں ملتی۔ "تزک نادری" ... "برساتی"

اور ان کے مضامین کو نسبتاً شاہکار مضامین، افسانوں اور تحریروں کو بے مقصد نہیں قرار دیا جا سکتا۔

شفیق الرحمان کے یہاں زندگی اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ آتی ہے۔ ان کے یہاں فکر جہاں بھی ہے اور رقم جہاں بھی چھوٹے اور میٹھے مسائل کی نشان دہی بھی ہے اور زندگی کی ناہمواری پر خوشنما طنز بھی۔

شفیق الرحمان کی اردو مزاح میں وہی اہمیت اور حیثیت ہے جو اردو طنز میں رشید احمد صدیقی کی۔ ان کا اصل میدان پیروڈی ہے۔ "تزکِ نادری" ان کی بڑی شاندار پیروڈی ہے۔ ان کے ہر مجموعے میں پیروڈی کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ "حاتم طائی بے تصویر" "قصہ طوطا مینا"، "ایک دن کا ذکر ہے" اور "چوتھا درویش" وغیرہ ان کی بہت ہی اعلیٰ درجے کی پیروڈیاں بھی ہیں۔

"شیطان" شفیق الرحمان کا مزاحیہ کردار ہے اور اُردو کے دوسرے مزاحیہ کرداروں سے یہ اس لیے ممتاز اور نمایاں ہے کہ نہ اس میں "مرزا جی" کی حماقتیں ہیں اور نہ وہ مضحکہ خیزی جو اُردو کے بیشتر مزاحیہ کرداروں کو مزاحیہ سے زیادہ احمق کردار کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

فرقت کاکوروی کا اصل میدان تحریف ہے۔ "راوا" اور "نا روا" کی پیروڈیاں اپنی تمام افراط و تفریط کے باوجود ہمیشہ خاصے کی چیز سمجھی جائیں گی۔ "خطوطِ غالب" کی تحریف میں بھی یہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں "ڈائیننگ ہال"، "اکنامکس" اور "فیملی پلاننگ" بھی ان کی تحریف کے اچھے نمونے ہیں۔

سید محمد جعفری بلاشبہ اکبر الٰہ آبادی کے بعد اردو کے سب سے بڑے طنزیہ و مزاحیہ شاعر ہیں۔

سید محمد جعفری کی مزاحیہ، طنزیہ اور تحریفی نظموں میں بلا کی آمد، بے ساختگی اور روانی ہوتی ہے۔ ان کی نظم "کلرک"، "وزیروں کی نماز"، "پرانا کوٹ"، "بھکاریوں کی ہڑتال"، "مردم شماری"، "ایبسٹریکٹ آرٹ"، "حبیب لالچہ کا بنجارا"، "کاغذ کا مرثیہ"، "آٹے کی بوری"، "یو این او"، "ملبوسِ ڈنر" اور "آپ ٹو ڈیٹ" وغیرہ ہماری ظریفانہ شاعری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔



فرقت کاکوروی

کنہیا لال کپور ہمارے اہم طنز نگار ہیں۔ ان کے طنز میں ظرافت کی چاشنی کی وجہ سے بڑی خوشگواری ہوتی ہے۔ اس میں مقصدیت ہوتی ہے۔ اور کوئی نہ کوئی مسئلہ یا بات بھی [illegible]

کنہیا لال کپور طنز کو وسیع اور آبدار بنانے سے زیادہ اس کو چٹ پٹا اور مقبولِ عام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بہت شستہ اور رواں زبان استعمال کرتے ہیں۔

کپور کے افسانے، مضامین اور خاکے زیادہ تر کسی لطیف مسئلہ یا بات کے گرد گھومتے ہیں اور "ٹائپ کیریکٹرز" کی تلاش میں زیادہ رہتے ہیں۔



دلاور فگار

"سنگ وخشت" کپور کے سب سے نمائندہ مضامین کا مجموعہ ہے اس میں "مرزا غالب جدید شعراء کی مجلس میں" ان کی بہت شاہکار تحریف ہے۔

"سنگ وخشت" کے بعد "شیشہ وتیشہ" "چنگ ورباب" "بال وپر" "نرم گرم" "گرد کارواں" اور "طلوع سحر" ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین اور افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے۔

کپور کے بعد کے مجموعوں میں ان کے چٹ پٹے مضامین شامل ہیں۔ مگر ان میں "سنگ وخشت" کی تیزی اور نشتریت بتدریج کم ہوتی گئی۔ ان کے ہلکے پھلکے خاکوں میں بھی ان سے انکساری کا اظہار ملتا ہے۔

اردو طنز نگاروں میں کپور ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے خوبصورت طنزیہ مضامین ابھی ان کے مجموعوں میں خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ فکر تونسوی خالص طنز نگار ہیں۔ روزنامہ "ملاپ" میں یہ مزاحیہ کالم "پیاز کے چھلکے" بھی لکھتے ہیں۔ روزانہ کالم میں عوام کی بول چال اور ان کی زبان میں خیالات کا اظہار کرتا ہوتا ہے ان کا "پیاز کے چھلکے" عوام میں بہت مقبول ہے۔ ان کا شمار اردو کے ممتاز کالم نگاروں میں ہے مگر ان کی روزمرہ کی صحافت نے ان کے ادب کو متاثر کیا ہے فکر کے پاس گہرا سماجی شعور ہے۔ مسائل پر گہری نظر ہے مگر طنز نگاری میں جو زبان یہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ ادب سے زیادہ ان کو صحافت سے قریب رکھتی ہے جن مضامین میں بھی انہوں نے صحت زبان کا اہتمام کیا ہے وہ ان کی انشاپردازی کے بہت اچھے نمونے ہیں۔

آوارہ حیدرآبادی کو زبان وبیان پر قدرت ہے۔ "اپنی موج میں" ان کے شگفتہ خاکوں کا مجموعہ ہے یہ اپنی موج میں جدھر چاہتے ہیں نکل جاتے ہیں انہیں یکساں زبان پر قدرت حاصل ہے۔ ان کے خاکے ماداں اصیلوں اور مغلانیوں کے جیتے جاگتے اور ہنستے بولتے مرقعے ہیں۔

بھارت چند کھنہ ہمارے پرانے مزاح نگار ہیں۔ "ٹھنڈی بجلیاں" ان کی مزاح نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

آزادی کے بعد اردو طنز ومزاح میں جو مزاح نگار سامنے آئے ان میں نظم میں واہی، رئیس امروہوی، اے ڈی اظہر، دلاور فگار اور سید ضمیر جعفری بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

رضا نقوی واہی اردو کی طنزیہ، مزاحیہ شاعری، کے جدید تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہیں ان کے طنز ومزاح کے امتزاج میں توازن اور ظرافت کو برتنے کا ایک خاص سلیقہ ہے۔

واہی کی زمانے عصری تقاضوں، مسائل اور عالمگیر ناہمواریوں پر بڑی گہری نظر ہے۔ واہی مذاق اڑانا، ہنسنا اور ہنسانا جانتے ہیں۔ یہ آداب محفل کے نزاکتوں، تہذیبوں، متانت اور شائستگی کے طور طریقوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے طنز میں تلخی،

چکے ہیں۔ اعتدال اور ناخوشگواری کا شائبہ بھی نہیں ملتا طنز و مزاح کے حسین امتزاج سے یہ اپنے کلام میں خوشگواریاں برقرار رکھتے ہیں۔ "واہیات" "طنز و تبسم" اور "زخم اور مرہم" ان کے باغ و بہار مجموعے ہیں۔ "پروگرام" "نقاد" "مہندی گرل" "لیبر لیڈر" "پی ایچ ڈی" "پروفیسر انہ" "منڈری کا نسخہ" "ریل کا سفر" "ماہرِ فن" اور "لال فیتہ" وغیرہ ان کی نظموں کے بہت کامیاب نمونے ہیں۔ ڈاکٹر کا طنزیہ اور مزاحیہ کلام اردو ظرافت میں بہت خوشگوار اضافہ ہے۔

ضمیر جعفری بہت ہی کامیاب مزاحیہ شاعر ہیں۔ ان کی زبان بہت رواں شستہ اور منجھی ہوئی ہے۔

ضمیر جعفری کی نظم "زنانہ اسمبلی" انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

ضمیر جعفری کو مزاح پر پوری قدرت حاصل ہے مہذب اور متوازن ظرافت کے فن پر پورے طور پر حاوی اور کامیاب ہیں۔

آزادی کے بعد اردو نثر میں جو مزاح نگار سامنے آئے ان میں ابراہیم جلیس، مشتاق احمد یوسفی، احمد جمال پاشا، وزیر آغا، محمد خالد اختر، ابن انشا، مسعود مفتی، امجد حسین، یوسف ناظم اور شفیع عقیل مجتبیٰ حسین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ابراہیم جلیس کے یہاں شروع میں طنز کی بے بہت تیز تھی "کالا چور" "ایک ملک دو کہانی" "نیکی کر تھانے جا" اور "اوپر شیروانی اور اندر پریشانی" میں بتدریج طنز کم ہوتا گیا اور مزاح کی فراوانی ہوتی گئی۔

ان کی مزاحیہ تحریروں میں طنز و مزاح کی خوشگوار آمیزش نے ان کی ظرافت کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی بہت ممتاز طنز و مزاح نگار ہیں ان کی ظرافت، رشید احمد صدیقی اور پطرس کے فن کے حسین امتزاج پیش کرتی ہے مگر ان کی منزل شاید ان دونوں



وزیر آغا — اُردو کے اہم ترین انشائیہ نگار ہیں

سے بھی آگے ہے۔ اور ان کی اپنی انفرادیت بھی ہے "چراغ تلے" مشتاق احمد یوسفی کے باغ و بہار مضامین کا مجموعہ ہے

وزیر آغا اردو کے اہم ترین انشائیہ نگار ہیں "خیال پارے" اور "چوری سے یاری تک" کے انشائیے ان کی انشا رنگاری کے بہت اچھے نمونے ہیں۔

محمد خالد اختر، ابن انشا، شفیع عقیل، مسعود مفتی، یوسف ناظم اور امجد حسین نے اردو ظرافت کے بہت اچھے نمونے پیش کیے ہیں، خاص طور پر ابن انشا میں طباعی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کا مضمون "استاد مرحوم" ان کی ظرافت کا بہت ہی بلند پایہ نمونہ ہے۔

ان کے بعد بساطِ ظرافت پر جلوہ گر ہونے والوں میں مجتبیٰ حسین، ماہ منیر خاں، قاضی غلام محمد، تخلص بھوپالی



عصمت چغتائی





راجندر سنگھ بیدی

سعادت حسن منٹو

اسلم عظیم آبادی، نظیر صدیقی سید نجم الحسن رضوی، رفیق خاور، تمنا مظفر پوری پرکاش پنڈت احمد مشکور، برق یوسفی اور ضمیر دہلوی ہیں۔ مجتبیٰ حسین، نجم الحسن اور برق یوسفی نے ظرافت کے بہت اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔

مجتبیٰ حسین بڑے تیکھے اور چوکھے مزاح نگار ہیں "تکلیف برطرف" ان کے مزاحیہ مضامین کا بہت ہی شگفتہ مجموعہ ہے "تکیہ کلام" ان کا شاہکار ظرافت ہے یہ خالص مزاح نگار ہیں۔

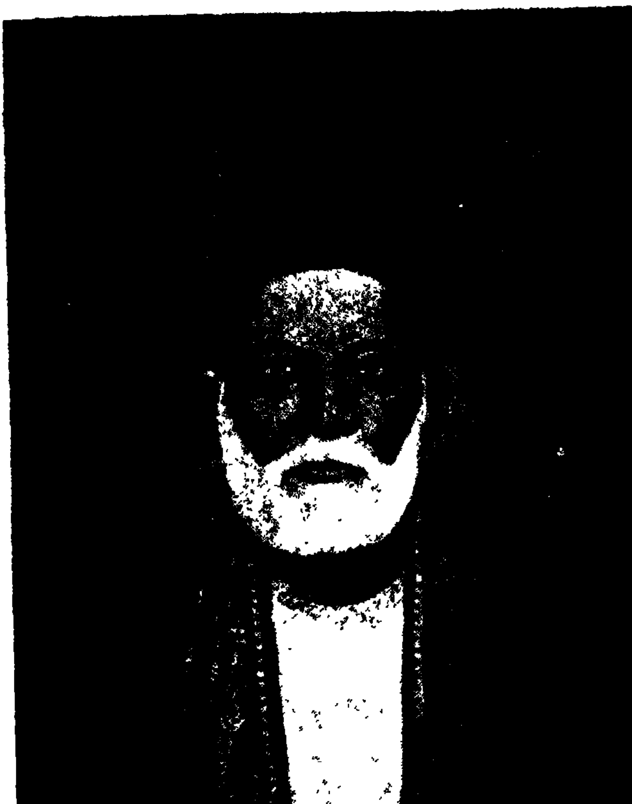
مرحوم مخلص بھوپالی بہت ہی بے باک طنز نگار تھے۔ سید نجم الحسن رضوی کی زبان اور ظرافت دونوں میں بڑی بے ساختگی ہوتی ہے۔ ماہ منیر خاں اپنے خاکوں میں ظرافت کا سامان اپنے گرد و پیش سے کرتے ہیں۔ قاضی غلام محمد کو تحریف میں خاص ملکہ ہے۔ "حسرت شیریں" ان کی مزاحیہ شاعری کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

اسلم عظیم آبادی، نظیر صدیقی اور ضمیر دہلوی کے انشائیے اور رفیق خاور کے "نکاہیے" اردو ظرافت میں نئے تجربات کی مثال ہیں۔ اسلم عظیم آبادی اپنے انشائیوں کو "قلم کاری" اور نظیر صدیقی اپنے مضامین کو "انشائیے" کہتے ہیں۔

خواتین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مزاح نگار نہیں ہو سکتیں۔ اس سلسلے میں اکثر دلچسپ بحثیں بھی چلیں۔ آزادی کے بعد جو ظرافت ہمارے سامنے آئی اس میں خواتین کا بھی حصہ ہے۔ زینت ساجدہ، صفیہ ادیب، سرور جمال، شفیقہ فرحت اور ثریا پروین، کی مزاحیہ نظمیں اور پیروڈیاں اردو ظرافت میں ایک نئے اور خوشگوار باب کا اضافہ کرتی ہیں۔

سنجیدہ ادیب بھی گاہے گاہے طنز و مزاح پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں جس کی اچھی مثال منٹو، عصمت کرشن، خواجہ، قدرت اللہ شہاب، ڈاکٹر محمد حسن، راجندر سنگھ بیدی، جیلانی بانو، رضیہ سجاد ظہیر اور غلام عباس وغیرہ کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریریں ہیں۔

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح میں جہاں صحافتی مزاح میں وقتی اور ہنگامی مسائل کی ترجمانی کی گئی، وہاں ہمارے مزاح نگار نئے سماج کے نئے کردار نئے موضوعات اور حادثات کو اپنی گرفت میں لانے کے بجائے زیادہ تر میر صاحب، مرزا صاحب، خاں صاحب اور نواب صاحب اور منشی جی کو پیش کرتے رہے اور ایسے کردار پیش کیے گئے جو از کار رفتہ ہو چکے ہیں اپنا وجود نہیں رکھتے یا ان کی نمائندہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود طنز و مزاح نے خاصی ترقی کی۔ ظرافت میں نئے اور کامیاب تجربے ہوئے رسائل و اخبارات میں مزاحیہ کالم کا چلن بڑھا اور مزاحیہ تحریروں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ●●



جب مرزا غالب کو چھ ماہ قید بامشقت ہوئی

مرتضیٰ حسین کی ایک تحریر

غالب ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو زبان و قلم و ذہن کی کاوشوں سے سبک دوش ہوئے۔ لیکن اہل قلم کو نئی شاہراہ پر لگا گئے۔ غالبؔ سے پہلے اردو کے کسی شاعر پر اتنی شرح و بسط کے ساتھ قلم فرسائی نہیں ہوئی بلکہ یہ کہنا بھی حقیقت کے خلاف نہ ہوگا کہ غالبؔ کے بعد بھی اتنی موشگافیاں اور زحمتیں کسی دوسرے کے لیے نہیں برداشت کی گئیں۔ "شخصی تنقید" کے لیے سب سے پہلے غالب ہی اردو میں موضوع قرار پائے۔ اور شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس پر اہل نظر و قلم کام نہ کر چکے ہوں۔

"سبد چیں" میں غالب کی ایک نظم جو "اجیہ" کے نام سے مشہور ہے، شائع ہوئی۔ میں نے اس پر کچھ لکھنا چاہا تو غلام رسول صاحب مہر کی کتاب "غالب" میں اس نظم سے متعلق واقعے پر بہت کچھ پایا۔ اس کے بعد "یوسف ہندی" "قید فرنگ میں" ایک چھوٹا سا رسالہ نظر سے گذرا۔ لیکن واقعے کے بہت سے جزئیات ان دونوں کتابوں کے علاوہ بھی ملے۔ دل چاہا کہ اس سلسلہ کی سب کڑیاں جمع کر دی جائیں لہٰذا۔

خواہم از جرم بز نداں سخن آغاز کنم

۱۸۵۷ء سے پہلے دلی عیش پرستی کا مرکز تھی۔ حکومت کمزور انگریز طاقت ور ہندوستانی مست، بے حسی اور کس مپرسی کی حالت میں چاروں طرف رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ رئیس زادے، اوباش نمش لوگوں میں بیٹھ کر اپنی فطرت بدل چکے تھے۔ بڑی بڑی حویلیاں جوے بازی کے اڈوں کے کام آ رہی تھیں۔

محبوب علی خواجہ سرائے زیر اہتمام دلی کے رؤسا جمع ہو کر جوا کھیلتے تھے اور ہزاروں کی رقمیں ہنڈیوں میں رکھ کر یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آتی تھیں۔

مرزا کی جوانی دیوانی تو تھی ہی، جہاں اور گلیوں کی خاک اڑائی تھی یہ کوچہ کیوں چھوٹتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرزا کلکتہ سے پلٹ چکے تھے۔ نواب شمس الدین خان بھی قتل ہو چکے تھے۔ اور مہر چھوٹا بڑا مرزا کا دشمن ہو گیا تھا۔

اپریل یا مئی ۱۸۴۷ء میں فیض الحسن خاں کوتوال ایک پردہ دار رتھ میں بیٹھ کر مرزا کے گھر پر چھاپہ مارنے آئے۔ دروازے پر روکے گئے تو یہ کہہ کر اندر داخل ہوئے کہ "کچھ زنانی سواریاں ہیں" کوتوال صاحب گھر میں پہنچے تو مجمع بھاگا ماتحی کے بیان کے مطابق "جوتوں سے زدو کوب ہوئی" اور بہت غلط طریقے سے لوگ گرفتار ہوئے مرزا صاحب بھی اسی زد میں آ گئے۔

مرزا حیرت نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کے ساتھ بہت رعایت کی گئی کسی قسم کی توہین نہیں ہوئی اور کسی نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا بلکہ ضمانت پر رہا کر دیئے گئے (چراغ دہلی ص ۲۲۳) مہر صاحب نے کوتوال کو مرزا کا مخالف بتایا ہے۔ لیکن مرزا حیرت کے بیان کے بعد مہر کا بیان مشکوک ہو جاتا ہے۔

مقدمہ دائر ہوا۔ اور "احسن الاخبار" کی خبر کے مطابق (۱۵ جمادی الثانی ۵ جون ۱۸۴۷ء) ریزیڈنٹ (معظم الدولہ) کے نام بہادر شاہ نے سفارشی خط لکھا لیکن جواب دیا گیا کہ۔

"مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں قانون سفارش کی اجازت نہیں دیتا۔" جون کا مہینہ مقدمہ میں گزر گیا آخر کار۔

مقدمہ کا فیصلہ

کنور نوروز علی خاں مجسٹریٹ دہلی باوجود یہ کہ غالب کے دوست تھے۔ لیکن مزاج کے سخت تھے۔ چنانچہ فیصلے میں مرزا کو مجرم قرار دیتے ہوئے چھ مہینے کی سزا و جرمانہ کر دیا "احسن الاخبار" ۲ جولائی ۱۸۴۷ء ۲۲ جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ میں فیصلہ شائع ہوا۔

"مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو



غالب – تخیل کے حواریوں کے درمیان!

روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو جائے گی۔"

قید سخت تھا اور پبلک کے نزدیک مرزا کے بیماری اور بے قصوری کے بعد اتنی بڑی سزا ظالمانہ تھی۔ لہٰذا اخبار میں احتجاج کیا گیا کہ۔

"جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے۔ تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے۔ بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔

یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ معمولی سے جرم میں ایسی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔"

بہرحال سزا ہو گئی اور غالب قید میں پہنچے۔ اور یہ کہتے ہوئے ؎

پاسباں بہم آئید کہ من می آیم
درِ زنداں مکشائید کہ من می آیم

منشی گھنشیا رام عاصی نے تاریخ کہی ؎

سیرا بجدے نعلی میں تو سب اظہار طوفاں ہے
اور اشارہ سو سینتالیس ہیں قید زیباں ہے

قید خانہ

دہلی سنٹرل جیل جو پہلے بہوری بھٹیاری یا بختیاری کی سرائے کے نام سے مشہور تھی اور ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت نے اس کو قید خانہ بنایا تھا، غالب یہیں

قید ہوئے ایک کوٹھری انھیں دی گئی تھی جس میں بقول حالی گھر سے آیا ہوا کھانا اور کپڑا مل جاتا تھا لیکن مرزا کے "بند" سے معلوم ہوتا کہ یہ انتظام جیل ہی کی طرف سے ہوتا تھا۔

شادم از بدکہ از بند طعام از ادم
از کف شحنہ رسد جامہ رنائم در بند

یہ کوٹھری تاریک، بوسیدہ و غیر ہوادار تھی۔

لرزم از خوف دریں حجرہ کہ از خشت و گل است
ورنہ در دل خطر از کام نہنگم نہ بود
آہ ازیں خانہ کہ روشن نہ بود در شب تار
جز بدان خواب کہ در چشم نگہبان سوزد
شمع ہر چند بہر زاویہ اسان سوزد
خوشتر آں است کہ بر نطع در ایوان سوزد
آہ ازیں خانہ کہ در روے نتوان یافت ہوا

جز ہمو میکہ خس و خار بیابان سوزد

قید خانہ میں اور مجرم بھی تھے۔

بلہ و زوان گرفتار و فانیست بشہر
خویشتن را بشما ہمدم و ہمراز کنیم

اہل جیل کی نگرانی و حفاظت کے لیے دو آدمی معین تھے

زین دو مرہنگ کہ پو ملیہ بہم بی ترسم
بیے از شیر و ہراسے ز پلنگم نبود

اس حالت میں تمام خاندان والوں نے مرزا کی قرابت سے انکار کر دیا تھا، احباب نے خبرگیری ترک کر دی تھی، صرف ایک مصطفٰے خان شیفتہ تھے جو ان کے خبرگیر تھے۔

مصطفٰے خان کہ دریں واقعہ غمخوار من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادار من است

تاثرات

مرزا کے لیے یہ واقعہ جتنا بھی روح



فرسا ہو کم ہے۔ لیکن ان کی فطرت انہیں دوسروں کے درد سے بے قرار کر دیتی تھی، وہ اپنا غم بھلا دیتے ہیں ؎

محنت خوش بہر مصیبت زدہ رنجے است دگر
کہ از دیدن رنج دگرانم در بند

اب رہے خود تو ؎

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نبود
چہ کنم چوں بقضا زہرہ جنگم نبود

مدت قید جون کے آخر میں فیصلہ ہوا، جولائی، اگست، ستمبر یعنی رجب، شعبان، رمضان کے تین مہینے قطعاً جیل میں گزرے، بلکہ غالب کی عید بھی وہیں ہوئی ہوگی ؎

رفتہ در بارۂ من حکم کہ بادرد و دریغ
شش مہ از عمر گرامی گذرانم در بند
ہم ازیں است خود آن است کہ عید الفطری
گزرد نیز چو عید رمضانم در بند

رہائی ایک دن "مسٹر راس" صاحب سول سرجن دہلی قیدیوں کے معائنہ کے لیے تشریف لائے۔ غالب سے بھی مزاج پرسی کی۔ مرزا صاحب نے فی البدیہہ کہا ؎

جس دن سے کہ ہم خستہ زنجیر ہوئے ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

سول سرجن نے رہائی کی سفارش کی اور مرزا صاحب رہا ہو گئے۔

مگر ذلت کا تصور ان کے لیے باعث خانہ نشینی ہوا اور وہ ایک عرصے تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد میاں کالے صاحب نے دربار تک رسائی کرا دی اور وہ دبیر الملک، نجم الدولہ، نظام جنگ جیسے عظیم القدر خطابات سے سرفراز ہوئے۔

دل چاہتا تھا کہ بند بھی نقل کیے جاتے لیکن ضرورت نہیں ہے لہٰذا آخری بند کے آخری دو شعر نقل کرتا چلوں۔

ہفت بند است کہ در بند رقم ساختہ ام
بنیوشیدہ بخوانید و بہ بے نیند ہمہ
آں نہ باشم کہ بہ ہر بزم ز ملتی یاد کنید
دارم امید کہ در بزم سخن یاد آرید

غزل

نوح ناروی

ہونے کو تو کہنے کو لاکھوں ہیں لیکن مرے مقابل کوئی نہیں
انداز سے اک اک دل میں خوش، خاص سے خوش کوئی نہیں

نازاں ہو جو تم اپنی صورت پر دعویٰ ہے بہت یکتائی کا
غمزوں کی طرف بھی دھیان کرو عشوؤں کی طرف بھی غور کرو

ہم کس پر اثر ڈالیں اپنا آداب وفا سے دور ہیں سب
کیا ہجر کے صحرا میں جا کر دل اہل جنوں کا بہلے گا

جو عشق کی خاطر جھیل سکے یہ حوصلہ ہمت کس میں ہے
ملتی ہی نہیں بارش بھی ہوئی شیشے بھی کھنکے ساغر بھی چلے

برمایا جگر کو ناوک نے زخمی کیا دل کو خنجر نے
اے حسن تجلی خلوت سے توقیر بڑھا دے جلوت کی

میں ترک وفا کا قصد کروں وہ ترک جفا پر مائل ہو
یاران جہاں کو دیکھ لیا اخلاص و وفا کو جانچ لیا

وہ بھی خفا دل بھی خفا سب اپنے پرائے سے بھی خفا
کم بختی کی ہمت کو دیکھو آزار محبت کو دیکھو

وہ رنگ محبت لوٹ دغا وہ زخم ستم وہ داغ الم
زندان محبت کے قیدی آزاد ہمیشہ رہتے ہیں

مدفن کے علاوہ دنیا میں آرام کی منزل کوئی نہیں
جس قسم کی تیری محفل ہے اس قسم کی محفل کوئی نہیں

یہ شمع یہ گل یہ آئینہ کیا مد مقابل کوئی نہیں
ہوتے ہوئے قاتل ہیں تم کہتے ہو قاتل کوئی نہیں

جو درد جگر کا درد سنے یوں درد بھرا دل کوئی نہیں
محمل تو ہزاروں ہیں اب بھی ہاں لیلیٰ محمل کوئی نہیں

دل ہو کہ جگر ہو کوئی ہو غم سہنے کے قابل کوئی نہیں
ہشیار ہیں سب اپنے کام میں ہیں میخانے میں غافل کوئی نہیں

لیکن ہیں مرے قاتل کے گماں زنداں میں بسمل کوئی نہیں
محفل میں سب اہل محفل ہیں رونق وہ محفل کوئی نہیں

یہ سب سے زیادہ مشکل ہے یہ بھی ہے مشکل کوئی نہیں
آرام کے ساتھی کتنے ہیں تکلیف میں شامل کوئی نہیں

کیا خلق و وفا کی دنیا میں احسان کے قابل کوئی نہیں
اس کا ہے مجھے دل سے گلہ جس کا مقتل کوئی نہیں

جتنے نظر آئے غنچہ دل ان میں مرا دل کوئی نہیں
ممنون سلاسل ہو کے بھی پابند سلاسل کوئی نہیں

اے نوح ڈبو دیگا تم کو امواج محبت کا طوفاں
ہر بحر میں ساحل ہوتے ہیں اس بحر میں ساحل کوئی نہیں



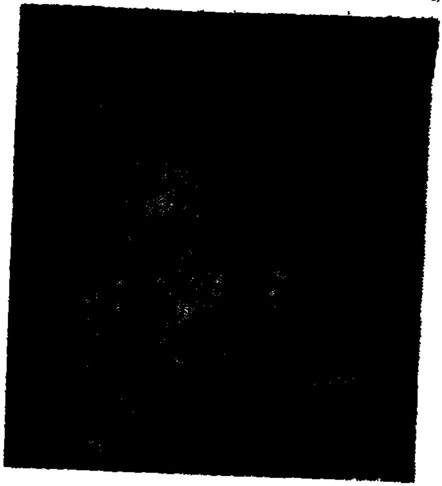
اردو دلکش زبان لیکن مستقبل تاریک

• سوم آنند

اتر پردیش کے سابق سول سپلائی وزیر واسدیو سنگھ اردو دشمنوں کی فوج کے نئے سیناپتی بنتے جارہے ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں اردو کے خلاف جو کچھ کہا ہے اس کے خلاف احتجاج کرکے اتر پردیش میں اردو اکادمی کے تمام ممبروں نے ہی استعفیٰ دے دیا۔ تمام ملک میں ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔ ان کے بیان پر لوگ اتنے مشتعل ہوگئے کہ کلکتہ کے ایک اردو روزنامہ نے لکھا کہ اب تو.. حکومت کو میمورنڈم بھیجنے کے بجائے مورچہ کا انعقاد کرنا.. چاہیے۔

لیکن واسدیو سنگھ نے جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے پچھلے کئی برسوں سے وہ ایسی ہی باتیں کہتے رہے ہیں۔ واسدیو سنگھ کو اس مطالبہ پر غصہ آجاتا ہے کہ اردو کو اتر پردیش میں سرکاری کام کاج کی دوسری زبان بنایا جائے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پردیش میں برسرِ اقتدار پارٹی یہ دعویٰ کر چکی ہے۔ کہ اتر پردیش میں اردو کو سرکاری درجہ دیا جائے گا۔ اس وعدے کو بہت پہلے پورا ہو جانا چاہیے تھا۔

پارٹی کے اس وعدے کے باوجود واسدیو سنگھ نے



اندرا گاندھی جیسی عظیم لیڈر کو بھی اپنے وعدے سے پیچھے ہٹنا پڑا تھا—

گا۔ اور ان کی مخالفت کی جائے گی۔

اندرا گاندھی جیسی عظیم لیڈر کو بھی اپنے وعدے سے پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ انھوں نے ۱۹۸۰ء میں اپنی پارٹی کے مینی فیسٹو میں اعلان کیا تھا کہ جن علاقوں میں بڑی تعداد میں لوگ اردو بولتے ہیں وہاں اردو کو سرکاری درجہ دیا جائے گا۔ لیکن اس وعدے کو پورا نہیں کر سکیں۔

انتخابی مینی فیسٹو ووٹ حاصل کرنے میں مدد دینے کے لئے ہوتے ہیں اور بہت کم ایسے ہوتے ہیں کہ جب پارٹی لیڈروں نے انتخاب سے قبل کئے گئے بھی وعدوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہو۔

بدقسمتی کی بات ہے کہ اردو ہندوستان میں اب ایک موقع پرستی کے بھنور میں پھنس گئی ہے۔ آزادی سے پہلے کے دنوں میں ہندی اور اردو کے بارے میں جو تکرار چلتی تھی اس کی وجہ سے ہی اب بھی اردو کی مخالفت کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں اردو کے خلاف اتنے زیادہ جذبات ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل ہونے کے پندرہ دن کے اندر اندر ہی اتر پردیش میں اسکولوں میں اردو کی تعلیم بند کر دی گئی تھی۔

گاندھی جی اور پنڈت نہرو

اس سارے معاملے میں مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی حالانکہ اردو کو دبائے جانے کے کسی بھی قدم کے خلاف تھے لیکن وہ بھی اردو کے حق میں کچھ نہ کر سکے۔ ہندوستان میں صوبائی حکومتوں کو بہت سے حقوق حاصل ہیں۔ اور اردو کے سوال پر اتر پردیش کے کانگریسی لیڈروں نے نہرو اور گاندھی دونوں میں سے کسی کی نہیں سنی۔ یہ بہتان تراشا گیا کہ اردو پاکستان کی زبان ہے اور ہندوستان میں اس کا کوئی مقام نہیں ہونا چاہیے۔

ہندوستان کی لسانی تاریخ میں یہ سب سے بڑا جھوٹ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں اس وقت فرقہ وارانہ نفرت کا دور

کئی مرتبہ اس جانبدار وعدے کے خلاف باتیں کہی ہیں ۱۹۶۹ء میں اسمبلی میں اس وقت شور مچ گیا جب انھوں نے بجٹ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان ماننے کے بارے میں بل رکھے جانے کی سخت مخالفت کی۔ جمہوریت کی تاریخ میں یہ ایک نئی اور انوکھی بات تھی کہ کسی وزیر نے اپنی ہی حکومت کی کسی کارروائی کی مخالفت کی ہو۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ اس وقت ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ ان سے نہ تو کابینہ سے استعفیٰ دینے کو کہا گیا نہ انہیں پارٹی سے نکالا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اتر پردیش میں کئی ایسے کانگریسی لیڈر ہیں جو حقیقتاً اردو کی ترقی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھانا نہیں چاہتے کیوں کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ ان کا مذاق اڑایا جائے

اتنا مشتعل تھا کہ اقلیتی فرقے کے لوگوں نے اس پر یقین کر لیا اتر پردیش اور دوسرے صوبوں میں اردو کو دبانے کی جو کارروائی صوبائی سرکاروں نے کی، مرکز نے اسے خاموش تماشائی کی مانند برداشت کر لیا۔

اردو کے خلاف جذبات ابھرنے کا آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں اردو بولنے والوں میں ایک ایسی نسل پیدا ہو گئی ہے کہ جو اپنی ہی زبان کو لکھ پڑھ نہیں سکتی۔

اتر پردیش اور بہار میں جو اس زبان کے اہم خطے مانے جاتے ہیں، سرکاری دفتروں میں اردو میں لکھی درخواستیں منظور نہیں کی جاتیں۔ پنجاب میں جس نے اس ملک کو بہت ہی عظیم ادیب اور شاعر دیے ہیں، شاید ہی کوئی ایسا اسکول ہو جہاں اردو کی تعلیم دی جاتی ہو۔ صرف مالیر کوٹلہ ضلع ہی میں اردو تعلیم کا کچھ بندوبست ہے۔ وہ بھی ناکافی ہے۔ اردو بولنے والوں کی تعداد سو کروڑ سے زیادہ ہے۔

لیکن کوئی بھی علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں صرف اردو بولی جاتی ہو۔ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ جن جن علاقوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ وہیں اس زبان کے خلاف جذبات بھی زیادہ ہیں یہی وجہ ہے کہ مرکزی حکومت اس معاملے میں اپنی ذمہ داری صوبوں پر ڈالتی رہی ہے۔ اور یہ کہتی رہی ہے کہ یہ تو صوبائی سرکاروں کا معاملہ ہے۔ مرکز اس میں دخل نہیں دے سکتا ہے۔

یہ بحث درحقیقت بے کار ہے کہ کیا صرف مسلمان ہی اردو بولتے ہیں اور دوسرے فرقے کے لوگ بھی اردو کا استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کسی کے خیالات چاہے جو کچھ ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک میں اردو بولنے والے لوگ سب سے بڑی اقلیتی اکائی ہیں۔ اور یہ لوگ ہندوستان کے تقریباً سب ہی حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے انصاف نہیں ہو رہا ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جنوبی پردیشوں میں لوگ اردو زبان سے زیادہ ہمدردی رکھتے ہیں۔



جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی اردو کو دبائے جانے کے کسی بھی قدم کے خلاف تھے۔

مثال کے طور پر آندھرا پردیش میں تلنگانہ کے ضلعوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہاں اردو کو سرکاری کام کاج کی زبان مانا جاتا ہے۔ کرناٹک اور مدھیہ پردیش دونوں میں ہی کثیر تعداد میں ایسے اسکول ہیں جہاں اردو یا تو پہلی زبان یا دوسری زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے اور مہاراشٹر میں بھی تقریباً ۲۰۰۰ اسکول ایسے ہیں جہاں اردو پڑھانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

اردو بولنے والے زیادہ تر لوگ اس علاقے میں بستے ہیں جسے عام طور پر ہندی علاقہ کہا جاتا ہے۔ صرف اتر پردیش میں ہی اردو ایک کروڑ سے زیادہ لوگوں کی مادری زبان ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں اس زبان کے خلاف سب سے زیادہ جذبات ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں ایک وفد نے اتر پردیش کے وزیر تعلیم کو لکھنؤ کے ۱۰ ہزار لوگوں کی جانب سے ایک



ڈاکٹر ذاکر حسین اُردو تحریک سے صدارت کی کُرسی تک

میمورنڈم دیا تھا۔ اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان کے بچوں کو شہر کے اسکولوں میں اردو زبان کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔ اس وفد کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے جو کہ بعد میں ۱۹۶۷ء میں ہندوستان کے صدر بھی بنے تھے۔

پھر بھی تمام اتر پردیش میں ایک بھی اسکول ایسا نہیں ہے جہاں میٹرک تک یا ہائر سیکنڈری تک دوسری زبان کے طور پر اردو پڑھائی جاتی ہو۔ اور سن ۱۹۶۰ء کے دہائی...... کے آغاز میں مرکزی سرکار نے اتر پردیش سرکار کو احکام دیئے تھے کہ پرائمری اسکولوں میں سات ہزار اردو اساتذہ رکھے.. جائیں۔ مرکز نے یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ وہ ایک سال تک ان اساتذہ کی تنخواہوں کا خرچ اٹھائے گا۔ پردیش سرکار نے اردو ٹیچروں کی تقرری کر دی تھی۔ لیکن پڑھائی کے گھنٹوں کے پروگرام میں اردو کی پڑھائی کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ اور اردو پڑھنے کے خواہشمند طالبعلموں سے کہا گیا تھا کہ وہ اسکول کے گھنٹوں کے بعد اردو پڑھنے کے لئے پر وقت تک رکے رہیں۔

مرکز کی ذمہ داری یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مرکزی سرکار کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ بھی غلط ہے کہ ہندی علاقے کے پردیشوں کو اردو کے سوال پر سمجھایا نہیں جا سکتا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ صدر ہندوستان اگر اس معاملے میں مطمئن ہو جائیں کہ کسی صوبے میں کسی زبان کے بولنے والوں کی تعداد کافی زیادہ ہے تو وہ آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت کسی بھی پردیش کی سرکار کو یہ احکام دے سکتے ہیں۔ کہ وہ اس زبان کو دوسری زبان کا درجہ دیا جائے۔ دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

وہ یہ ہے کہ ہندی علاقے کے سبھی پردیشوں میں اس وقت کانگریس پارٹی کی سرکاریں برسر اقتدار ہیں۔ اور مرکز میں بھی کانگریس کا اقتدار ہے اس لئے اگر مرکزی سرکار اردو کے معاملے میں پارٹی کے وعدوں کو عمل کرنے کے لئے کوئی پختہ فیصلہ کرے۔ تو پردیش سرکاروں کو پارٹی ہائی کمان کا فیصلہ ماننا ہوگا۔

مثال کے طور پر بہار کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر جگناتھ مشرا نے سن ۱۹۸۰ء میں اردو کے بارے میں پارٹی کے انتخابی... وعدوں کو پورا کرنے کے لئے ٹھوس قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا اس نہا پر سن ۱۹۵۰ء کے سرکاری زبان قانون میں ترمیم کی گئی۔ تاکہ بہار کے چھ ضلعوں میں اردو کو سرکاری کام کاج کی دوسری زبان بنایا جائے۔ ایسا ہوتے ہی اس قدم کی مخالفت کرنے کے لئے وہاں ایک تنظیم بنائی گئی۔ ۱۸ دسمبر کو تمام پردیش میں بند کا انعقاد کیا گیا۔ رانچی، جمشید پور، اور بہار کے دوسرے شہروں میں فساد ہوئے۔ اس تحریک کے باوجود وزیر اعلیٰ اپنے فیصلے پر جمے رہے اور

اسمبلی نے قانون میں ترمیم کو منظور کر لیا۔ بعد میں جو کچھ کیا گیا عملی طور پر اس کا فائدہ وہاں کے اردو بولنے والے لوگوں کو شاید بہت کم ملے۔ لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کانگریس سرکار اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے تو اردو کی مخالفت کرنے والوں سے نپٹنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کی حمایت کرنے والے لوگ اس زبان کو سرکاری درجہ دلانے پر زیادہ زور دے رہے ہیں؟ ایسی نکتہ چینی کرتے وقت یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اگر کسی زبان کو پھلنا پھولنا ہے تو یہ ضروری ہے کہ اس کی تعلیم کا تعلق روزگار کے ذرائع سے ہونا چاہیئے۔ سرکاری درجہ ملنے پر بہت سے لوگ چاہیں گے کہ اس زبان کو پڑھیں تاکہ روزگار مل سکے۔

گجرال کمیٹی

۱۹۷۲ء میں جب اردو والوں کی جانب سے بہت زیادہ دباؤ پڑا تو سرکار نے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کے صدر اندر کمار گجرال تھے۔ جو اس وقت اطلاعات و نشریات کے وزیر تھے۔ اس مسئلے پر غور کرنے اور حقائق جاننے کے لئے اس کمیٹی کے ممبروں نے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ کمیٹی نے ... رپورٹ دی لیکن یہ رپورٹ ۱۹۷۹ء تک شائع نہیں کی گئی اور جب شائع کی گئی تو مرکزی کانگریس سرکار نہیں تھی۔

رپورٹ میں اردو کے فروغ کے لئے کئی سفارشیں کی گئی تھیں۔ لیکن اس میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ اردو کو سرکاری درجہ دیا جائے گا۔

اس کے بعد سرکار نے اس ضمن میں کچھ قدم اٹھانے شروع کئے۔ اردو کو بڑھاوا دینے کے لئے ایک بورڈ بنایا گیا اسے مرکزی تعاون حاصل تھا۔ اور پردیشوں میں اردو اکیڈمیاں بنائی گئیں۔ اس وقت ایسی ۹ اکیڈمیاں کام کر رہی ہیں۔

ان کے اہم مقصد اردو بولنے والے اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی کچھ ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ یہ تنظیمیں اردو مصنفین اور ادیبوں کو انعامات بانٹتی ہیں۔ ان کی اپنی کتابیں چھپانے میں مدد دیتی ہیں۔ اور جب کوئی شکایت ملتی ہے تو حکام کا دھیان اس طرف راغب کرواتی ہیں۔

ان میں سے کچھ اکیڈمیاں مشاعروں کا انعقاد کرتی ہیں۔ اور ان میں سے ایک اکیڈمی کے تحت اردو کتابت کا تربیتی مرکز بھی قائم ہے۔ یہ سبھی کام اچھے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب کسی زبان کے پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ نہ ہو تو اس میں کتابیں شائع کرنے کا کیا فائدہ ہوگا۔ اردو بولنے والے لوگوں کی نئی نسل کے بچے اپنی مادری زبان کو کیونکہ پڑھ نہیں سکتے اس لئے اردو کتابوں کی فروخت بہت کم ہوتی جا رہی ہے۔

کئی دہائیوں تک ہند پاک برصغیر میں بول چال کی زبان اُردو رہی ہے

کئی دہائیوں تک ہند پاک برصغیر میں بول چال کی زبان اردو رہی ہے۔ اور اب بھی اردو کی شاعری اس برصغیر پر اظہار خیال کی بہترین زبان سمجھی جاتی ہے۔ کثیر تعداد میں لوگ اردو زبان پسند کرتے ہیں ہندوستان ..... کے سبھی حصوں میں لڑکے اور لڑکیاں اردو زبان سیکھنا چاہتے ہیں اس سے ہندی کے کٹر حامیوں کو خوف پیدا ہو گیا ہے۔

دوسری طرف رہے غیر مسلموں کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ جو اردو لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ ۴۰ سال سے کم عمر کا شاید ہی کوئی غیر مسلم اردو ادیب اور مصنف اس وقت موجود ہو۔ ان حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کے فروغ کی تحریک کو ملک کی فرقہ وارانہ سیاست سے اوپر رکھا جانا چاہیئے۔

اتر پردیش اور دوسرے ہندی پردیشوں پر سرکار چاہے جو کچھ بھی کرے لیکن اردو کے معاملے میں کامیابی تبھی مل سکتی ہے۔ جب اردو زبان کے خلاف تعصب اور شکوک و شبہات کے جذبات کو ختم کیا جائے۔ ●

غزل

جگر مرادآبادی

توہینِ عشق دیکھ! نہ ہو اے جگر! نہ ہو
ہو جائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

ممکن نہیں کہ جذبۂ دل کارگر نہ ہو
یہ اور بات ہے تمہیں اب تک خبر نہ ہو

جس دل میں ہے لگی ہوئی اس ہر طرف سے آگ
ظالم یہ دیکھ لے کہیں تیرا ہی گھر نہ ہو

لازم خودی کا ہوش بھی ہے بیخودی کیساتھ
کس کی اُسے خبر، جسے اپنی خبر نہ ہو

دریائے حسن و کارِ غمِ عشق، ناصحا
یہ کیا کہا؟ ترا سیہ دامن بھی تر نہ ہو

پیشِ نگاہِ شوق ہے اک حسنِ بے پناہ
ڈرتا ہوں میں کہ یہ بھی فریبِ نظر نہ ہو

وہ بدگمانیاں ہیں نہ وہ سرگرانیاں
اتنی بھی دل کی دل کو الٰہی خبر نہ ہو

یا طالبِ دعا تھا میں ایک ایک سے جگر
یا خود یہ چاہتا ہوں دعا میں اثر نہ ہو

اُردو زندہ رہے گی



• محترمہ صالحہ عابد حسین

مسٹر واسدیو سنگھ جن کا خدا کے فضل سے گذشتہ مہینوں اردو پریس میں بہت چرچا رہا۔ اُردو والوں کے لئے ایک عام اور غیر معروف سی شخصیت تھے اور یہ اُردو والوں کی بدقسمتی تھی یا بےوقوفی کہ انھوں نے اتنی بڑی اور اہم شخصیت کو نظر انداز کر رکھا تھا اور دوسرے لوگوں سے اُردو کو اس کا حق دلانے اور اُسے اترپردیش کی دوسری یا دوسری سرکاری زبان بنانے کے لئے زور دے رہے تھے۔ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ کانگرس کے "منشور" میں نئے انتخابات کے وقت یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ بہار حکومت کے انداز پر اُردو کو یوپی میں وہی درجہ دیا جائے گا جو وہاں دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ! اور وہ یہ بھول گئے۔ (یا شاید واقف ہی نہ تھے) کہ پروفیسر واسدیو سنگھ بھی یوپی کابینہ کے ایک اہم رکن ہیں اور انھیں بھی بہت کچھ کہنے سننے کی آزادی حاصل ہے۔

گزشتہ مہینوں میں جو کچھ ہوا۔ جو انھوں نے کہا اس پر جو احتجاج ہوا، جو تحریکیں چلیں ان کا ذکر اب کرنا کیا کہ جو ہو چکا غیرت داروں کے لئے وہی کافی ہے

زیادہ تھا۔" اردو والوں کا منھ کالا کرنے والوں کو شاید طنز یہ کہاوت معلوم نہ ہو کہ منھ کالا ہونے سے کیا ہوتا ہے دل کالا نہ ہونا چاہیئے۔ خدا کا شکر ہے کہ اُردو والوں کے دل آئینہ کی طرح شفاف ہیں اور وہی کہتے اور کرتے ہیں جس کو صحیح سمجھتے ہیں اُردو ان کی مادری زبان ہے اور اپنی ماں کی عزت کرنا اور اس کے حقوق اُسے دینا ہر اچھے، سچے ایمان دار آدمی کا ایمان ہوا کرتا ہے۔

ہاں تو "پروفیسر صاحب" کے ارشادات ذرا ڈھیلے پڑ گئے تھے اور اُردو اکیڈمی اتر پردیش کے کارکنوں سے یہ کہا جا رہا تھا کہ موصوف نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور وہ سب اپنے استعفے واپس لے لیں اور اُردو کی "نیم سرکاری گُڑ کان" چلاتے اور خود کو دھوکا دیتے رہیں کہ ہمیں تو بہت کچھ مل رہا ہے اور ملے گا۔ لاکھوں روپیہ تو گورنمنٹ اُردو کی ترقی کے لئے دے رہی ہے اور کیا چاہتے ہو؟ لہٰذا آؤ اپنا مقررہ جانا بوجھا کام کرو اور چین کی نیند سو جاؤ۔

شاید کچھ اُردو والوں کو دھوکا ہو جاتا، شاید ان کے قدم کچھ بہک جاتے کہ واسدیو سنگھ جی کے ضمیر نے انھیں آواز دی اور انھوں نے اپنی رائے کو اور زیادہ صاف کر دیا اور ریاستی وہل نمائندہ قومی آواز لکھنؤ کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے جو باتیں فرمائیں بعض سوالات کے جواب میں وضاحت فرما دی کہ "اس سلسلے میں وزیر اعلیٰ مسٹر نرائن دت تیواری نے نہ ان سے کچھ پوچھا اور نہ انھوں نے اس سلسلے میں کوئی خط لکھا ہے" تیواری جی کی پوزیشن اور رائے اور ہمدردی کی وضاحت کس خوبی سے ہو گئی اور بغیر ایک لفظ کہے یا قلم اُٹھائے انھوں نے اُردو والوں کو بتا دیا کہ ان کی ہمدردیاں کس حد تک اُردو کے ساتھ ہیں اور کس حد تک وہ پروفیسر صاحب کے ہمنوا ہیں۔

موصوف نے یہ بھی فرمایا (دیکھیے قومی آواز لکھنؤ ۳؍ اگست ۸۵ء کا پرچہ) میں لوگوں کو ناراض کر سکتا ہوں (اسی ناراضگی کی وجہ سے ان کی کیسی شہرت ہوئی اور کتنا نام اُچھلا یہ کس سے چھُپا ہے۔ شاعر بیچارے نے تو بہت پہلے کہا تھا ؎

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

لیکن گمراہ نہیں کر سکتا (خدا کا شکر ہے اُردو کو ایک رہنما تو ملا) مجھ سے یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ میں نے اُردو کا حق طلب کرنے والوں کو ملک بدر کر دیا جائے بالکل گمراہ کن بات ہے یہ ضرور درست ہے کہ میں نے ہندی کو واحد زبان کی حیثیت سے ملک کی قومی زبان کے روپ میں قائم رکھنے کی بھرپور وکالت کی اور اب بھی کرتا ہوں اور اسی حیثیت سے کرتا ہوں (حیثیت کی اہمیت پر اب تک اردو والوں کو غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی) میں کل ہند پرایگ ہندی ساہتیہ سمیلن اور دہلی پردیش ہندی سمیلن کا ایک اعلیٰ عہدہ دار یعنی صدر ہوں۔ ان باتوں کے لئے یہ کہنا درست نہیں کہ میں نے جو کچھ کہا وہ ایک وزیر کے رُتبے پر ہوتے ہوئے کہا اور اس میں یہ بھی کہنا درست نہیں ہے کہ میں نے ایک کانگریسی ہوتے ہوئے ڈسپلن شکنی کی ہے۔

بغیر کسی اشارے کے آپ ان کے بیان کے اسی ٹکڑے کو پڑھیں اور غور کریں تو کیا کیا انکشافات نہ ہوں گے چشم بصیرت اور عقل رسا چاہیئے۔

آگے چل کر انھوں نے یہ بھی کہا کہ کانگریس پارٹی کے مینی فیسٹو میں اردو کے ضمن میں "دوسری بھاشا" کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن دوسری سرکاری زبان کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ اب ہم بیا اردو والوں کو نادانی



سر سید احمد خاں اور اکبر الہ آبادی --- اسد کاظمی

یا سادگی یا حماقت ہے یا نہیں کہ وہ رموز مملکت خویش نہ سمجھ پائی اور دوسری بھاشا کا مطلب دوسری سرکاری زبان لے لیا۔ اتنی سی بات تو ہم نہیں جانتے۔ پختہ سیاست داں جو بات کہتے ہیں وہ بڑی گہری اور تہہ دار ہوتی ہے اور اس کے بہت سے معنی نکالے جا سکتے ہیں۔

انھوں نے انٹرویو میں یہ بھی کہا کہ آئین ہند میں ہندی کے علاوہ جن زبانوں کی ترقی کی بات کہی گئی ہے ان میں اُردو شامل ہے (شکر ہے یہ انھیں معلوم ہے) اور میرا نظریہ یہ ہے کہ پچھلے (۳۸) برسوں میں اُردو کی جتنی ترقی ہونی چاہیے تھی اس سے کم ہوئی ہے اسی لئے یہ وقت ہے کہ ملک کی ایک اچھی اور شیریں زبان ہونے کے سبب سے تمام ریاستی سرکاریں اس کی ترقی کے لئے فنڈ دیں چنانچہ اردو کی ترقی کے لئے ریاستی حکومت یہی سب کچھ کر رہی ہے۔

جادو جو سر پر چڑھ کر کبھی کبھی بے اختیار بول جاتا ہے۔ اُردو کے لئے اچھی اور شیریں زبان جانے کس طرح ان کے منھ سے نکل گیا۔ رہی خیرات یا منھ بھرائی دینے کی بات تو وہ یہ بھی فرما گئے کہ ہماری ریاست کی طرح دوسری ریاستوں کو بھی اس کی ترقی کے لئے کچھ لقمے ضرور ڈالنے چاہئیں۔

آگے چل کر انھوں نے دل کی بات کہہ دی جو اوپر والے جملے کے بغیر کہی جاتی تو ہندی والے اس سے شاید زیادہ متاثر ہوتے (اُردو والے تو ایسے کم فہم ہیں کہ اس کے باوجود بھی وہ نہ مانیں گے) پروفیسر موصوف



منشی پریم چند

نے اپنے نزدیک بہت بڑی بات کہی کہ "مذہب اور زبان (اُردو) کے نام پر ملک کا بٹوارہ ہُوا ہے اور میرا یقین ہے (اسی یقین کی داد دیجیے) کہ آج کے دور کے اردو دوست ملک دوست اور قوم پرست ہیں (تب ہی ان کا مُنھ کالا کر کے کان پکڑ کر نکال دینا چاہیئے) لیکن اس امکان کو خارج از بحث نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اگلے (۱۵) یا (۲۰) برس بعد اسی زبان کے نام پر (اگر اسے سرکاری زبان کا درجہ دیدیا جائے) لوگ اتر پردیش جیسی بڑی ریاست کی لسانی تقسیم کا مطالبہ کرنے لگیں گے۔

اتنی دور کی کوڑی پروفیسر جیسے عالی دماغ کے سوا کون لا سکتا تھا۔ ۱۵ یا ۲۰ برس بعد ہی اُردو زبان کی بنا پر اُتر پردیش کی تقسیم!!!

ان کا یہ نظریہ بھی قابل غور ہے کہ "ہندی مسلمانوں کی زبان" اب لاکھ مسلمان یہ کہتے رہیں کہ بھئی ہماری زبان اُردو ہے۔ لاکھ ہندو سر پٹختے رہیں کہ اُردو ہماری زبان ہے ہم اس میں لکھتے ہیں۔ پڑھتے ہیں اس کو سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ سات سو سالہ اُردو کی تاریخ میں ہمارے ہزاروں نام ہیں۔ مسلمان جھک مارتے رہیں کہ حضور ہم خود عرض کر رہے ہیں کہ اُردو ہماری مادری زبان ہے مگر کیا مجال کہ حاکم پروہ اسے بدل نہیں سکتے۔ ابھی ہم اس انٹرویو کے زریں ارشادات سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ لکھنؤ کے قومی آواز کے اگلے نمبر پر جس میں واسد یو سنگھ جی کا ایک اور بیان جو منشی پریم چند کی جینتی کی تقریب میں خراج عقیدت کے ضمن میں دیا تھا نظر پڑ گئی۔ سرخی ہے "اردو کو ہندوستان پر تھوپا نہیں جا سکتا" اور اسی سُرخی کے ماتحت ان کے بیان کے اقتباسات دیئے گئے ہیں جن میں ایک تو منشی پریم چند کو ہندی کا عظیم ادیب بتایا گیا ہے اور قلم کے اس سپاہی کی خدمات کو سراہا گیا ہے جو انھوں نے آزادی کے لئے کی تھیں۔ بھلا اُردو خود ہی عظیم نہیں تو اس کا ادیب کیسے عظیم ہو سکتا ہے۔ اب اگر ہندی پوری طرح پریم چند کو نہ اپنا لے تو کیسے ان کو یہ عظمت مل سکتی تھی۔

انھوں نے یہ بھی گل افشانی کی کہ انتخابی منشور 'دیدہ' نہیں ہیں نہ عوام اس کو پڑھتے ہیں نہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس صاف گوئی اور حق گوئی کا کوئی کیا جواب دے سوائے اس کے کہ چہ دلاور است دزدے بکف چراغ دارد۔ خیر اس صاف گوئی کا یہ فائدہ تو ہوا کہ عوام جو اب تک تھوڑی سی غلط فہمی میں تھے وہ بھی اب دُور ہونی چاہیئے۔

اسی جلسے میں پروفیسر صاحب نے بہت سی نئی باتیں کہیں جو ایک قابل محقق پروفیسر ہی فرما

سکتا ہے۔ اُردو مسلمانوں کی زبان نہیں (خود موصوف کا پچھلے دنوں بیان تھا اس کی تردید) یہ برٹش سامراج کی دین ہے۔ انگریزوں ہی نے ہندوستانیوں پر اردو تھوپی ہے۔ (برٹش سامراج اور تو بہت کچھ ہمارا لے گئی تھی۔ ایک یہ دے کر اُردو ہمارا سرمایہ بچا تھا وہ پہلے تو ہندوؤں سے چھین کر یعنی اُردو کے پریمی ہندوؤں سے۔ مسلمانوں کو بخشی گئی اور اب برٹش سامراج کو عنایت کر دی گئی۔ جنھوں نے اسے ہندوستانیوں کے سر تھوپ دیا تھا (واہ کیا زبان ہے) انھوں نے حکومت کو بھی چیتاؤنی دی کہ اگر اس نے اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے کر ہندی پر تھوپنے کی غلطی کی تو یہ بات ناقابل برداشت ہوگی۔ یہ بات موصوف نے صاف نہیں کی کہ اس ناقابل برداشت بات کو ختم کرنے کے لئے وزارت سے استعفےٰ دیں گے یا کوئی تحریک چلائیں گے یا بغاوت کریں گے۔

یہاں تک تو ان کے زریں خیالات تھے۔ اب آگے انھوں نے صاف صاف دھمکی دی کہ حامیانِ اُردو ملک میں لسانی بنیاد پر بدنظمی پھیلانا چاہتے ہیں۔ اُردو والے لاکھ کہتے رہیں کہ ہم اپنا مقصد پُرامن تحریک اور اپنے حقوق کو آئین کے رُو سے منوانے کی پُرامن جدوجہد کرنا چاہتے ہیں۔ مگر واسدیو جی کو اس میں بدنظمی چھپی نظر آرہی ہے یہی نہیں ان کا دل دہلا جا رہا ہے کہ ملک ایک بار تقسیم ہو چکا ہے اور اب زبان کی بنیاد پر مزید تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ موصوف یہ بھول گئے کہ ہندوستان کی چودہ یا سولہ قومی زبانیں ہیں (جن کو آئین ہند تسلیم کرتا ہے) اور ان میں سے سات والے اپنی زبانوں کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ہندی سیکھنا یا رائج کرنا تو بڑی بات ہے اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے اور اگر زبان کی بنا پر تقسیم (خدانخواستہ) ہوئی تو پہلے سات تو اور نا تو کی ہوگی۔ موصوف کو شاید یہ خیال بھی نہ رہا کہ پنجابی صوبے کو الگ کرنے کا فتنہ جو اٹھا تھا (جس کے معنے تقسیم کے سوا اور کیا تھے) اس کی تہہ میں بھی پنجابی زبان موجود تھی۔ شاید ہریانہ اور پنجاب کی تقسیم کو بھی بھول گئے جس میں ایک بڑا حصہ ہندی بولنے والے اور پنجابی بولنے والے کا بھی تھا۔ اُردو نے تو آج تک تقسیم کی بات منہ سے نہیں نکالی۔ سوچی بھی نہیں۔ سوچ بھی نہیں سکتی کہ اُردو کسی ایک صوبے کی (خواہ اُترپردیش کا صوبہ ہی کیوں نہ ہو جس میں بہت زیادہ اُردو والے موجود ہیں) زبان نہیں۔ وہ دِلّی کی بھی زبان ہے، دہار کی بھی زبان ہے، بنگال کی بھی زبان ہے، کشمیر کی بھی زبان ہے، مہاراشٹر کی بھی زبان ہے۔ جس میں اُردو بولنے، سمجھنے، لکھنے اور پڑھنے اس سے محبت کرنے اور اُسے اپنی مادری زبان کہنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے اور افسوس صد افسوس واسدیو جی کی قسمت پر کہ ہر جگہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں، اس میں ہندو اور دوسرے مذہب کے لوگ بھی اسی طرح شامل ہیں جیسے کھچڑی میں دال چاول۔ اور آپ کوشش کر کے بھی ان کو الگ نہیں کر سکتے۔ تو عرض یہ کرنا تھا کہ اگر بدقسمتی سے اُردو ایک صوبے کی زبان ہوتی تو ملک تو تقسیم نہ ہوتا مگر اُسے اس کے جائز حقوق ملنے میں ضرور آسانی ہو جاتی، مگر آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ سب کی زبان ہے اور اس کی بنا پر ملک تقسیم ہوتا تو ہر ہر صوبہ ہر ہر شہر، یا شاید ہر ہر محلہ انھیں تقسیم کرنا پڑتا۔ اور اگر آزادی کی تاریخ یا موٹے موٹے واقعات ہی سے واقفیت ہو تو انھیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگے گی کہ اُردو نے ملک تقسیم نہیں کرایا نہ اس کے پریمیوں نے اس کو تقسیم کرایا ہے اور یہ بھی شاید پروفیسر صاحب کے علم میں نہ ہو کہ پاکستان میں



راجیو گاندھی — اور اردو

کسی علاقے کی اپنی زبان اردو نہیں ہے۔ بلوچستانی ہے، سندھی ہے، پنجابی ہے، پشتو ہے مادری زبان وہاں اردو صرف ان لوگوں کی زبان ہے جو آپ کے صوبے اتر پردیش اور دیگر ہندوستان کے اردو والے علاقوں سے گئے ہیں۔ البتہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے پاکستان کے مقامی لوگ جو کروڑوں میں ناراض ہیں۔ اور اپنے اپنے علاقوں میں اپنی زبان رائج کر رہے ہیں۔

اتنا ہی نہیں انھیں ہند کی تقسیم کے ساتھ مسلمانوں کی اگلی نسل کی وفاداریوں پر بھی شک پیدا ہو گیا۔ وہ نسل جس کو جبراً اپنی مادری زبان سے بیگانہ کیا جا رہا ہے اگر کہیں اردو سیکھ گئی تو۔ تو ظاہر ہے غدار ہوگی۔ اور ایک اور تقسیم ہو جائے گی۔ بھلا اردو والا اور ... وفاداری؟؟

پروفیسر واسدیو بہت دن سے یہ اور اس قسم کی باتیں ارشاد کر رہے ہیں اور لوگ احتجاج کر رہے ہیں۔ خفا ہو رہے ہیں۔ صفائیاں دے رہے ہیں۔ یوپی کے وزیر اعلیٰ سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ راجیو جی سے کہہ رہے ہیں کہ آپ دخل دیجئے۔ مگر اس کا نتیجہ؟ وزارت اعلیٰ یوپی خاموش ہے یا چپکے سے کچھ کہہ دیتی ہے جس کے آپ جو چاہے معنی نکال لیں۔

واسدیو جی نئی نئی گل افشانیاں کر رہے ہیں اور کوئی باز پرس نہیں۔ الٹا یہ سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ یعنی وہ خود اپنی رائے اور اپنے "زریں خیالات" اور اردو کے خلاف زہر فشانی کو دہرا رہے ہیں اور دوسرے کہہ رہے ہیں کہ نہیں وہ بیچارے تو بولے بھی نہیں۔ یا ان کا وہ مطلب نہ تھا جو کہا تھا۔

واسدیو جی کو کوئی یہ بتانے کی زحمت کرے گا کہ۔ "انگریزوں نے ہندوستان پر اردو نہیں تھوپی" تھی۔ یہ زبان ہندو مسلمان اور دیگر اقوام کے میل جول کا ایک ایسا بے بہا تحفہ ہے جو قدرت نے خود بخود ان کی جھولی میں ڈالا یہ ان کے اتحاد، اتفاق میل جول کی پیدا کی ہوئی ہے یہ ماؤں کی لوریوں میں پلی بڑھی ہے، یہ پنگھٹ کے گیتوں میں جوان ہوئی ہے۔ جھولوں کی تانوں میں اس نے انگڑائی لی ہے کاروبار کی ضرورتوں میں کام آئی ہے ایک دوسرے کی بات سمجھنے میں، ایک دوسرے کو سمجھنے میں، ایک دوسرے کو آپس میں ملانے میں اس نے وہ کام کیا ہے جو ہندوستان کی کسی زبان نے نہیں کیا۔ شاید ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا جنم داتا خسرو تھا جس کو سات سو برس ہوئے ہیں اور یہ وہ وقت تھا جب انگریز کا نام و نشان بھی کہیں نہیں تھا۔ یہ بولی ٹھولی کی زبان ہے یہ چھیڑ چھاڑ کی زبان ہے۔ یہ دل کے تاروں کو چھونے والے شعر اور زندگی کی عکاسی کرنے والے ادب اور افسانے کی زبان ہے! اس نے بازاروں، گلیوں محلوں



معرکۂ شرر و چکبست

اور عام لوگوں میں پرورش پائی - اور یوں پلی اور نکھری کی محلوں تک اس کی دھوم پہونچی اور اس کی رسائی وہاں تک ہوئی تو اسے نوک و پلک سے درست کیا گیا آرائش اور زیبائش سے آراستہ کیا اور پھر اس کے پریمیوں نے خاص طور اس کے عقیدت مندوں نے اسے اپنے فن میں یوں ڈھالا کہ پھر خواص و عوام سب ہی کی محبوب بن گئی وہ کبھی ولی اور مظہر جانِ جاناں کی میٹھی مدھر بولیوں میں گیت اور شعر بنی۔ کبھی میر امن کی گنگا جمنا سے زیادہ شفاف رواں سلیس جملوں میں چہکی، نول کشور کی چہیتی بن کر سینکڑوں کتابوں میں ڈھلی۔ میر کے درد و سوز میں پروان چڑھی۔ درد کے شعروں میں اپنے معبود سے باتیں کیں، غالب کے انداز میں نرالی شان دکھائی، فراق کے بولوں میں مٹھاس اور حسن اور دلربائی کے انداز میں چہکی۔ چکبست کے منہ سے وطنی ترانے گائے۔ رتن ناتھ سرشار کے قلم سے فسانۂ آزاد جیسا شاہکار بن کر سامنے آئی۔ انگریز نے اسے سانوارا یا تھا نہ اس کا دلدادہ تھا۔ ایک دو کو چھوڑ کر کبھی کسی انگریز نے اُردو (یا ہندی) سیکھی؟ سوائے بیروں اور خانساماؤں سے زبان کو بگاڑ کر مسخ کر کے بات کرنے کے کسی سے اُردو میں بات کی؟ بلا اُردو کو سرکاری درباری زبان کا درجہ دیا؟ آدمی بات وہ کہے جس میں کچھ تو سچائی ہو!

ملک کی تقسیم کیوں ہوئی، کب ہوئی کس نے کی اور اس کے پیچھے کیا کیا عناصر تھے اس گڑے مردے کو اکھاڑا نہ جائے تو اچھا ہے، لیکن ملک کی تقسیم کے بعد ان کروڑوں لوگوں کو آپ بھول نہ جائیں جو اسی ہندوستان میں اُردو بولتے رہے اس پر جان دیتے رہے اور اس



مولانا آزاد اور مولانا ماجد ـــ علمی زور آزمائی

کے حق کے لئے جدوجہد کرتے اور لڑتے رہے اور اب بھی لڑیں گے۔ ہاں ان کی لڑائی انشاءاللہ گاندھی جی کی اہنسائی لڑائی ہوگی۔ گاندھی جی جو اُردو کی شیرینی اور حسن کے قائل تھے۔ پنڈت نہرو جو یہ تک کہہ گئے تھے۔ کہ میری (مادری) زبان اُردو ہے۔ اندرا جی جو اُردو کی دلدادہ تھیں معترف تھیں اور جنھوں نے اُردو کی حمایت کی اگرچہ افسوس ہے کہ وہ یوپی والوں سے اُردو کو اس کا حق نہ دلا سکیں۔ شاید یہ سوچ کر کہ یہ تو مل ہی جائے گا۔ اُردو کے کس کس پریمی اور خادم اور محسن کو آپ غدار کہیں گے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو؟ حکیم اجمل خاں کو؟ ڈاکٹر انصاری کو؟ ڈاکٹر ذاکر حسین کو؟ پنڈت سندر لال کو؟ گوپی ناتھ امن کو، دتا تریہ کیفی، کہاں تک نام گناؤں گی۔ ذرا اُردو ادب کی تاریخ کو ایک نظر اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ حقیقت آپ پر روشن ہوجائے گی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض لوگ ہندی کے مستقبل سے خوف زدہ کیوں ہیں کہ اُردو کو اس کا حق مل گیا تو اسے نقصان پہونچے گا۔ اول تو اُردو نے کبھی ہندی کی مخالفت نہیں کی سرکاری زبان بننے کے بعد اس کا درجہ بھی اپنے سے اونچا تسلیم کرلیا۔ (اگرچہ وہ بھی قومی زبانوں میں سے ایک ہے اور صرف سرکاری زبان بن کر درجہ اُونچا یا نیچا نہیں ہوسکتا۔) پھر اُردو اور ہندی تو دونوں الگ نہیں ہیں۔ ہزاروں لفظ اُردو میں ہندی کے اور ہزاروں سے زیادہ ہندی میں اُردو کے (میں اس مصنوعی ہندی کا ذکر نہیں کر رہی ہوں جو ہندوستان والوں پر تھوپی جارہی ہے) موجود ہیں ان کا ڈھانچہ ایک

جیسا ان کی تحریر تقریباً ایک ہے وہ ایک دوسرے کی ساتھی ہیں مددگار ہیں ایک کی ترقی اور فروغ سے دوسری کی ترقی اور فروغ تو ہو سکتا ہے وہ ایک دوسرے کو ہٹا نہیں سکتیں۔ نقصان نہیں پہونچا سکتیں۔

بات بہت طویل ہو گئی۔ بعض وقت لوگ ایک دو جملوں میں وہ کہہ جاتے ہیں کہ دل میں طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ گر پروفیسر واسدیو سنگھ کو خوب آتا ہے۔ ہاں ایک بات اور منشی پریم چند۔ آزادی کے پرستار اور اس کے لئے اپنے قلم سے جدوجہد کرنے والے پریم چند۔ اُردو کے مشہور ترین افسانہ نگار۔ جو ہندی میں بھی لکھتے تھے یا ترجمہ کراتے تھے۔ (اگرچہ بہت دن سے یہ بحثیں چل رہی تھیں کہ پریم چند اُردو میں پہلے لکھتے تھے یا ہندی میں) مگر ان کی زبان، ان کا ادب، ان کے جواہر پارے اُردو والوں کا بیش بہا سرمایہ تھا اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ ہندی والے انھیں اپنالیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں، لیکن موصوف تو سرے سے انھیں ہندی کا ادیب مان کر چلے ہیں۔ اس بارے میں ہمیں کچھ نہیں کہنا۔ یہ تو ان کی تحریریں خود ہی بتا دیتی ہیں کہ وہ اصل میں کس زبان کے ادیب تھے۔

اُردو کے سلسلے میں قومی آوازمیں اور بعض دیگر اُردو اخباروں میں متعدد مضامین اور خطوط شائع ہو رہے ہیں کوئی سخت چوٹ ماری جائے اس کی مار اور درد ذرا زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ یہی حال اس وقت ہم اُردو والوں کا ہے مگر اُردو والے ایسی بہت سی چوٹیں کھاتے رہے ہیں اور اپنے زخم چھپاتے رہے اور ان کا درد جھیلتے رہے ہیں لیکن نہ اردو زبان کو چھوڑ سکتے ہیں۔ نہ اس کا حق منوانے سے باز آسکتے ہیں۔ مانتی ہوں، کہ معاشی ضروریات کے تحت یا مجبوری کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے اپنے بچوں کو ہندی اسکولوں میں (اور جو ذرا استطاعت رکھتے ہیں) انھوں نے انگریزی اسکولوں میں



حکیم اجمل خاں



گوپی ناتھ امن

داخل کرایا اور اس کا نتیجہ جو ایسا ہوتا نظر آ رہا ہے کہ نئی نسل اُردو رسم الخط سے ناواقف ہو گئی اور ایک کھچڑی زبان بولنے لگی کہ گھر میں اُردو سنتی اور بولتی ہے۔ اور اسکولوں میں دوسری زبان جو مصنوعی بھی ہے اور ثقیل بھی۔ اور اُردو کو سب سے بڑا خطرہ یہی ہے کہ اس کی جڑ کو اندر اندر کاٹا جا رہا ہے جب اُردو پڑھنے والے ہی نہ رہیں گے۔ تو اُردو خود اپنی موت مر جائے گی۔ یہ سازش بہت گہری ہے اور اسی لئے جب اُردو کو دوسری زبان۔ یا دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے

کی بات آتی ہے تو دور اندیش صاحبان سیاست کھیل جاتے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے اس مطالبے کو ملتوی کرکے دراصل ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مگر میرا ایمان یہ ہے کہ یہ کوششیں بار آور نہ ہوں گی اُردو تو بہر حال رہے گی بلکہ اور پھیلے گی۔ اگر پہلے وہ شمالی ہند کی زبان تھی تو اب سارے ملک میں اس کا چرچا۔ اور بڑھتا جا رہا ہے اور صرف ہندوستان ہی میں نہیں وہ یورپ اور امریکہ اور دیگر ممالک میں بھی فروغ پا رہی ہے۔ ان پریمیوں کے بدولت جو ملک چھوڑ کر تو چلے گئے مگر اپنی پیاری زبان اُردو کو نہ چھوڑ سکے۔ اپنے بچوں کو اُردو پڑھا رہے ہیں۔ (ہندوستان کے اُردو پریمیوں کو اس سے سبق لینا چاہیئے) وہ اُردو کے مشاعرے کراتے ہیں، کانفرنسیں کراتے ہیں، جلسے کرتے ہیں اُردو والوں کو اپنے ہاں بلاتے ہیں۔

اور اُردو کی کتابیں اور رسالے بھی نکالنے لگے ہیں۔ اُردو کے پرائیویٹ مدرسے بھی بعض جگہ چلائے جا رہے ہیں۔

ہم اُردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ ہندوستان میں نہ بھی رہی تو دوسرے ملکوں میں تو اردو رہے گی۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کہ اُردو وہ زبان ہے جسے کوئی مار نہیں سکتا، مر نہیں سکتی، وہ زندہ زبان ہے۔ زندہ لوگوں کی زبان ہے۔ وہ باقی رہے گی ہندوستان میں۔ پھلے پھولے گی اور اپنی افادیت اپنی شیرینی، اپنی خوبصورتی اپنی قومی یکجہتی کے احساس اپنی مشترک تہذیب کی نمائندہ بن کر زندہ رہے گی۔

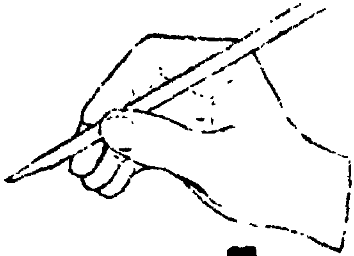
ہاں مگر اس کے لئے سچے دل سے، صحیح طریقہ سے اُردو کو زندہ رکھنے کی کوشش اُردو والوں کو کرنی ہوگی صرف سرکاری زبان بنانے سے کام نہ چلے گا جب تک ہم خود، ہمارے بچے، ہمارے خاندان والے اس بات کی اہمیت نہ سمجھیں گے کہ اُردو کو زندہ ہم رکھیں گے ہمارے بل بوتے ہی پر وہ پل بڑھ سکتی ہے!

ہم جیسے اُردو کے خادم اور ادیب جنھوں نے ساری زندگی اُردو کی خدمت میں بسر کی ہے۔ اپنی موجودہ باشعور قوم سے اور نئی نسل سے یہی تمنا، یہی اُمید یہی خواہش رکھتے ہیں کہ وہ اُردو کی طرف اپنا فرض نبا ہیں۔ مادری زبان سے کٹ کر کوئی قوم اچھا تخلیقی کام نہیں کر سکتی۔ نہ اونچے درجے کا ادیب پیدا کر سکتی ہے نہ دنیا میں سر اُٹھا کر چل سکتی ہے۔

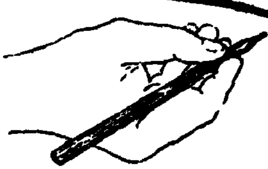
ایسے ایسے جانے کتنے لوگ آئیں گے اور اُردو کے خلاف زہر افشانی کریں گے۔ لیکن اگر ہم ثابت قدم ہیں اور اپنی زبان سے ماں کی سی محبت رکھتے ہیں۔ تو یہ سب اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ جائیں گے اور اُردو زبان باقی رہے گی۔ زندہ رہے گی۔ اور پھلے پھولے گی۔

●●





شاعرانہ اور معاصرانہ چشمکیں



معاصرانہ چشمکوں کی ابتدا کب ہوئی۔ اس کا تجزیہ کرنا آسان نہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یونان اور رُوم کے شعراء نے اس صنفِ ادب کو خوب ترقی دی۔ عربوں کے ہاں بھی عکاظ اور مجنہ کے بازاروں میں اس نے نئے ڈھنگ سے پَر پُرزے نکالے۔ دوسری زبانوں کے علاوہ فارسی اور عربی میں اس کے نمونے کثرت سے دستیاب ہوتے ہیں۔ معاصرانہ چشمکوں میں طنز، طعن و تشنیع، سب و شتم، ہنسی دل لگی، پھبتی، فحاشی، پھکڑ، ہجو وغیرہ سبھی آتے ہیں۔ اس کا پہلا میدان مشاعرہ ہے۔ جہاں مختلف شعراء اپنے اپنے شاگردوں کے ساتھ رونق افروز ہوتے ہیں اور دادِ سخن دیتے ہیں۔ جب کسی شاعر سے چوک ہوگئی۔ کوئی مصرع بے وزن ہوگیا۔ قواعد و زبان کی کوئی غلطی دانستہ یا نادانستہ سرزد ہوگئی یا روزمرہ اور محاورہ ٹکسال سے باہر ہوگیا۔ تو برسرِ مشاعرہ اس کا محاسبہ کیا جاتا۔ دونوں جانب کے اساتذہ اور اُن کے شاگرد اس میں حصہ لیتے اور پختہ دلائل سے اپنے دعوے کو ثابت کرتے، لیکن کبھی کبھی یہی بحثیں جنگ و جدل کی شکل اختیار کر جاتیں مصحفی اور انشا کی شاعرانہ چشمکیں اس کی گواہ ہیں۔ درباری شعراء میں رشک و حسد کا مادہ چونکہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اربابِ اقتدار ایسی جنگوں سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ تذکروں میں بھی اس کے نشان ملتے ہیں۔ تذکرہ نگار عام طور سے اپنے احباب کی تعریف کرتے ہیں اور مخالفین کی تنقیص۔ ان تذکروں میں معمولی شعراء کو بعض اوقات بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور اچھے شعراء کو اس کے صحیح مقام سے روشناس نہیں کرایا جاتا۔ پھر ردِ عمل شروع ہوتا ہے۔ دوسرے سلسلے کے شعراء و اُدباء بھی تذکرے مرتب کرتے ہیں اور گن گن کر بدلہ لیتے ہیں اور فریقِ مخالف کے خلاف جائز اور ناجائز ہر قسم کے معائب تلاش کرکے پیش کرتے ہیں پھر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسی طرح اخبارات و رسائل میں بھی شاعرانہ چشمکوں کی کمی نہیں۔ مولانا ظفر علی خان ہوں کہ مولانا سالک، مولانا کوثر، پنڈت تانک چند ناز ہوں یا میلا رام وفا سبھی اپنے اپنے انداز میں شاعرانہ چشمکوں کے باغ کھلاتے ہیں۔ ان میں پھول بھی ہوتے ہیں اور کانٹے بھی۔ پھولوں کی لطافت اور کانٹوں کی چبھن کہیں لُطف اور کہیں بےلطفی پیدا کرتی ہے۔ کبھی ہجو ملیح اور کبھی ہجو قبیح کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن اہلِ ذوق اس مذاق کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بحث و اختلاف اور جدل و مناظرہ ادبی رسائل میں بھی مدتوں چلتے رہتے ہیں۔ شاعر اور ادیب کا مطالعہ جتنا وسیع ہوگا اور علمی طور پر اُن کی رائے جتنی پختہ و دقیع ہوگی۔ اتنا ہی وہ کامیاب متصور کیا جائے گا۔ اگر مقابلہ دو ہم مقابل ہستیوں میں ہو تو یہ خوب پھلتا پھولتا ہے، ورنہ ایسی چشمکوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ کبھی سچائی کو بھی گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں اس کی مثالیں غالب اور ذوق کے سہرے ہیں۔ بادشاہ چونکہ ذوق کا طرفدار تھا۔ اس لئے غالب کو قطعہ معذرت لکھنا پڑا، حالانکہ اندر کا غالب اُسے تسلیم نہیں کرتا تھا ایسی ہجویں، چشمکوں میں نہیں آتیں۔ جیسے میر نے مذمتِ آئینہ دار اور سودا نے میر ضاحک کے لئے کہی ہیں۔ معاصرانہ چشمک میں ذاتیات، مذہبی تعصب، فواحش طنز و تشنیع وغیرہ کا شائبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ مخالف کے لئے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مذمت کے پہلو تلاش کرنا چشمکوں کے ذیل میں نہیں آتے شاعرانہ چشمک اخلاقی اور علمی حدود میں ہونا چاہیئے۔

عربی فارسی اور اُردو میں معاصرانہ چھیڑ چھاڑ اور شاعرانہ نوک جھونک کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ یہ مثالیں کبھی نکتۂ بدیہہ کی شکل میں جلوہ پیرا ہوتی ہیں۔ نکتہ معنوی اعتبار سے اس دقیق اور باریک بات کو کہتے ہیں جو حسنِ پاکیزہ اور لطیف اظہارِ بیان کے ذیل میں آتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ عباسیوں کے دربار کا ایک خوش فکر شاعر ابونواس تھا۔ اسے بدیہہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ایک دفعہ خلیفہ ہارون رشید کی خدمت میں چند مدحیہ اشعار سُنانے کے لئے حاضر ہوا لیکن خلیفہ ایک سیاہ فام کنیز سے محوِ اختلاط تھا اور متوجہ نہ ہوا۔ ابونواس اس غیر متوقع بےالتفاتی سے آزردہ خاطر ہوا اور چلتے وقت یہ شعر دروازے پر لکھتا گیا ۔۔

لقد ضاع شعری علی بابکم
کما ضاع عقد علی خالصہ

(میرا شعر تیرے دروازے پر اس طرح ضائع ہو گیا۔ جس طرح خالصہ کے گلے میں موتیوں کا ہار۔)

ابونواس کی اس جرأت بے باکانہ نے ارکان دولت کو برافروختہ کر دیا۔ اور خلیفہ کو اس کی اطلاع کر دی۔ خلیفہ کے حکم سے جب ابونواس کی حضور میں طلبی ہوئی تو اس نے فوراً پڑھتے ہوئے شعر کے دونوں مصرعوں سے (ع) کا دائرہ مٹا دیا اور سوراخ ہمزہ پر چھوڑ دیا۔ اب شعر یوں ہو گیا ـــ

لقد ضاءَ شعری علی بابکم
کما ضاءَ عقدٌ علیٰ خالصہٗ

(میرا شعر تیرے دروازے پر اس طرح روشن ہوا جس طرح خالصہ کے گلے میں موتیوں کا ہار زیب دیتا ہے)

ہارون رشید ابونواس کے اس نکتے کی تہ کو فوراً پہونچ گیا جو اس نے (ضاع) کو (ضاء) سے بدلنے میں پیدا کی تھی۔ اس کے صلے میں انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ (مستطرف و نوادر)

اسی قسم کا واقعہ خاقانی کے ساتھ بھی گزرا۔ اس نے خاقان کبیر کی خدمت میں ایک دفعہ یہ شعر پیش کیا ـــ

دشتے دہ کہ در برم گیرد
یا دشاقے کہ در برش گیرم

(ایک قیمتی پشمینہ مجھ کو عنایت فرما جو اپنی گود میں مجھ کو لے لے (یعنی میں جس کو اوڑھوں) یا ایک معشوق خوبرو جس کو میں اپنی گود میں لے لوں)

یہ شعر دیکھ کر خاقان کبیر کے غصے کی انتہا نہ رہی اور خاقانی کو طلب کیا۔ خاقانی اس غصے کی وجہ سمجھ گیا اور حاضر خدمت ہو کر عرض کی کہ حضور یہ ایک مکھی کا قصور ہے کہ جس نے (با) کے ایک نقطے کے ساتھ فضلہ کر کے دوسرا نقطہ بنا دیا اور (یا) کر دیا۔



میر تقی میر ـــ نکات الشعرا پستورا کا اجمن

خاقان نے خاقانی کا یہ عذر قبول کیا اور خوش ہو کر پشمینہ اور معشوق دونوں عنایت کئے۔ (شعر العجم)

شاہجہاں جب سریر آرائے سلطنت ہوئے تو شاہ ایران نے ان کو اعتراضاً لکھا کہ آپ تو ملک ہند کے فرمانروا ہیں۔ ہند کو آپ نے جہاں کس طرح تصور کر لیا۔ اعتراض معقول تھا۔ بادشاہ کو متردد دیکھ کر اعیان سلطنت بھی پریشان ہو گئے۔ ملک الشعراء ابوطالب کلیم نے اس نکتے کو اس طرح حل کر دیا ـــ

ہند و جہاں ز روئے عدد چوں برابر است
بر ما خطاب شاہجہاں زاں مسلم است

حساب ابجد کی رو سے (ہند اور جہاں) ہم عدد ہوتے



مغل شہنشاہ شاہجہاں کا علمی دربار

ہیں۔ دونوں کے عدد (۵۹) ہوتے ہیں۔ شاہجہاں نے اس نکتے کی تعریف کی کلیم کو انعام سے مالامال کر دیا۔

(کلمات الشعراء و حسنِ خیال)

مولانا جامی اور ساغری کی چشمک کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دفعہ مولانا جامی نے ساغری سے ناراض ہو کر یہ قطعہ کہا ؎

ساغری مے گفت دزدانِ معانی بردہ اند
ہر کجا در شعرِ من یک معنیِ خوش دیدہ اند
دیدم اکثر شعرہائش را یکے معنی نداشت
راست می گفت ایں کہ معنی ہائش را دزدیدہ اند

(ساغری کہتا ہے کہ جب کبھی میرے کسی شعر میں لوگ

سخن شیدا کو ہمیشہ زیر کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ شیدا نے ایک مجلس میں یہ شعر پڑھا ؎

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے
حُسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

(تم جانتے ہو کہ شرابِ سُرخ کیا چیز ہے۔ وہ ایک مصفا جوہر ہے۔ حُسن کی پرورش کرنے والی اور عشق کی پیغام رساں)

پھر کیا تھا۔ حاسدوں کو موقع مل گیا علماء نے اس شعر کے ظاہری معنوں پر شیدا کی تکفیر کا فتویٰ دے دیا شاہجہاں نے اُس کو ملک سے نکل جانے کا حکم دیا۔ جس پر شیدا نے بطریق عذر اس معاصرانہ چشمک کا جواب مولانا جامی کے اس شعر سے پیش کیا ؎

از صراحی دو بار قُلقُل مے
پیشِ جامی بہ از چہار قل است

(شعر العجم)

بنائی ہروی نے ایک قصیدہ امیر علی شیر سمرقندی کی تعریف میں کہا تھا۔ جب اس کا صلہ کچھ نہ ملا تو اس قصیدے کو سلطان احمد مرزا کے نام پر کر دیا۔ جو سلطان حسین بایقرا کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ امیر علی شیر کو اس سے بہت رنج ہوا۔ بنائی کو جب اس کی خبر ہوئی یہ قطعہ لکھ کر بھیج دیا ؎

دخترِ اینکہ بکرِ فکرِ من اند
ہر یکے را بشوہرے دادم
آنکہ کابین نداد عنین بود
زو گرفتم بدیگرے دادم

(میری ابکار افکار (کلام) میری لڑکیاں ہیں اور میں نے اُن کو اُن کے شوہروں کو دیا۔ جس نے مہر ادا نہیں کیا وہ نامرد ہے لہٰذا اس سے لے کر میں نے دوسرے کو دے دیا۔

(تاریخ مرأۃ العالم)

محقق بخاری اور رشید وطواط میں معاصرانہ چشمک کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دن سلطان خضر بن ابراہیم سمرقندی



مصحفی و انشا

نے عمق سے پوچھا کہ تمہاری رائے میں رشید کے شعر کیسے ہوسکتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ خوب ہیں لیکن نمکین نہیں (ایسے معنی دیکھیں تو فوراً چھا جاتے ہیں۔ میں نے اس کے اکثر اشعار دیکھے اور بے معنی پائے۔ وہ سچ کہتا ہے کہ اس کے اشعار میں معنی کہاں سے ہوں)۔

جب ساغری نے یہ قطعہ سُنا تو مولانا سے شکایت کی کہ آپ نے مجھے خاص بد نام اور رسوا کر دیا ہے۔ مولانا نے فوراً جواب دیا بھائی! میں نے تو "شاعر" کہا تھا لوگوں نے اس کو تصحیف کر کے (ساغری) بنا دیا۔ (محامد حیدریہ)

مولانا خاکی کا یہ نکتہ آج تک زندہ ہے

شیدا۔ جہانگیر اور شاہجہان کے زمانے کا ایک مشہور شاعر تھا۔ بہت ہی فہمین اور بذلہ گو اور ذی علم۔ تمام شعرا اس کی خردہ گیری، عیب جوئی اور ہجو گوئی سے پناہ مانگتے تھے۔ ایک روز یہ ایک جگہ مشاعرہ ہوتے۔ اتنے میں رشید بھی آ گیا۔ بادشاہ نے عمق کی رائے سے اس کو مطلع کیا اور حکم دیا کہ کوئی شعر اس کے جواب میں موزوں کرے۔ رشید وطواط نے کہا ؎

شعرہائے مرا بہ بے نمکی
عیب کردی روا بود شاید

شعر من ہم چو شکر و شہد است
اندریں ہا نمک نہ خوش آید

گفتہ ات شلغم است و باقلا
نمک اے قلتبان ترا باید (قلتبان دیوث کو کہتے ہیں)

(یعنی میرے اشعار میں جو بے نمکی کا تو نے عیب لگایا ہے وہ تجھ کو نہ چاہیئے۔ میرے شعر تو مثل

شکر و شہد کے شیریں ہیں۔ اُن میں نمک کیونکر اچھا معلوم ہوگا، البتہ تیرے شعر شلغم و باقلا کی طرح پھیکے ہیں۔ لہٰذا اے قلتبان! تجھ کو نمک کی ضرورت ہے) (خزانۂ عامرہ)

ملا شیدا ایک ظریف الطبع اور عیب جو شاعر تھا۔ اظہری نابینا تھا۔ شیدا اکثر اور لوگوں کے اس کے کلام میں بھی عیب نکالا کرتا تھا جس پر وہ سخت پریشان ہوتا۔ اپنا کلام وہ کبھی شیدا کی موجودگی میں نہ پڑھتا۔ اتفاقاً ایک مجمع میں جس میں شیدا بھی تھا۔ لوگوں نے اظہری سے کہا کہ وہ اپنا کچھ کلام سُنائے، اُس نے پوچھا کہ کم بخت شیدا تو یہاں نہیں ہے۔ سب نے کہا نہیں۔ اظہری نے ایک غزل پڑھی جس کا مقطع یہ تھا ؎

خواہ با اظہری و خواہ بیگانہ نشیں
من ہمیں شرم ترا بر تو نگہباں کردم

شیدا فوراً بول اٹھا کیا خوب کہا ہے وہی ہندی مثل ہے۔ زنِ نابینا را خدا نگہبان (اندھے کی جورو کا خدا حافظ) (تاریخ مراۃ العالم)

ابو العلا خاقانی کا اُستاد تھا اور اسی کے ذریعے خاقانی کی سُلطان کے دربار تک رسائی ہوئی تھی، مگر آخر میں شاطرہ چشمک رنگ لائی اور اُستاد و شاگرد میں خوب ہجو بازی ہوا کرتی تھی چنانچہ ایک قطعہ ابو العلا کا خاقانی کی تضحیک میں آج تک مشہور ہے ؎

خاقانیا اگرچہ سخن نیک دانیا
یک نکتہ گویمت بشنو رایگانیا
ہجو کسے مکن کہ ز تو مہ بود بسن
شاید ترا پدر بود و تو ندانیا

(اے خاقانی اگرچہ تیرا کلام اچھا ہوتا ہے مگر تجھ کو نصیحت کرتا ہوں اس کو کان کھول کر سُن وہ یہ ہے کہ اپنے سے عمر میں بڑے کی ہجو مت کر شاید وہ تیرا باپ ہو اور تجھے معلوم نہ ہو۔)

(تاریخ ادب ایران مؤلفہ پروفیسر براؤن۔ جلد دوم)

کمالؔ اصفہانی کو کسی بادشاہ نے ایک بوسیدہ دھرانا خلعت انعام میں دیا۔ اس نے اس پر اسے اور بدزیب بطرلکے کی ہجو میں کمال کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے ؎

مدحے گفتمت کہ چوں زیور
در لمحہ مجلے کنند پدید
خلعتے دادیم چوں عورت
از ہمہ کس بیایدم پوشید

(یعنی میں تو آپ کی تعریف میں ایسے شعر کہتا ہوں کہ مثل زیور کے اس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے، مگر آپ نے مجھ کو ایسا خلعت عنایت کیا ہے کہ مثل شرمگاہ کے اس کو ہر شخص سے چھپانا چاہیئے)

(تذکرہ آتشکدہ)

قطعے میں لفظ عورت سے نکتہ پیدا کیا گیا ہے۔

اسی شاعر نے تقاضائے صلہ کے ضمن ایک قطعہ کہا جو بلیغ نکات سے مملو ہے ؎

سہ شعر رسم بود شاعرانِ طامع را
یکے مدیح دوم قطعۂ تقاضائی
اگر بداد سوم شکر ور نداد ہجا
ازیں سہ من دو بگفتم دگر چہ فرمائی

(یعنی طامع شاعروں کا قاعدہ ہے کہ تین طرح کے اشعار کہتے ہیں۔ ایک قصیدۂ مدح دوسرا صلے کے تقاضے میں قطعہ۔ اگر صلہ ملا تو تیسرا بطورِ شکریہ اور نہ ملا تو ہجو میں۔ ان تین میں سے دو تو میں نے کہے اب تیسرے کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں (یہ قطعہ شعر العجم جلد چہارم میں انوری سے بھی منسوب ہے)۔ (تذکرہ آتشکدہ)

طالبؔ آملی اور شیداؔ میں نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ شیداؔ ذی استعداد شاعر تھا۔ علمِ عروض و بیان میں اس کو کامل دستگاہ تھی۔ اس کی شعری مہارت ضرب المثل تھی۔ وہ ایسے شعراء کو خاطر میں نہیں لاتا تھا جو مقبولِ عام و خاص

تو ہوتے تھے لیکن ان شعر سے بیگانہ محض ہوتے تھے۔ وہ ایسے شعراء کے عیوب و نقائص کو بہت بے باکانہ طریقے سے اختیار کیا کرتا تھا۔ طالب آملی کو اور تو وہ کچھ نہ کہہ سکا لیکن لفظ "طالب" سے اس نے جو نکتہ پیدا کیا۔ اس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی ؎

شب و روز مخدوم ما طالبا
پے جیفہ دنیوی در تگ است
مگر قول پیغمبر آمد بجا
کہ دنیا ست مردار طالب سگ است

(رات دن ہمارے مخدوم طالب مردار دنیا کے پیچھے دوڑ دھوپ کیا کرتے ہیں۔ شاید ان کو یہ حدیث یاد نہیں کہ (الدنیا جیفۃ وطالبہا کلاب) یعنی دنیا ایک مردار اور اس کے طالب کتے ہیں) (نوادر)

شاعر فکر اور جذبہ کا موجد ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی اس گراں قدر طاقت سے شاعرانہ چشمکوں میں خوب کام لیتا ہے اور اپنے فکری تدبر کے وہ نمونے پیش کرتا ہے کہ جن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ طالب آملی اور نور جہاں کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دفعہ جہانگیر طالب آملی سے کسی وجہ سے ناراض ہو گیا اور اس کو نظر بند کر دیا۔ طالب آملی نے وہاں سے ایک شعر نور جہاں بیگم کی خدمت میں بھیجا ؎

ز شرم آب شدم آب را شکستے نیست
بحیرتم کہ مرا آبروئے از چہ شکست

(یعنی میں شرم سے پانی ہو گیا ہوں اور پانی تو ٹوٹ نہیں سکتا۔ مجھ کو تعجب ہے کہ میری آبرو کس طرح ٹوٹی (یعنی جاتی رہی) نور جہاں بیگم نے اس کا کیا بامعنی جواب دیا اور کہا۔) ؎

ز یخ بست و بشکست ،

(انتخاب نادرہ)

مہری شاعرہ نور جہاں بیگم کے مصاحبین میں سے تھی اس کا شوہر خواجہ حکیم بہت بوڑھا تھا۔ ایک دن مہری نور جہاں بیگم کی خدمت میں حاضر تھی کہ اس نے دیکھا کہ خواجہ حکیم دور سے آ رہا ہے بیگم نے حکیم کو از روئے عنایت اشارہ کر کے بلایا۔ وہ تعمیل حکم میں جلدی جلدی قدم مارنے لگا جس سے بیگم کو ہنسی آ گئی اور مہری سے کہا کہ اس پر کوئی شعر موزوں کرو۔ مہری نے اپنے شوہر کو مخاطب کر کے کہا ؎

مرا با تو سر یاری نماندہ
سر مہر و وفاداری نماندہ
ترا از ضعف پیری قوتے نیست
چنانکہ پائے برداری نماندہ

(میں اب تجھ سے بالکل محبت نہیں کرتی اور کوئی محبت و وفاداری مجھ میں اب نہیں رہی۔ کیونکہ ضعف پیری سے تجھ میں قوت باقی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پاؤں اٹھانے کی بھی طاقت نہیں ہے) (مفتاح التواریخ)

بیگم نے یہ قطعہ پسند کیا اور مسکرائی اور مہری کو انعام دیا۔

خیام سے ایک دفعہ مستی کے عالم میں جام شراب ٹوٹ گیا نشے کے عالم میں فوراً ایک رباعی کہی جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے میرے رب! تو نے میرا شراب کا پیالہ توڑ دیا اور عیش کا دروازہ مجھ پر بند کر دیا۔ میری خالص شراب کو خاک پر لنڈھا دیا۔ میرے منہ میں خاک شاید تو بھی مست ہے۔ خیام کی زبان سے جونہی یہ کلمات نکلے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا (اور چند تذکروں میں ہے کہ اس کی گردن ٹیڑھی ہو گئی۔ جب آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو مسکرا کر یہ رباعی کہی ؎

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
آں کس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو

(اے خدا! یہ تو بتا کہ دنیا میں ایسا کون ہے جس نے گناہ کیا ہو۔ جس نے گناہ نہیں کیا وہ کیونکر زندہ رہا۔ میں برا کروں تو اس کا بدلہ برا دے مجھ میں اور تجھ میں فرق ہی کیا ہے) قدرت کاملہ کو اس معذرت پر رحم آیا اور خیام کی گردن

نئی کہی فی الفور جاتی رہی جس کے لئے خیام نے سجدہ شکر ادا کیا۔
۵۴۲ھ میں سلطان سنجر نے خوارزم شاہ کو سزا دینے کے لئے دوسری بار خوارزم پر حملہ کیا تو انوری ہم رکاب تھا سلطان نے جب "قلعۂ ہزار اسپ" کو محاصرہ میں لے لیا، تو انوری نے سلطان سنجر کو مخاطب کر کے یہ رباعی کہی ؎

اے شاہ ہمہ ملک جہاں حسب تراست
وز دولت و اقبال جہاں کسب تراست
امروز بیک حملہ ہزار اسپ بگیر
فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

(اے بادشاہ تمام جہاں تیرے ہی لئے ہے۔ تمام جہاں کی دولت اور اقبال تجھ کو حاصل ہے۔ آج ایک حملے میں قلعۂ ہزار اسپ کو لے لے۔ کل کے دن خوارزم اور لاکھ گھوڑے تیرے ہیں)

اس رُباعی کو سلطان کے حکم سے اتسز کی لشکر گاہ میں ایک تیر کے ذریعہ پہونچا دیا گیا۔ قلعہ والوں نے وہ تیر اتسز کی خدمت میں پیش کیا۔ اتسز نے وہ کاغذ وطواط کو دے جلد جواب لکھنے کا حکم دیا۔ وطواط نے فی البدیہہ رباعی لکھ کر پیش کی ؎

شاہا کہ بجامت مئے صافیست نہ دُرد
اعدائے ترا از غصہ خون باید خورد
گر خصم تو اے شاہ بود رستم گُرد
یک خر ز ہزار اسپ نتواند بُرد

(اے بادشاہ تیرے جام میں شراب صاف ہے تلچھٹ نہیں۔ تیرے دشمنوں کو غم سے خون کے گھونٹ پینا چاہئے
اگر تیرا دشمن رستم پہلوان بھی ہے۔ تو ہزار اسپ سے
اس کو گدھا بھی میسر نہ آئے گا۔

اگرچہ زمانہ ہو گیا لیکن انوری اور رشید کی یہ شاعرانہ چشمک آج بھی اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے۔

(صنادید عجم)

سلطان سنجر کے زمانے میں مہتی ایک آتش نوا شاعرہ تھی۔ ایک روز سلطان کی محفل عیش گرم تھی کہ مہتی کو کسی ضرورت کی وجہ سے باہر جانا پڑا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ برف چاروں طرف جمی ہوئی تھی۔ غریب مہتی جب کانپتی ہوئی واپس ہوئی تو سلطان نے ماجرا دریافت کیا تو اس نے فی البدیہہ کہا ؎

شاہا فلکت اسپ سعادت زیں کرد
در جملہ خسرواں ترا تحسین کرد
تا در حرکت سمند زرّیں نعلت
برگل نہ نہد پائے زمیں سیمیں کرد

(اے بادشاہ آسمان نے تیرے لئے سعادت کا گھوڑا کس کر تیار کیا ہے اور تمام بادشاہوں کے مقابلہ پر تری تحسین کی ہے، تیرا گھوڑا جس کے زرّیں نعل جڑے ہوئے ہیں تاکہ مٹی پر پاؤں نہ رکھے، اس لئے زمین کو سیمیں کر دیا ہے)
برف باری کے مضمون کو مہتی نے جس رنگ میں فوراً

پیش لمحاتِ فکر، عیسیٰ ایک حسین تلاش ہے

(تذکرۃ الخواتین۔ آسی)

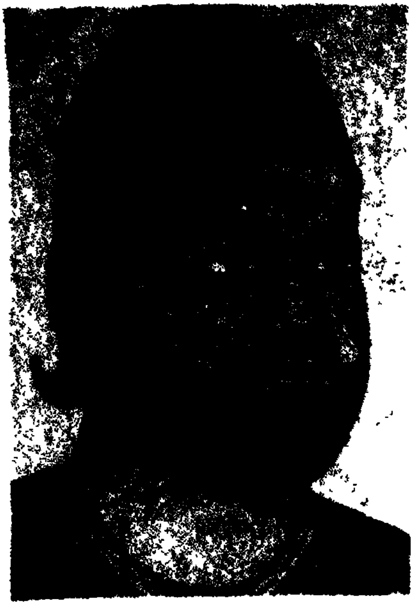
رکن صائن سے ارباب اقتدار کو کچھ کدورت تھی۔ چنانچہ اس کو نیچا دکھانے کے لئے وہ کسی موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ اس سے کوئی ایسی لغزش ہو گئی کہ تیمور خان نے اسے قید کر دیا۔ ایک دن تیمور خان قیدیوں کے ملاحظہ کے لئے قید خانے میں گیا اور رکن صائن کو بیڑیاں پہنے ہوئے دیکھا۔ رکن صائن کی جب تیمور خان سے آنکھیں چار ہوئیں تو فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی ؎

در حضرتِ شاہ چوں قوی شد رایم
گفتم کہ رکاب را ز زر فرمایم
آہن چو شنید ایں سخن از دہنم
در تاب فتاد و حلقہ زد بر پایم

(میں نے دل میں یہ بات ٹھانی کہ بادشاہ کے رکاب کو لوہے کی بجائے سونے کی بناؤں۔ لوہے کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے اس قدر پیچ و تاب کھایا کہ حلقہ بن کر میرے پاؤں میں پڑ گیا)

ایک دن قزل ارسلان نے ظہیر فاریابی سے (جس کی ڈاڑھی سرخ تھی) فرمائش کی کہ کچھ اشعار فی البدیہہ کہو جن میں تمہاری ڈاڑھی کا ذکر ہو اور مقطع میں حسنِ طلب بھی ظہیر نے جواب میں فوراً عرض کیا ؎

واعظے بر فراز منبر گفت
کہ چو پیدا شود دمانے نعت
ریشہائے سیاہ رو ز امید
باشد اندر پناہ ریش سفید
باز ریشِ سفید را ز گناہ
بخشد ایزد بہ ریشہائے سفید
مردکے سرخ ریش حاضر بود
دست در ریش زد چو ایں بشنود
گفت ما خود در ایں شمار نہ ایم



مرزا سلامت علی دبیر

در دو گیتی بہ ہیچ کار نہ ایم
بندۂ آں سرخ ریش مظلوم است
کہ ز انعام شاہ محروم است

(ایک واعظ نے منبر پر کہا کہ جس دن قیامت قائم ہو گی تو بہت سی سیاہ ڈاڑھیاں سفید ڈاڑھیوں کے طفیل میں اور سفید ڈاڑھیاں سیاہ ڈاڑھیوں کے تصدق میں بخشی جائیں گی۔ اتفاق سے ایک سرخ ڈاڑھی والے بھی وعظ میں موجود تھے۔ انھوں نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ ہم لوگ (یعنی سرخ ڈاڑھی والے) اس حساب سے کسی شمار میں نہ ٹھہرے اور دونوں عالم میں گئے گزرے ہیں۔ بندہ وہی بدنصیب سرخ ڈاڑھی والا ہے جو انعام شاہی سے محروم ہے)

(تاریخ مرآۃ العالم)

ایک دن کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور برف باری ہو رہی تھی کہ رشید وطواط ادیب صابر کے ہاں گیا کہ تھوڑا وقت خوش گپیوں میں بسر کیا جائے۔ معلوم ہوا کہ وہ اس وقت گھر میں موجود نہیں۔ رشید ایک ظریف الطبع شاعر تھا، اس نے فوراً ایک شعر کہا اور لوگوں کو سنا کر واپس جانا چاہتا تھا۔

آں کس کہ بروں رود دریں روز
غیر از زن غر بگود گر کیست

(یعنی ایسے دن سوائے ایک فاحشہ اور بدکار عورت کے کون اپنے گھر سے نکلے گا)

ادیب صابر چونکہ گھر میں موجود تھا۔ مکان کی کھڑکی سے سر نکال کر جواب دیا۔

من در حرم سرائے خویشتم
پیداست کہ در بروں در کیست

(میں تو اپنے گھر ہی میں ہوں اور ظاہر ہے کہ دروازے پر کون ہے)۔ (تاریخ مراۃ العالم)

رشید وطواط نحیف جثہ اور پست قامت تھا۔ اسی مناسبت سے لوگ اس کو وطواط کہتے تھے۔ جو ایک بہت چھوٹی چڑیا ہوتی ہے۔ ایک دن یہ محمد خوارزم شاہ کے دربار میں حاضر تھا اتفاق بہت سے عالم و فاضل جمع تھے اور محفل مناظرہ و مباحثہ گرم تھی۔ رشید بہت تیزی اور گرمی سے بحث میں حصہ لے رہا تھا اتفاق سے اس کے آگے دوات رکھی تھی۔ خوارزم شاہ نے مذاق سے کہا کہ دوات ہٹا دو۔ تاکہ تقریر کرنے والے کی صورت تو دکھائی دے۔ رشید نے فوراً جواب دیا: "المرء مرء باصغریہ قلبہ ولسانہ" (آدمی اپنی دو چیزوں سے آدمی ہے، اپنے قلب سے اور اپنی زبان سے) بادشاہ کو اس جواب سے رشید کی عقل و کیاست کا حال معلوم ہوا اور اس کو اپنا نہایت مقرب و ندیم بنا لیا۔ (تذکرہ دولت شاہ)

ایک مرتبہ غزالی مشہدی شیراز گیا۔ وہاں شعرائے ایک غزل کی طرح کی اور غزالی سے بھی طبع آزمائی کی فرمائش کی۔ غزالی نے دانت کے درد کا بہانہ کیا اور غزل نہ کہی جس پر عالی شیرازی نے جو لطیفہ گوئی اور ذکی ہونے میں مشہور تھا یہ قطعہ کہہ کر اس کو بھیج دیا۔

غزالی آں سخن پرداز کاندر شاعری خود را
چناں داند کہ شاگرد اند خاقانی و حسانش

بشیراز آمد و وقتے کہ شعرے در میاں افتاد
ز بہر امتحاں تکلیف فرمودند یارانش

بہانہ درد دنداں کرد و درماں باشد کندن
اگر خواہد کہ گوید شعر باید کند دندانش

(غزالی شاعری میں ایسا مغرور ہے کہ خاقانی اور حسان کو اپنا شاگرد سمجھتا ہے۔ جب وہ شیراز آیا اور اس کے دوستوں نے بطور امتحان غزل کی فرمائش کی تو درد دنداں کا بہانہ کیا۔ جس کا علاج سوائے دانت اکھاڑنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ شعر کہنا چاہے تو اسے چاہئے کہ پہلے اپنے دانت اکھڑوا ڈالے) (تاریخ مراۃ العالم)

عمدۃ الملک امیر خان بڑے ظریف آدمی تھے۔ نواب قمر الدین خاں وزیر اعظم اور خان دوراں خاں بخشی مرہٹوں سے مقابلہ کے لئے گئے اور بغیر کوئی کارنمایاں کئے واپس آئے، تو امیر خان نے یہ مذاقیہ تاریخ اسی واقعہ کی نظم کی۔

رفتند بر مرہٹہ و خوردند ہر دو گوہ
تاریخ گفت ہاتف بخشی و وزیر ادہ

اسی طرح جب خان دوراں دوسری مرتبہ گئے اور لڑائی ہار کر واپس آئے تو امیر خان نے کہا

"نواب آئے، ہمارے بھاگ آئے۔"

ایک دن برہان الملک نواب سعادت خان اور امیر خان محمد شاہ کے دربار میں حاضر تھے، نواب نے امیر خان کے لاابالی پن پر طعنہ کر کے کہا

پسر نوح با بداں بنشست
خاندان نبوتش گم شد

اس میں اشارہ یہ تھا کہ امیر خان شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد میں ہوکر ایسا نامعقول ہے۔ امیر خان نے اُن کے جواب میں دوسرا شعر پڑھ دیا ؎

سگ اصحاب کہف روزے چند
پے نیکاں گرفت و مردم شد

یعنی آپ ایک کتے کی طرح اچھوں کی صحبت میں رہ کر بڑے درجہ کو پہونچ گئے۔

(مفتاح التواریخ)

عمعق سلطان سنجر کے زمانے کا ایک مشہور شاعر تھا۔ اس کے بیٹے حمید اور سوزنی سے خوب نوک جھونک چلا کرتی تھی۔ حمید نے یہ پُرلطف قطعہ سوزنی کی ہجو میں کہا ؎

دوشش در خواب دیدم آدم را
دست حوا گرفتہ اندر دست
گفتمش سوزنی نبیرۂ تست
گفت حوا بسہ طلاق ار ہست

(کل رات کو میں نے خواب میں حضرت آدمؑ کو دیکھا وہ حضرت حوا کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ سوزنی آپ کا پوتا ہے؟ انھوں نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو حوا پر تین طلاق یعنی وہ ہرگز میری اولاد سے نہیں۔ یعنی وہ آدمی نہیں ہے)

(تذکرہ دولت شاہ)

چندر بھان برہمن اُردو اور فارسی میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ فارسی میں اس کی نظم و نثر کے نمونے آج بھی محفوظ ہیں ایک دفعہ ایک شعر کہا جس میں اس نے اپنے اعتقاد کا اظہار کیا ؎

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

شاہ جہاں نے یہ شعر جس سے دین کی ہتک متصور تھی جب سنا تو برافروختہ ہوا اور کہا کہ اس کم بخت کو ہمارے ملک سے نکال دو۔ سعد اللہ خاں وزیر نے کہا کہ حضور ایسے



طنز گو
شاعر
اکبر
الہ آبادی

نالائق کو سزا کی کیا ضرورت ہے۔ شیخ سعدیؒ تو اس کے متعلق پہلے ہی کہہ چکے ہیں ؎

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود   چوں بیاید ہنوز خر باشد

شاہجہاں اس جواب پر بہت خوش ہوا اور برہمن کو معاف کر دیا۔

(شعرالعجم)

ایک دن کسی بادشاہ کی محفل میں ایک شخص شاہی سبزواری سے بلند تر جگہ پر بیٹھ گیا۔ شاہی اور اس شخص سے نوک جھونک رہتی تھی۔ شاہی نے یہ برجستہ قطعہ فوراً پڑھا ؎

شاہا مدار چرخ فلک تا ہزار سال
چوں من یگانہ نماید بصد ہنر
گر زیر دست ہر کس و ناکس نشانیم
ایں جا لطیفہ ایست بدانم من ایں قدر
بحر است مجلس تو و در بحر بے خلاف
لولو بزیر باشد و خاشاک بر زبر

(اے بادشاہ آسمان کی گردش ہزاروں برس میں ایک مجھ سا یگانہ و صاحب ہنر پیدا کرتی ہے۔ اگر آپ نے ہر کس و ناکس سے فروتر مجھ کو بٹھایا بھی تو اس میں یہ لطیفہ ہے کہ آپ کی مجلس مثل ایک سمندر کے ہے اور سمندر میں موتی نیچے ہوتے ہیں اور کوڑا کرکٹ اوپر ہوتا ہے)

طنزیہ ادب کی بنیاد بڑی حد تک اصلاحی ہوتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کا کلام اس کا شاہد ہے۔ طنزیہ کا فن ایک منفی اور

نا انداز نہیں ہے۔ طنز نگار کے یہاں کسی خاص صورت حال کے خلاف ایک جھنجھلاہٹ پائی جاتی ہے اور سماج کی برائیوں کا علاج تجویز کرنے کی بجائے سماج کی برائیوں پر حملہ کرتا ہے۔ اور اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ طنز کا وار بعض اوقات اتنا بھرپور ہوتا ہے کہ اس میں ہمیں ناپسندیدگی غصے اور نفرت کی شدت کا احساس ہوتا ہے۔ مگر مزاح کا نام و نشان بھی نہیں نظر نہیں آتا لیکن شاعرانہ چشمکوں میں طنز کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے۔

ایک دفعہ عبداللہ خان ازبک رستم کے مقبرہ کے پاس سے گزرا اور یہ شعر پڑھا ؎

سر از خاک بردار وایراں ببیں
بکام دلیرانِ توراں زمیں

(خاک سے اٹھا اور ایران کو دیکھ جو توران کے دلیروں کے قبضے میں آ چکا ہے)

عبداللہ خان کا وزیر ساتھ تھا اس نے کہا اگر رستم زندہ ہوتا تو میں جانتا ہوں کہ وہ کیا جواب دیتا عبداللہ خان نے کہا اچھا بتاؤ وہ کیا کہتا؟

وزیر نے کہا کہ رستم کا جواب یہ ہوتا ؎

چو بیشہ تہی ماند نرّہ شیر
شغالاں بہ بیشہ درآید دلیر

(جب کچھار شیروں سے خالی ہو گیا تو گیدڑ دلیرانہ انداز سے سامنے آ گئے)

یہ شاعرانہ سوال و جواب طنز بدیہہ کا کیا اچھا نمونہ ہیں۔ شاہی درباروں میں شعر و شاعری کا ماحول خوب پھلتا پھولتا تھا۔ بادشاہ خود بھی موزوں طبع ہوتے تھے اور شعراء کی قدر کرتے تھے۔ شاعر نوازی نے ذہنی آزادی کو ہمیشہ سراہا۔ بادشاہو کے حرم میں بھی شاعری کے چرچے تھے۔ شاعرانہ ہنسی مذاق نوک جھونک کو شہرت حاصل تھی۔ ایک بار جہانگیر نور جہاں بیگم کے ساتھ بالاخانہ پر موسم کا لطف اٹھا رہا تھا کہ ایک بڈھے کا ادھر سے گزر ہوا جس کی پیٹھ خم تھی اور بڑھاپے کے

تمام آثار اس میں ہویدا تھے۔ جہانگیر نے جب دیکھا تو بیگم کو مخاطب کر کے کہا ؎

چہ ماخم گشتہ می گردند پیران جہاں دیدہ
(بڈھے آدمی کمر جھکائے دنیا میں کیوں گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں)

نور جہاں نے اس طنز کا کیا برجستہ جواب دیا ؎

بزیر خاک می جویند ایام جوانی را
(مٹی میں اپنی کھوئی جوانی کو تلاش کرتے ہیں)

جہاں آرا بیگم دختر شاہجہاں ایک بار اپنے چہرے پر نقاب ڈالے چہل قدمی کر رہی تھی۔ اور صیدائی طہرانی بالاخانہ پر سے چھپ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اس جگہ پر پہونچی جہاں وہ کھڑا تھا، تو اس نے یہ شعر پڑھا ؎

برقع برُخ افگندہ برد ناز بباغش
تا نکہتِ گل بیختہ آید بدماغش

(برقع چہرے پر ڈال کر اس کا باغ میں خرام ناز ہونا اس لئے ہے) تاکہ پھول کی خوشبو چھن کر دماغ میں پہونچے)

بیگم نے اس شعر کی نازک خیالی پر صیدی کو پانچ ہزار روپیہ بطور انعام عطا کیا، لیکن اس کی اس جسارت سے بعالی یہ سزا دی کہ اس کے شہر میں رہنے پر پابندی عائد کر دی۔

(فارسی شاعری میں طنز و مزاح)

فیضی فیاضی ادب و شعر کے ساتھ کتے پالنے کا بھی شوقین تھا۔ ایک بار اس نے عرفی شیرازی کی دعوت کی۔ عرفی جب وہاں پہونچا تو دیکھا کہ کتوں کے پلوں کے گلے میں سونے کے پٹے ہیں۔ مذاقاً پوچھا ؎

" مخدوم زادہ ہا بچہ اسم موسوم اند؟"
(مخدوم زادے کس نام سے پکارے جاتے ہیں؟)

فیضی نے جواب دیا: "اسم عرفی" یعنی معمولی نام یا عرفی"
اس پر عرفی نے فوراً جواب دیا: "مبارک باشد" یعنی مبارک ہو۔

اس پر عرفی نے فوراً طنز کیا ہے۔ کیونکہ مبارک فیضی کے

والد کا نام بھی ہے۔ (فارسی شاعری میں طنز و مزاح)
شیخ آذری کا دیوان امینائی کاتب نے لکھا تھا جس
میں بہت سی غلطیاں کی تھیں شیخ نے اس سے رنجیدہ ہو کر طنز میں
ڈوبا ہوا ایک قطعہ کہا ہے

دیوان بندہ راکہ امینا سواد کرد
تنہا درو نہ شعر مجدد نوشتہ است
از نظم و نثر ہر چہ بطبعش خوش آمدہ
دیوان بندہ بہرِ خوش آمد نوشتہ است
ہر جا دو لفظ بد مثلاً دید در سخن
دست تصرفش ہمہ را بد نوشتہ است
اکنوں شریک بہتر دیوان بندہ است
زیرا کہ بیشتر سخن خود نوشتہ است

(یعنی میرا دیوان امینائی کاتب نے لکھا ہے۔ اور اس میں نہ صرف اشعار کو گڑبڑ کر لکھا ہے بلکہ نظم و نثر میں جو کچھ اس کو اچھا معلوم ہوا۔ میرے دیوان میں بے تکلف داخل کر دیا۔ مثلاً جس جگہ لفظ "بد" دیکھا اس کو ہر جگہ "بد" لکھ دیا۔ مختصر یہ کہ اب وہ میرے دیوان کا شریک غالب ہے کیونکہ زیادہ کلام اس میں اسی کا ہے) (نوادر)

کبھی مکالے کی شکل میں بھی شاعرانہ چشمکیں ملتی ہیں جیسے تیمور کے پوتے عمر شیخ مرزا سے ابو اسحاق شیرازی کا تعلق تھا۔ ان کے کلام کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کھانوں کا کچھ نہ کچھ ذکر ضرور ہوتا تھا اس وجہ سے وہ اطعمہ کے لقب سے مشہور تھے۔ حافظ کے اشعار کی اکثر تضمینیں کرتے تھے۔

حافظ۔ آنکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند
اطعمہ: لیپا بنان سحر کہ سر کلہ وا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

(نان بائی صبح کو جب کلہ کھولیں تو خدا کرے کہ وہ کن انکھیوں سے ہم کو بھی دیکھ لیں)

چوں از درونِ خربزہ واقف نشد کسے

اطعمہ: ہر کس حکایتے بہ تصور چرا کنند
(جب کوئی خربوزہ کے اندر کے حال سے واقف نہیں تو پھر ہر شخص اپنے خیال کے موافق کیوں باتیں بناتا ہے)

حافظ :-
ترک عاشق کش من مست برون رفت امروز
تا دگر خون دل از دیدہ روان خواہد بود

اطعمہ :-
مطبخی باز پیاز از جہت قیمہ خرید
تا دگر آب ز چشم کہ روان خواہد بود
(باورچی نے پھر پیاز قیمہ کے واسطے خریدی ہے جب دیکھیں کس کس کی آنکھ سے پانی بہتا ہے)

حافظ :-
گوشہ گیری و سلامت ہوسم بود ولے
عشوہ می کند آں نرگس فتاں کہ مپرس

اطعمہ :-
روزہ داری و قناعت ہوسم ہست ولے
چشمکے می زند آں برہ بریاں کہ مپرس
(جی چاہتا ہے کہ روزہ رکھوں اور قناعت اختیار کروں، مگر وہ بھنا ہوا بکری کا بچہ کچھ ایسا اشارہ کر دیتا ہے کہ مجبور ہو جاتا ہوں)

حافظ :-
کس بامید وفا ترک دل و دیں مکناد
کہ چنانم من ازیں کردہ پشیماں کہ مپرس

اطعمہ :-
کس بہ بالائے مزعفر منکناد آش ترش
کہ چنانم من ازیں کردہ پشیماں کہ مپرس
(کوئی شخص مزعفر کے اوپر کھٹا شوربا نہ کھائے اس واسطے کہ میں اپنے کئے سے ایسا پشیماں ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا)

حافظ :-
وقت را غنیمت داں آں قدر کہ بتوانی

حاصل از حیات اے جان یکدم است تا توانی

قطعہ:-

ہر زماں کہ دریابی نان گرم و بورانی
وقت را غنیمت داں آں قدر کہ بتوانی

(جس وقت تم کو گرم روٹی اور بورانی ملے۔ اس وقت کی جہاں تک ہو سکے قدر کرو)

قطعہ:-

خور در رواق رزق چوں رو نہد بزردی
یاد آیدم مزعفر در صحن لاجوردی

(آفتاب جب نیلے آسمان میں زرد ہو جاتا ہے یعنی غروب ہونے لگتا ہے۔ تو مجھ کو نیلی قاب میں مزعفر یاد آتا ہے۔)

مرزا غالب مولوی امام بخش صہبائی کے متعلق کہا کرتے تھے کہ عمر بھر ایک چلو نصیب نہیں ہوئی مگر صہبائی کہلاتے ہیں کسی استاد کا شعر ہے ؎

اگر خدائے بداند کہ زندۂ تو ہنوز
ہزار مشت زند بر دہان عزرائیل

اس شعر کو حسب حال پاکر مرزا نے ایک طنزیہ قطعہ نظم کیا ؎

ایا زیاں زدہ غالب کہ از حدیقۂ بخت
نمی رسد بتو خار و خسے ز ہیچ سبیل

چوں لازم است کہ پروردگار زاد ہمرگ
بود بہ رزق ضرورۂ عباد کفیل

چراست ایں کہ نداری زر از سیاہ و سفید
چراست ایں کہ نداری بر از کثیر و قلیل

فتادہ در سر ایں رشتہ عقدۂ در نہ
نمردۂ تو و نے رزاق العباد بخیل

زچندسال بمرگ تو و تباہی رزق
شد است حکم خود از پیش گاہ رب جلیل

فرشتہ کہ وکیل است بر خزائن رزق
نکرد ہیچ توقف بہ رزق در تعطیل

دوم فرشتہ کہ یادش بخیر معترزن باد
روا نداشت در اہلاک شیوۂ تعجیل

لطیفہ کنم از قول شاعرے تضمین
کہ در لطیفہ مراد را کسے بنود مدیل

اگر خدائے بداند کہ زندۂ تو ہنوز
ہزار مشت زند بر دہان عزرائیل

(یعنی اے کم بخت غالب یہ کیا بات ہے کہ نصیب کے باغ سے تجھ کو کانٹا اور تنکا تک نہیں ملتا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کی زندگی بھر رزق پہونچانے کفیل ہے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ تیرے پاس زر سفید و سیاہ یعنی روپیہ بلکہ پیسہ تک نہیں اور کسی قسم کا سامان چھوٹا بڑا کچھ بھی تجھ کو میسر نہیں۔ اصل یہ ہے کہ تیرے معاملے میں ایک سخت پیچیدگی پڑ گئی ہے کیونکہ تو ہنوز مرا نہیں اور نہ اللہ تعالیٰ بخیل ہے۔ وہ پیچیدگی یہ ہے کہ کئی سال سے تیری موت اور رزق کی تباہی کا حکم اللہ تعالیٰ نے صادر فرما دیا۔ اور وہ فرشتہ جو رزق کے خزانوں کا مالک ہے وہ اس حکم کو فوراً نافذ کر چکا ہے، مگر دوسرا یعنی موت کا فرشتہ (یادش بخیر وہ جلدی آئے) اپنے متعلق حکم کا نفاذ بھول گیا اور اس میں دیر کر رہا ہے۔ اب میں اس موقع پر ایک شاعر کا قول تضمین کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو جائے کہ تو زندہ ہے تو وہ عزرائیل کو ہزار گھونسے رسید کرے کسی شاعر کے شعر پر غالب کے اس طنزیہ قطعے کا رنگ غالب کے حالات سے کتنا منطبق ہے۔) (نوادر)

(۲)

شاعر اپنی فکری صلاحیتوں سے زندگی کی باریکیوں اور کائنات کی لامتناہی خوب صورتیوں کا جائزہ لیتا ہے اور ان چیزوں کا تعلق ان بڑے بڑے اصولوں سے ظاہر کرتا ہے جس کے تحت ہمارے خیالات اور کائنات کی ہر زندگی کا راز مضمر ہوتا ہے وہ اپنے تجربوں کو روز بروز وسیع کرتا جاتا ہے۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے۔ تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شعر فکرِ انسانی کا جوہر ہے۔ دوسرے فن کاروں کی طرح شاعر بھی عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ ذُود رس احساس اور زیادہ پُرجذبات اور زیادہ عمیق فکر رکھتا ہے۔ وہ دنیا کے سامنے اپنے فکری تدبر کے نمونے پیش کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ شاعری زندگی سے بنائی جاتی ہے، زندگی سے تعلق رکھتی ہے اور زندگی ہی کے لئے باقی رہتی ہے۔ وہ اپنے فکری تاثر کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر زبانِ شعر عطا کرتا ہے اور بلند ترین اور بے کراں فضاؤں میں اڑتا ہوا چلا جاتا ہے، تو ایک عالم اس کی پرواز کا والہ و شیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس امر کا تجزیہ کیا جائے کہ شاعر کی اس کامیابی کا راز کیا ہے؟ تو بلاتردید کہنا پڑتا ہے کہ یہ فقط فکر ہی کا معجزہ ہے۔ اور ہر شاعر اپنے اندازِ فکر ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ شاعر کی فکری صلاحیتوں میں جہاں دوسرے محاسن ہیں وہاں شگفتہ مزاجی بھی شامل ہے۔ اگر شگفتہ مزاجی شامل نہ ہو تو شاعری فلسفہ بن کر رہ جائے گی اور اگر عمیق فکر ہی شعر میں ڈھل جائے تو اس سے خواص تو ضرور محظوظ ہوں گے لیکن عوام کے ذہن اس سے متاثر نہیں ہوں گے، کیونکہ وہ بیان ان کی سمجھ سے بالاتر ہے شاعری کو شگفتہ مزاجی سے جو تعلق ہے اس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ ہمارا موضوع چونکہ شاعرانہ اور معاصرانہ چشمکیں ہیں۔ اس لئے ان چشمکوں میں فکری جولانیاں اور شگفتہ مزاجی کا کیا رنگ ہے؟ اس کے نمونے اُردو شاعری میں موجود ہیں ان کی حیثیت کیا ہے؟ اگرچہ اُردو میں ان ادبی معاصرانہ چشمکوں کا انداز فارسی سے جدا نہیں۔ یہاں بھی حاضر جوابی حاضر دماغی کی مثالیں ملیں گی۔ ذاتی چھیڑ چھاڑ نوک جھونک کا ذکر بھی ہوگا۔ مزاحیہ ادبی معرکے بھی مل جائیں گے۔ عروضی خامیاں اور صرف و نحو کی کمزوریوں کا تذکرہ اور کہیں کہیں ہجو قبیح اور ہجو ملیح کا انداز بھی ہوگا مزاحیہ رنگ میں بھی چشمک زنی کی مثالیں بھی ہوں گی لیکن ہم کوشش کریں گے کہ مثالوں کے انتخاب میں مرزا مظہر جانجاناں و شاہ مبارک آبرو اور سودا اور میر ضاحک کی قسم کی چشمکوں کو نظر انداز کر دیں اور ان ہی معاصرانہ نوک جھونک کو لیا جائے جو نازک طبائع پر ناگوار نہ ہوں۔

قدیم شعرائے اُردو میں ولی کا نام سرِ فہرست آتا ہے



مولانا حالی

ولی نے اپنے جوشِ ریختہ گوئی میں ناصر علی سرہندی کو جو علی تخلص کرتے تھے یہ شعر لکھا ؎

اچھل کر جا پڑے جوں مصرع برق
اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں (اج کوں بجائے (کو) زبان ہے)

باعجاز سخن گر اگر چلے دہ
ولی ہر ہو نہ پہونچے کا علی کوں

(آبِ حیات)

اشرف علی فغاں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں بلند مقام رکھتے تھے۔ راجہ شتاب رائے کی سرکار سے متوسل تھے۔ راجہ صاحب اُن کی شیریں کلامی اور علم مجلس کے معترف تھے۔

ایک دن راجہ صاحب نے طنز سے فغاں کو کہا کہ جیسی ملکہ زمانی کو احمد شاہ درانی کھونکر لے گیا۔ فغاں کو یہ طنز ناگوار گزری اور کہا مہاراج جس طرح سیتا جی کو راون لے گیا۔

ایک دفعہ راجہ صاحب کے دربار میں فغاں نے ایک غزل پڑھی جس کا قافیہ لالیاں، جالیاں، بالیاں، چالیاں، نکالیاں اور پالیاں وغیرہ تھا۔ حاضرینِ مجلس نے فغاں صاحب سے "تالیاں" بجا کر تعریف کی۔ راجہ صاحب کی صحبت میں جگنومیاں ایک مسخرے تھے۔ یہ تعریف غالباً وہ برداشت نہ کر سکے اور کہا کہ فغاں صاحب سے "تالیاں" کا قافیہ رہ گیا جو نظم نہیں ہوا۔ راجہ صاحب نے خود فغاں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ سنتے ہو، جگنومیاں کیا کہتے ہیں۔ جواب میں فغاں نے کہا کہ قافیہ چونکہ مبتذل تھا اس لئے نظری کر دیا، اگر حضور فرمائیں تو اب بھی ہو سکتا ہے، مہاراج نے کہا کہ ہاں کچھ کہنا تو چاہیے۔ فغاں صاحب نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

جگنومیاں کی دم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں

(آبِ حیات)

مرزا مظہر جانجاناں کا کلام فارسی میں زیادہ ہے صاحب دیوان تھے۔ اردو میں بھی گاہے گاہے طبع آزمائی فرمایا کرتے تھے۔ مرزا مظہر اور سودا ایک ہی زمانے کے اُستاد تھے سودا شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ خان آرزو نے انھیں نصیحت کی کہ مرزا فارسی اب تمہاری زبان نہیں رہی۔ اور تم اہلِ زبان کے مقابل تعریف نہیں ہو گے اُردو کہا کرو جسے سودا نے بسر و چشم منظور کیا۔ مظہر جانجاناں فارسی کے تو بے مدیل شاعر تھے۔ اور ریختہ میں بھی کبھی کبھار کہہ لیتے تھے۔ سودا کو شاید یہ گوارا نہ تھا۔ آخر سب آداب و رعایتوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک قطعہ کہا ؎

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ
سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا

آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ
واقف جو ریختہ کے نہ ہوں ہے سخاٹ کا

سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ
وہ ریختہ بھی ہے تو فیروزشہ کی لاٹ کا

القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں
کتا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

(آبِ حیات)

سودا نے طبیعت شگفتہ پائی تھی طنز و مزاح کی زبان میں جو کچھ کہتے تھے۔ سننے والے ہنسی ضبط نہیں کر سکتے تھے۔ مزاج میں تیزی تھی۔ شگفتگی اور زندہ دلی کی بولتی تصویر تھے۔ غنچہ نام ایک غلام ہر وقت قلمدان لئے حاضر رہتا تھا۔ "اگر کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے ارے غنچہ میرا قلمدان" میر ضاحک، فدوی، مکین، بقا وغیرہ سے نوک جھوک رہتی تھی۔ یہ چشمکیں کبھی اخلاقی حدود کو عبور کر جاتی تھیں۔ بقا جو شاہ حاتم کے ریختہ میں شاگرد تھے۔ اپنے فن پر نازاں تھے۔ انھوں نے میر و میرزا دونوں پر چوٹ کی ہے ؎

میر و مرزا کی شعر خوانی نے
بسکہ عالم میں دھوم ڈالی ہے

کھول دیوان دونوں صاحب کے
اے بقا ہم نے جب زیارت کی

کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن
ایک تو تو کچھ ہے اک بما ہی

قائم کو سودا سے تلمذ تھا کسی وجہ سے ان بن ہو گئی۔ قائم نے بقول قائم سودا کی ہجو کہی۔ جب سودا نے اپنے قلم کو جنبش دی تو معافی مانگ لی۔ البتہ جو ہجو بہ نظم سودا نے قائم کے تئے کہی تھی۔ قائم کا نام بدل کر ایک فرضی نام فوقی لکھ دیا۔ چند تمہیدی اشعار کے بعد سودا اصل موضوع کی طرف اس طرح آتے ہیں:

ٹک میاں فوقی کے گھر جا اے صبا
کہہ سلام شوق تو جا کر مرا
بعد ازاں کہیو کہ اتنا بھی غرور
شاعری کے فن میں کرنا کیا ضرور
اوروں کو بکری کہو شیر آپ کو
بکری بھی گر کچھ کہے پھر آپ کو
بات بکری کی لگے تم کو بری
دوڑ دو تم اس پر قلم کی لے چھری

.. ..

کیا قصیدہ کیا غزل کیا قطعہ بند
جو ردیف و قافیہ کیجے پسند
آپ کہہ کر مجھ کو بھی فرمایئے
جس کو جی چاہے اسے دکھلایئے
گھر میں شیخی کرنی کچھ رکھتی ہے مول
کلیا میں گڑ پھوڑنے سے کیا حصول

اور پھر سودا نے قائم پر الزام لگایا ہے کہ قائم نے سارے مضامین دوسرے شاعروں کے چرائے ہیں اور ایک چور شاعر ہے ۔

ہو گیا ظاہر جو کچھ تھا تم میں زور
مبتذل اور ایک عالم کے ہو چور

فدوی ایک ہندو تھے۔ مکند رام نام سودا سے اُن کی کبھی نہیں بنتی تھی۔ سودا کی ایک مثنوی (در ہجو فدوی متوطن پنجاب کہ در اصل بقال بچہ بود۔ شامل ہے۔ فدوی کی ایک ہجو بوم بقال ہے جو سودا کے شاگرد خیدا لے کہی ہے اسی طرح فدوی نے بھی سودا پر چوٹ کے وار کئے ہیں ۔

کچھ کٹ گئی ہے بیٹی پھوکٹ کیا ہے ڈرا
ذرا اب سانسنے سے وہ اڑ جلا شورا
کچھ ہوا ہے مسخرہ سے سودا سے ہوا ہے

(آب حیات)

ایک دن میر سوز نے مرزا رفیع السودا سے کہا کہ ہم حسرت کو آپ کی طرف سے ناملائمات اور ہر باب میں ملامت پاتے ہیں۔ شگفتہ ہجو سے اس کو ماش زر منہ چاہئے اور معترف اپنے قصور کا اسے کرنا چاہئے۔ سودا نے کہا: "میں اس کی ہجو کرتا ہوں جو شاعر ہو نہ کہ ایسے ناشاعر کی۔ یہ رباعی تمہارے نام سے کہی جاتی ہے۔ اس کی تنبیہ کو کافی ہوگی"

کیوں سوز پہ حسرت کو نہ دل ہو دے پسند
ہے شعر کی گرمی کا دھواں اس کے بلند
حسرت اسے کیوں نہ ہو دے شاعر ہے سوز
عطار کا لونڈا ہے وہ ماکھو گلقند

حسرت مرزا سودا کی شہرت کی خبریں سن کر خار کھاتے تھے اور اُن کے کلام پر اعتراض بھی کرتے تھے ۔

(خوش معرکہ زیبا)

مرزا رفیع سودا جوانی کے عالم میں تھے جب میر جعفر زٹلی بڑھاپے کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے۔ ایک روز مرزا بغل میں کتابیں دبائے آ رہے تھے کہ میر جعفر سے سامنا ہوا۔ مرزا نے جھک کر سلام کیا کیونکہ اس زمانے میں بزرگوں کو سلام کرنا ایک نعمت سمجھا جاتا تھا۔ میر جعفر نے اس نوخیز کی طبیعت بڑھانے کے لئے کہا کہ مرزا اس موضوع پر مصرع لگاؤ :

لالہ در باغ داغ چوں دارد؟

مرزا نے سوچ کر کہا۔

عمر کوتاہ است غم فزوں دارد

میر صاحب نے فرمایا: "واہ بھئی دل خون ہوتا ہے جگر خون ہوتا ہے۔ بھلا سینہ کیا خون ہوگا۔ سینہ تو زخم ہوتا ہے"

پھر مرزا نے کہا۔

چہ کند سوزشِ دروں دارد

میر صاحب نے کہا ہاں مصرع تو ٹھیک ہے لیکن ذرا طبیعت پر زور دے کر کہو مرزا دق ہو گئے تھے جھٹ کہہ دیا۔

یک عصا زیر . . . . دارد

میر جعفر مرحوم ہنس پڑے اور جریب اٹھا کر کہا کیوں! بیرہم سے بھی۔ دیکھ کہوں گا تیرے باپ سے بازی بازی بریشِ بابا ہم بازی۔ مرزا اڑکے تو تھے ہی بھاگ گئے۔

(آبِ حیات)

مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ایک دن سودا کے ہاں

میر سوز تشریف لائے۔ ان دنوں میں شیخ علی حزیں کی غزل کا چرچا تھا۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

می گرفتیم بجاناں سرِ راہے گاہے
او ہم از لطف نہاں داشت نگاہے گاہے

میر سوز نے اپنا مطلع پڑھا ؎

نہیں نکلے ہے مرے دل کی اباہے گاہے
اے فلک بہرِ خدا رخصتِ آہے گاہے

مرزا سن کر بولے کہ میر صاحب بچپن میں ہمارے ہاں پشور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں یا تو یہ لفظ اُن سے سنا تھا یا آج سُنا۔ میر سوز بیچارے ہنس کر چپکے ہو رہے۔ پھر مرزا نے خود اسی وقت مطلع کہہ کر پڑھا ؎

نہیں جوں گل ہوسِ ابرِ سیاہے گاہے
کاہ ہوں خشک میں اے برق نگاہے گاہے

یہاں جرأت کی ان دنوں میں ابتدا تھی خود جرأت نہ کر سکے۔ ایک اور شخص نے کہا کہ حضرت یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں۔ مرزا نے کہا کیوں بھئی کیا۔ جرأت نے پڑھا ؎

سرسری اُن سے ملاقات ہے گاہے گاہے
صحبتِ غیر میں گاہے سرِ راہے گاہے

سب نے تعریف کی۔ (آبِ حیات)

سید انشا شاہ عالم کے درباری شاعر تھے بڑے طبیعت دار، چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ذی علم بھی تھے اور شوخ طبع بھی۔ اُن کے دور میں ادبی مناقشوں کی دھوم تھی۔ مرزا عظیم بیگ سے ان کی چشمک تذکروں میں محفوظ ہے۔ عظیم بیگ بھی کہنہ مشق شاعر اور سن رسیدہ شاعر تھے۔ سودا کے شاگرد تھے بعض نے ان کو شاہ حاتم اور میر درد کا شاگرد بھی کہا ہے ایک دفعہ مرزا مینڈو کے گھر پر مشاعرہ منعقد ہوا۔ تو عظیم نے ایک غزل پڑھی۔ انشا نے تقطیع کی فرمائش کر دی۔ عظیم عیب کو بھانپ گئے۔ انشا کہاں چوکنے والے تھے۔ فوراً ایک مخمس بر سرِ مشاعرہ پڑھا ؎

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے
کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی اپنی حد سے نہ باہر نکل چلے
پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

(بحرِ رجز کا وزن :-
مستفعلن مستفعلن مستفعلن
مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن)

(بحرِ رمل کا وزن :-
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

رجز مثمن پورے شعر میں آٹھ بار اور بحرِ رمل محذوف جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔ عروضیوں کے ہاں صحیح ہے مگر مستفعلن مصرع میں کہیں فاعلاتن سے بدل جائے تو یہ عروضیوں کے ہاں عیب ہے۔ عظیم سے یہی غلطی ہوئی کہ مستفعلن کو فاعلاتن سے بدل دیا۔ جس کی انشا نے گرفت کی۔)

مرزا عظیم بیگ نے بھی اس کے جواب میں ایک مخمس کہا مصنف آبِ حیات نے سات بند آبِ حیات میں محفوظ کیے ہیں البتہ مجموعۂ نغز میں ان بندوں کی تعداد نو ہے ؎

وہ فاضل زمانہ ہو تم جامع علوم
تحصیل صرف و نحو سے جن کی مچی ہے دھوم

رمل و ریاضی حکمت و ہیئت جفر نجوم
منطق بیان معانی ہمیں سب ہیں کو جوم

تیری زباں کے آگے نہ دعویٰ کا ہل چلے

اک دو غزل کے کہنے سے بن بیٹھا تم طاق
دیوان شاعروں کی نظر سے ہے بے طاق
مرزا نظیری کی طاقت ہوئی ہے طاق



سید انشا

ہر چند ابھی نہ آئی ہے فہمید جفت طاق
شکر کی تلے سے عرق ورقدی بکل چلے

تھا رد زمگر میں کہ کہوں معنی و مثال
تجنیس و ہم رعایت لفظی و ہم خیال

فرقِ رجز رمل نہ لیا میں نے گو سنبھال
نادانی کا مرے نہ ہو دانا کو احتمال
گو تم بقدر فکر یہی کر عمل چلے
نزدیک اپنے آپ کو کتنا ہی سمجھو دور
پر خوب جانتے ہیں مجھے جو ہیں ذی شعور

وہ بحر کونسی ہے نہیں جس پہ یاں عبور
کب میری شاعری میں پڑے شبہ قصور
بن کر قسل نکالنے کو تم خلل چلے
موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق — قمل. جوں
تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق

روشن ہے مثلِ مہر یہ ازمغرب تابہ شرق
شہ رور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا کرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

کم ظرفی سے تمہیں تو یہی آئی ہے اُمنگ
کیجئے غرور خلق میں اب کر سخن کی جنگ

اپنے تئیں تو بھئی آتا ہے یار ننگ
اتنا بھی رکھیے حوصلہ فوارہ ساں نہ تنگ
تھوڑی بھر جو پانی میں گز بھر اچھل پڑے

کیوں جنگ گفتگو کو تم اُٹھ دوڑے ہے تحاش
کرتے جو بھاری بالچہ ہوتا نہ پردہ فاش
پر سمجھیے کب یہ بات جو کندے ہو ناتراش
تیغ زبان کو میاں میں رکھتے تم اپنے کاش

ناحق جو تم ازار سے باہر نکل پڑے
عظیم اور انشا کی چشمکوں کی داستان طویل ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ جنگ و جدال پر نوبت آگئی ولی اللہ محب نے ایک قطعہ کہا۔

مجلس میں چاہیے جھگڑا شعراء کا
ایسے ہی کسی صاحبِ توقیر کے آگے

یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہونچے یہ قضایا
اکبر تئیں یا شاہ جہانگیر کے آگے

مرزا عظیم بیگ نے کہا بابا میں نے اپنی عرضِ حال میں اپنے استاد کے ایک شعر پر قناعت کی ہے کہ ابھی تضمین ہو گیا۔

عظیم اب گو ہمیشہ سے ہے یہ شعر کہنا شعار اپنا
طرح ہر ایک سے ہو بحث کرنا نہیں ہے کچھ اختیار اپنا

کئی مخمس باز کھنڈ گوئیوں میں کھو نہ ہوا اعتبار اپنا
جنھوں کی نظروں میں تھا مخمس ہیں یاد انھیں کو دکھا اپنا

عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پر ڈالا جو بار اپنا

سید انشا نے جب یہ سنا تو تن گئے اور فوراً یہ کہا۔ قطعہ طویل ہے پانچ شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

اک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے
کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے
ہوں وہ جبروتی کہ گروہ حکما سب
چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں مرے آگے
بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے
مجرے کو مرے خسرو پرویز ہو حاضر
شیریں بھی کہے آکے بلاؤں مرے آگے
کیا آکے ڈرا دے مجھے زلفِ شبِ یلدا!
ہے دیو سفید سحری جوں مرے آگے

بعد میں اُن کے حکیم میر قدرت اللہ خان قاسم کے سامنے شمع آئی انھوں نے اتنا کہا کہ سید صاحب ذرا الفیل ما الفیل کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ میر مشاعرہ کو خیال ہوا کہ سید انشا نے جو ہجو کہی ہوگی مبادا شعرا میں بے لطفی حد سے بڑھ جائے اسی وقت اٹھے اور دونوں میں صلح کرا دی۔

مصحفی اور انشا کی چشمکوں سے تذکرے بھرے پڑے ہیں مصحفی نے جب سُنا کہ انشا کی حالت بُری ہے اور کوئی دم کے اور مہمان ہیں۔ اُن کے مکان پر عیادت کے لئے گئے۔ دیکھا کہ عالم نزع میں دم توڑ رہے ہیں ؎

سانس اکھڑی ہے سرد سینہ ہے
ماتھے پر موت کا پسینہ ہے

مصحفی نے نبض پر ہاتھ رکھا تو کمال حسرت کے ساتھ ان کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرع نکل گیا۔ ع

تیرے بیمار کو ہے عزم سفر آج کی رات

انشا نے آنکھیں کھولیں اور بے ساختہ کہہ اٹھے: ع۔

نبض چل بسنے کی دیتی ہے خبر آج کی رات

آخری سانسوں میں بھی انشا نے جو مصرع پہ مصرع لگا!

ہے لاجواب ہے۔

نال تھا میر تقی میر نے ایک مثنوی اژدر نامہ بھی لکھی تھی اژدر قرار دیا اور شعرائے عصر میں سے کسی کو چوہا کسی کو سانپ کسی کو بچھو کسی کو کنکھجورا وغیرہ وغیرہ کہا ساتھ ہی ایک حکایت لکھی کہ ایک دامن کوہ میں ایک خونخوار اژدر رہتا تھا جنگل کے حشرات الارض جمع ہو کر اس سے لڑنے لگے۔ جب سامنا ہوا تو اژدر نے ایک ایسا دم بھرا کہ سب فنا ہو گئے۔ اس قصیدہ کا نام اجگر نامہ قرار دیا اور مشاعرہ میں لا کر پڑھا۔ محمد امان نثار شاہ حاتم کے شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے فی البدیہہ ایک قطعہ کہا۔ اور اسی وقت بر سرِ مشاعرہ پڑھا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر

حاضرین نے خوب داد دی اور خوب قہقہے اڑے۔

(آبِ حیات)

میر سے دوسرے ہم عصر شعرا کی چشمکیں تذکروں میں محفوظ ہیں بقا کی میر صاحب کے سامنے کوئی حقیقت نہ تھی چنانچہ بقا نے ایک شعر کہا ؎

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں
ٹکڑے جگر اُن کے بستے ہیں دوابے میں

اگرچہ میر کا یہ شعر جس میں دوابہ کا مضمون ہے بہت پہلے سے کہا ہوا ہے، لیکن بقا نے سرقہ کا الزام لگا کر خوب تشہیر کی میر کا شعر یہ ہے ؎

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

بقا نے جب یہ شعر سنا تو جواب میں کہا ؎

میر نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا
اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
یا خدا! میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے



میر تقی میر

اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو

صاحب مجموعہ نغز نے کہا ہے: مثنوی در ہجو میر خوب گفتہ چوں تحریرش تماماً بطول می کشید یک بیت اکتفا آمد

(مجموعۂ نغز)

جرأت آنکھوں سے معذور تھے ایک دن انشا سے ملاقات ہوئی تو انشا نے ان کے چہرے کے رنگ سے فکر کے آثار نمایاں دیکھے۔ انشا نے مزاج پرسی کے بعد فکر کی وجہ دریافت کی۔ تو جرأت نے کہا کہ ایک مصرع ہوا ہے، لیکن دوسرا مصرع جیسا چاہتا ہوں ذہن میں نہیں آ رہا۔ انشا نے کہا کہ بھئی ہم بھی تو وہ مصرع سنیں۔ جرأت نے یہ مصرع پڑھا ؎

اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی

انشا نے فی البدیہہ کہا۔ ع

اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

بقول خواجہ عشرت: "میاں جرأت برہم ہو گئے اور لاٹھی لے کر دوڑے مگر یہ ہوا ہو گئے۔"

(آبِ حیات، بزمِ خیال)

نوابین کے دربار میں چشمکیں تھیں۔ سعادت علی خاں کا دور تھا کہ ایک دن جان بیلی صاحب ریزیڈنٹ اور نواب مرزا انتظام

تھے۔ اثنائے گفتگو میں نواب صاحب نے کہا: ہجر بالفتح۔ جان بیلی صاحب نے کہا خلافِ محاورہ ہے۔ سعادت علی خان بولے کہ ٹھیر لغت کے اعتبار سے جب درست ہے تو استعمال میں کیا مضائقہ ہے۔ اتنے میں سید انشا آگئے۔ نواب نے کہا کہ کیوں سید انشا ہجر ہجر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ انھیں خبر نہ تھی کہ اس پر پہلے سے گفتگو ہو رہی ہے۔ بے ساختہ کہا کہ ہجر بالکسر ہے اور ساتھ ہی سعادت علی خاں کی تیوری تاڑ گئے اور فوراً بولے جب ہی تو جامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

شبِ وصل است طے شد نامۂ ہجر
سلامٌ ہی حتّٰی مطلع الفجر

یہ سنتے ہی سعادت علی خان شگفتہ ہو گئے اور اہلِ دربار ہنس پڑے۔

جان بیلی صاحب کے ساتھ علی نقی خان میر منشی ریذیڈنٹ بھی نواب سعادت علی خان کے دربار میں آیا کرتے تھے اثنائے گفتگو میں کسی کی زبان سے نکلا: ؏

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

انھوں نے کہا کہ گلستان کے ہر شعر میں مختلف روایتیں ہیں اور لطف یہ کہ کوئی کیفیت سے خالی نہیں چنانچہ ہو سکتا ہے ؏

شاید کہ پلنگ خفیہ باشد

سعادت علی خان نے سید انشا کی طرف دیکھا انھوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور میر منشی صاحب بجا فرماتے ہیں۔ غلام نے بھی ایک نسخۂ گلستان میں دیکھا ہے ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست
شاید کہ پلنگ خفیہ باشد

بلکہ وہ نسخہ بہت صحیح اور محشی تھا۔ اس میں گفتہ اور نہفتہ کے معنی بھی لکھے تھے۔ (بزمِ خیال)

خاقانیِ ہند حضرت ذوق نے ایک مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جس کا مطلع تھا ؎

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کے
ایما یہ ہے کہ بھیج دو آنکھیں نکال کے

شاہ نصیر نے کہا میاں ابراہیم، پھول بٹوے میں نہیں ہوتے۔ یوں کہو،

نرگس کے پھول بھیجے ہیں دونے میں ڈال کے

ذوق نے کہا کہ دونے میں ڈالنا، نہیں کہتے، دونے میں رکھنا، بولتے ہیں پھر یوں کہئے شاہ نصیر نے کہا۔ ؏

بادام یہ جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کے

شاہ نصیر اور ذوق میں معاصرانہ نوک جھونک کی مثالیں تذکروں میں بھری پڑی ہیں۔ منشی فیض پارسا کے منعقدہ مشاعرے میں ایک دفعہ مشاہیر شعرائے شیریں سخن شاہ نصیر، مومن خان مومن اور شیخ ابراہیم ذوق تھے۔ اپنے اپنے شاگردوں کے ساتھ موجود تھے۔ شاہ نصیر انھیں ایام میں سفرِ لکھنؤ سے معاودت کر کے شاہ جہاں آباد میں آئے تھے انھوں نے دو غزلیں جن کی زمین تازہ تھی مشاعرے میں پڑھیں۔ ایک غزل کا مطلع اور دوسری کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہم پھڑک کر توڑتے ساری قفس کی تیلیاں
پر نہ تھیں اے ہم صفیر و لپے بس کی تیلیاں

برہمن اپنے بتوں کو بہ خدا سجدہ نہ کر
آدم مردہ ہیں بے گور و کفن پتھر کر

دونوں غزلوں کی بہت تعریف ہوئی۔ بعض شعرا نے اس ستائش سے ناک بھوں چڑھائے اور اپنے اچھے کہنے والے شاگردوں کو ان دونوں زمینوں میں شعر کہنے کو اکسایا۔ خیر الدین یاس نے دوسری زمین میں ایک شعر خوب کہا ؎

مرہم سنگ جراحت سے بھرے اپنے گھاؤ
کب کے مشتاق تھے زخموں کے دہن پتھر کے

یہ بات شاہ نصیر کو سخت ناگوار گزری اور پہلی زمین میں قریب قریب پچاس غزلیں کہیں اور اپنے شاگردوں

میں بانٹ دیں۔ اور پھر انھوں نے مشاعروں میں انھیں پڑھا اور اس سے حسد کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ پھر کیا تھا، ہر مشاعرہ میں ان زمینوں پر شعر کہے جانے لگے اور یہ التزام مہینوں چلتا رہا۔ بعض بعض چھبتیوں نے چوٹیں کیں جنھیں شیخ صاحب کے طرفدار یہ سمجھے کہ یہ سب کچھ شاہ صاحب کے اشارے سے ہوتا ہے۔ زیادہ تر یہ ہوا کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے نے یہ شعر پڑھا ؎

گرچہ قندیں سخن کو مزہ لیا تو کیا ہوا
نمانچے میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

بعض کہتے ہیں کہ یہ شعر لالہ گھنشیام داس آسی نے پڑھا تھا۔ آخر یہ مشاعرہ شاندار رہا۔ بقول مولانا امداد صابری ذوق نے اپنے قصیدے کا جب یہ شعر پڑھا ؎

چق ترے دالان کی نازک بہت ہے نازنیں
کیا لگا ئیں اس میں ہیں پائے مگس کی تیلیاں

شاہ نصیر کے شاگردوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ یہ سمجھے کہ شاہ صاحب پر پھبتی کسی گئی ہے۔ شاہ نصیر کے ایک شاگرد نے فوراً اس کا جواب دیا ؎

آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا اس پر بھلا
یار کی چلمن ہوا در پائے مگس کی تیلیاں

شیخ صاحب یہ وہ چلمن ہے کہ جس میں بے دریغ
باندھئے گر ہو سکے تارِ نفس کی تیلیاں

ذوق اپنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے
قافیے میں گر نہ ہوں حضرت کے بس کی تیلیاں

(آبِ حیات و ذوق۔ سوانح اور انتقاد)

مرزا جوان بخت بہادر شاہ کے صاحبزادے کی شادی کے موقع پر غالب نے سہرا کہا۔ سہرا بڑا زوردار تھا اور شعری محاسن سے مملو۔ مقطع یہ تھا ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں



بہادر شاہ ظفر

دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

مقطع سے بادشاہ کا خیال ہوا کہ مقطع میں ہم پر چشمک کی گئی ہے۔ گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ذوق جب تشریف لائے تو بادشاہ نے ان کو بھی سہرا دکھایا اور فرمائش کی کہ اس سہرے کے جواب میں تم بھی سہرا کہہ دو۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا۔ ذوق وہیں بیٹھ گئے اور سہرا لکھا۔ مقطع میں انھوں نے بھی اسی چشمک سے کام لیا جس سے غالب نے لیا تھا ؎

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دو اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

اربابِ نشاط نے جو شاہی ملازم تھے سہرے کی خوب تشہیر کی۔ کوچہ و بازار میں سہرے کے شعر پھیل گئے۔ غالب بڑے اداشناس تھے۔ حالات کو اپنے مطابق نہ پا کر فوراً ایک قطعۂ معذرت لکھا اور حضور سے گزرانا۔ قطعۂ معذرت کے

چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

یہ معذرت نامہ غالب کی مجبوری کی ایک ایسی پکار ہے جو اب تک زندہ ہے۔ اگر غالب معذرت نہ لکھتے تو خدا جانے بہادر شاہ ظفر اس کی اس چشمک کا جو ذوق کے متعلق غالب نے سہرے میں کہی تھی، کیا نتیجہ نکلتا۔

غالب ایک دفعہ بہت قرض دار ہو گئے قرض خواہوں نے نالش کر دی۔ مفتی کے حضور میں پیش ہوئے اور عدالت کے سامنے یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

جب ایک آفتِ ناگہانی میں مبتلا ہو گئے اور چند روز جیل کے مہمان ہوئے۔ کپڑے میلے ہو گئے جوئیں پڑ گئیں۔ ایک دن بیٹھے جوئیں چن رہے تھے کہ رئیس عیادت کے لئے آئے۔ جب یہ حال دیکھا تو طنزاً کہا کہ آپ کا مزاج کیسا ہے تو اپنی شگفتہ مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا ؎

ہم غم زدہ جس دن سے گرفتارِ بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن قید سے رہائی اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا۔ تو کرتہ وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا ؎

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(آبِ حیات)

خواجہ آتش نے جب ناسخ کی غزلوں پر غزلیں کہنا شروع کیں تو ناسخ نے چوٹ کی اور یہ مطلع لکھا ؎

لکھ رہا ہے ایک جاہل میرے دیوان کا جواب
بومسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآن کا جواب

جب اس مطلع کی بھنک آتش کے کانوں میں پہونچی، تو فی البدیہہ یہ شعر جواب میں کہا ؎

کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیوان کا جواب
جس نے دیوان اپنا ٹھہرایا قرآن کا جواب

ناسخ کا رنگ کالا تھا۔ لوگ دم کٹے بھینسے کی پھبتی کسا کرتے تھے۔ ایک دفعہ اسی رنگ و روغن کی مناسبت سے آتش نے ایک مطلع کہا ؎

رو سیہ دشمن کا یوں پاپوش سے پیچھے دگار
جیسے سلہٹ کی شمشیر پر زخم ہو شمشیر کا

ناسخ نے نہایت منکسر المزاجی کے ساتھ اس کا جواب یوں لکھا ؎

میں گو کہ حسنِ ظاہری میں مثلِ ماہ نہیں

ہزار شکر کہ باطن مرا سیاہ نہیں

ناسخ کے شاگرد رشید نواب فقیر محمد گویا نے اپنے استاد کی پاس دری میں ایک مطلع لکھا ؎

بے یقیں ہو تو دیکھے گیسوئے زلف چراغ
آگے گلے کے بھلا روشن ہے کیونکر چراغ

اس کا جواب وزیر علی صبا نے جو آتش کے ارشد تلامذہ میں سے تھے کیا خوب کہا ؎

فروغِ حسن پہ کب زور زلف چلتا ہے
یہ وہ چراغ ہے کالے کے آگے جلتا ہے

اسی طرح شیخ ناسخ ایک مشاعرے میں اس وقت پہونچے جب جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ مگر خواجہ آتش اور چند دوسرے شعراء ابھی موجود تھے۔ یہ جا کر بیٹھے تعظیم بھی اور مزاج پرسی کے بعد کہا جناب مشاعرہ تو ہو چکا ہے، لیکن سب کو آپ کا اشتیاق ہے۔ شیخ ناسخ نے فوراً یہ مطلع پڑھا ؎

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں
شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

چونکہ نام بھی امام بخش تھا۔ اس لئے اہلِ جلسہ نے نہایت تعریف کی، لیکن خواجہ آتش کو اپنے ہمعصر کی دون پر صبر نہ آیا اور اس کے جواب میں فوراً طنزاً یہ مطلع موزوں کر کے پڑھا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفہ میں بازی غلام نہیں

خواجہ وزیر علی بھی موجود تھے۔ انھوں نے اس کے جواب میں وہ مطلع پڑھا کہ ناسخ اچھل پڑے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مطلع لاجواب ہے ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

نواب معتمد الدولہ بہادر ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کے مشاعرے لکھنؤ میں بڑی دھوم سے ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مشاعرے کی طرح ایک روز پیشتر آتش کو بھیجی۔ آتش نے کہا کہ شاید معتمد الدولہ بہادر کو ہمارا امتحان منظور ہے۔ غزل کہی۔



خواجہ آتش

تلوار کمر میں لگائی۔ بنکے دار ٹوپی زیبِ سر کی شاگردوں کا ہجوم غفیر ساتھ لیا اور مشاعرے میں اس شان سے پہونچے کہ حاضرین کے کان کھڑے ہو گئے۔ مشاعرہ نواب نے جو نیا مکان تعمیر کرایا تھا اس میں تھا۔ جب شمع سامنے آئی تو آتش یوں گہر فشاں ہوئے ؎

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

مطلع تھا بر محل مشاعرے میں ایک دھوم مچ گئی۔ احباب تو احباب دشمن کی زبان سے بھی واہ نکل گئی۔ نواب صاحب موصوف نے خلعت عطا فرما کر بڑی عزت سے رخصت کیا۔

ایک روز نواب صاحب کے ہاں مشاعرہ تھا وہ ناسخ کے معتقد تھے۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ جب شیخ ناسخ غزل پڑھ چکیں تو انھیں بر سرِ مشاعرہ خلعت دیں۔ یا لوگوں نے خواجہ آتش کے پاس مصرع بھیجا انھیں اس وقت مصرع پہونچا جب ایک دن مشاعرے میں باقی تھا۔ خواجہ صاحب بہت خفا ہوئے کہ اب لکھنؤ رہنے کا مقام نہیں۔ ہم نہ رہیں گے۔ شاگرد جمع ہوئے اور کہا آپ کچھ خیال نہ کریں نیاز مند حاضر ہیں۔ دو دو شعر

کہیں گے تو صدہا شعر ہو جائیں گے۔ لیکن شاگردوں کی استدعا کا کچھ خیال نہ کیا خلیہ میں جا بیٹھے اور غزل کہہ کر باہر آئے۔ مشاعرہ میں گئے تو ایک قرابین بھی بھر کر لیتے گئے۔ بیٹھے ایسے موقع پر کہ عین مقابل شیخ صاحب کے تھے۔ اوّل تو آپ کا انداز ہی بانکے سپاہیوں کا تھا۔ اس پر قرابین بھری سامنے رکھی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہیں بار بار قرابین اٹھاتے تھے جب شمع سامنے آئی تو سنبھل کر بیٹھے اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کر کے پہلے یہ مطلع پڑھا ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

گو رشک سے حسد سے نہ دے داد منصفی
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

غرض کہ ساری غزل میں کہیں ان کے بے باک ہونے پر کہیں ذخیرۂ دولت پر کہیں ان کے سامان امارت پر چوٹیں کی تھیں۔ شیخ صاحب بچارے دم بخود تھے۔ نواب صاحب ڈرے کہ خدا جانے یہ اُن پر قرابین خالی کریں یا سیٹھ صاحب کے پیٹ میں آگ بھر دیں۔ اسی وقت داروغہ کو اشارہ کیا کہ دوسرا خلعت خواجہ صاحب کے لئے تیار کرو۔ غرض دونوں صاحبان کو برابر خلعت دے کر رخصت کیا۔

(آب بقا، بزم خیال)

خواجہ عشرت نے مولوی فصیح اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس زمانے میں جو مشاعرے ہوتے تھے۔ ان میں ایک قافیہ لازمی قرار دیا جاتا تھا۔ ع

اپنے بیمار سے بھاگو نہ مسیحا ہو کر

اس میں "میلا" کا قافیہ لازمی قرار دیا تھا۔ جو قافیہ لازمی ہوتا تھا۔ اس پر سب شاعر زور دے کر کہتے تھے۔ نواب سید محمد خان رند نے اس میں غزل کہی۔ اصلاح کے واسطے لائے کہنے لگے۔ استاد مشروط قافیہ میں نے اپنے حصے کا لکھا ہے اور بہت ناز سے پڑھا ؎

اگری کا گماں شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

تمام غزل پر اصلاح دی اور کہا ذرا ٹھہرو صبا آتا ہوگا (صبا مراد ہے) اس کا قافیہ بھی سنتے جاؤ۔ تھوڑی دیر میں میر وزیر علی صبا آئے۔ آتش نے پوچھا غزل مشاعرے کی لائے ہو۔ عرض کیا جی ہاں۔ کہا پڑھو۔ صبا نے کہا نواب صاحب بیٹھے ہیں ان کے سامنے میں بھلا غزل پڑھ سکتا ہوں کہنے لگے کیوں کیا نواب صاحب چور ہیں۔ اچھا ایک قافیہ میلا ہو کر پڑھ دو۔ صبا نے کہا ؎

باغباں بلبل کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اترا کبھی میلا ہو کر

لیجیے دیکھئے نواب صاحب شعر اس طرح کہتے ہیں۔

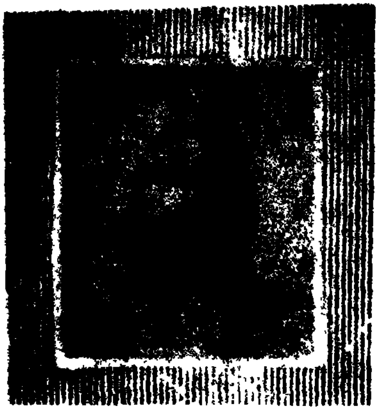
(رند اور صبا دونوں آتش کے شاگرد تھے) (آب بقا)

لکھنؤ کے ایک بڑے مشاعرے میں حسن اتفاق سے ناسخ و آتش مع اپنے شاگردوں کے تشریف لائے تھے، میاں مصحفی استاد آتش سے بھی وعدہ تھا۔ مگر وہ مشاعرے میں ابھی نہیں آئے تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ ایک نومشق لڑکے نے ایک مطلع پڑھا ؎

جس بے دہن سے میں کروں تقریر بول اٹھے
مجھ میں کمال یہ ہے کہ تصویر بول اٹھے

اس پر مشاعرے میں ایک قیامت برپا ہو گئی اور ناسخ مرحوم نے کئی بار اس مطلع کو پڑھوایا اور خلاف معمول بے حد داد دی۔ اس لڑکے کے پڑھ چکنے کے بعد مشاعرے میں میاں مصحفی بھی تشریف لائے۔ اہل بزم تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور صدر میں آپ کو جگہ دی۔ شیخ صاحب نے اپنے دل میں یہ عزم کر لیا کہ جب استاد مصحفی کی باری آئے تو اُن کو نیچا دکھاؤں چنانچہ جب سب کے آخر میں شمع گردش کرتی ہوئی آئی ناسخ نے کہا۔ آپ کے تشریف لانے سے قبل (لڑکے کی طرف اشارہ کر کے) اس لڑکے نے ایسا بے مثل مطلع پڑھا جس کی تعریف سے زبان قاصر ہے۔ مصحفی نے کہا۔ ہاں ایسا پڑھا ہوگا۔ کہا میری خواہش ہے کہ آپ بھی سن لیں۔ یہ کہہ کر اشارہ کیا اور اُن کے ایک شاگرد نے شمع اٹھا کر اس لڑکے کے سامنے رکھ دی اور شیخ صاحب نے لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہاں میاں اپنا مطلع ذرا استاد کو بھی سنا دو۔ لڑکے نے پھر وہی مطلع پڑھا۔ آتش مرحوم اپنے استاد کے آگے سے شمع اٹھوا لینے پر آگ بگولہ ہو گئے اور ناسخ سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا اک غلط مطلع کی اس قدر داد دی جاتی ہے۔ تصویر کا بے دہن ہونا غلط ہے۔ اسی وقت اس مطلع پر اصلاح دی اور لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا کہ میاں یوں پڑھو ؎

جس بے زباں سے میں کروں تقریر بول اٹھے
مجھ میں کمال وہ ہے کہ تصویر بول اٹھے



مرزا داغ دہلوی

آتش کی برجستہ طبع پر میاں مصحفی مسکرائے اور ناسخ کو ندامت ہوئی۔ (بزم خیال)

پنڈت دیا شنکر نسیم اور شیخ ناسخ ایک مشاعرے میں داد سخن دے رہے تھے کہ ناسخ نے کہا، پنڈت جی! ایک مصرع کہا ہے دوسرا مصرع نہیں ہوتا کہ پورا شعر ہو جاتے۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ فرمایئے۔ ناسخ نے مصرع پڑھا ؎

شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا

اُن کے منہ سے یہ مصرع نکلنے کی دیر تھی کہ یہاں دوسرا مصرع تیار تھا۔ ع

تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

اس مصرع کا سننا تھا کہ حاضرین جلسہ پھڑک اٹھے، اور ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین و آفرین بلند ہوئے۔ اسی طرح ایک دوسرے مشاعرے میں ایک شخص نے ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرع یہ تھا۔ ع

جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

پہلا مصرع کچھ ڈھیلا سا تھا نسیم کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ دوسرا مصرع تو خوب ہے، لیکن پہلا مصرع ٹھیک نہیں۔ وہ صاحب بھی کچھ جلے تن تھے۔ اُن کے کان تک یہ بات پہونچی تو جھلا کر بول اٹھے کہ اچھا آپ ہی اس سے

بہتر مصرع کہہ دیجئے اس وقت دوسرا مصرع موزوں کرکے سُنا دیا ع

تیرہ دل کی بزم میں جامِ شراب آتا نہیں
جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

ناسخ و آتش کی نوک جھونک تو مشہور ہے، لیکن کبھی کبھی دونوں بزرگوں کے شاگرد بھی آپس میں الجھ پڑتے تھے ناسخ سے نسیم کا یا نسیم سے ناسخ کی فرمائش محض چشمکیں ہی ہیں ورنہ ناسخ پہلوانِ سخن کیا وہ مصرع پر مصرع لگانے سے عاجز ہوا سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

میر انیس برسرِ منبر تھے کہ جب یہ مصرع پڑھا ؎

بحرِ علیؑ کے گوہرِ یکتا حسینؑ ہیں

لفظ 'بحر' میں ذم کا پہلو تھا (بہرے) سمجھا جاتا تھا۔ کسی نے ٹوکا، تو میر انیس نے یہ لفظ بدل دیا اور کہا۔ ع

کانِ علیؑ کے گوہرِ یکتا حسینؑ ہیں

(کان) میں ذم کا پہلو تھا (کانے) سمجھا جاتا تھا پھر ایک آواز آئی۔ میر انیس نے اس لفظ کو بھی بدل دیا اور کہا ؎

گنجِ علیؑ کے گوہرِ یکتا حسینؑ ہیں

لفظ "گنج" میں نقص تھا "گنجے" کسی نے اس لفظ کو چلا کر مجلس میں دُہرایا اور پہلوِ ذم کی طرف اشارہ کیا۔ میر انیس نے اُسے بھی بدل دیا اور کہا۔ ع

کنزِ علیؑ کے گوہرِ یکتا حسینؑ ہیں

اس مصرع کے بعد پھر کہیں سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔

(مشاطۂ سخن)

نواب مرزا خان داغ جب پہلے پہل رام پور آئے، تو اُن کو اصطبل کی داروغائی ملی۔ اہلِ کمال کے تو دشمن ہر جگہ ہوتے ہیں اور تو کچھ بن نہ پڑا، تو لوگوں نے پھبتیاں کہنا شروع کیں کسی صاحب نے حماقت کی اور یہ شعر کہا ؎

شہرِ دہلی سے آیا اک مشکی
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

(بزمِ خیال)

مولانا سید سبحان اللہ خان صاحب رئیس گورکھپور کا قیام جبکہ لکھنؤ میں تھا۔ اور لسان الملک حضرت ریاض بھی اُن کے مہمان تھے۔ کچھ شعر و شاعری کے چرچے ہو رہے تھے دورانِ گفتگو میں مولوی صاحب موصوف نے کسی استاد کا یہ بے مثل مطلع پڑھا ؎

جس میں سے تو نے دی تھی مجھے کل اٹھا تو لا
ساقی مئے الست کی بوتل اُٹھا تو لا

اس مطلع کی داد حاضرین کے علاوہ حضرت ریاض نے بھی دی۔ مولوی صاحب نے حضرت ریاض کو ان ہی قافیوں میں مطلع کہنے کی فرمائش کی۔ ریاض نے فی البدیہہ کہا ؎

اتری ہے آسمان سے جو کل اٹھا تو لا
طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا

اس مطلع کو سُن کر مولوی صاحب لوٹ گئے بڑی دیر تک ایک کیفیت طاری رہی۔ بار بار یہ مصرع جھوم جھوم کر پڑھا گیا۔

شاعرانہ و معاصرانہ چشمکوں کے چند نمونے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن میں طعن تشنیع، سب و شتم، ہنسی، دل لگی، پھبتی ہجو کے علاوہ مشاعروں میں اساتذہ اور ان کے شاگردوں کی نوک جھوک کا بھی ذکر ہے۔ ایسی چشمکوں کو انتخاب میں نہیں لیا گیا کہ جن سے کسی کی دل آزاری ہو۔ یا جو اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ گرفت ہوں۔ درباری شعراء کی نوک جھونک اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی مثالیں بھی یہاں ملیں گی، لیکن مصحفی اور انشا کے سوانگ رچانے والی روایتوں کو ہم نے نہیں لیا۔ کہیں کہیں شعراء میں جنگ و جدال کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ ہم نے کوشش کی کہ اُن روایات سے بھی پہلو تہی کریں۔ شاعرانہ چشمکیں ایک طویل مضمون ہے ہم نے اختصار کو پیشِ نظر رکھ چند نمونوں پر اکتفا کیا۔ جہاں جہاں سے یہ مواد حاصل کیا گیا ہے، اس کی نشان دہی کر دی ہے۔ ....●●

سر تیج بہادر سپرو کا بستر مرگ سے اردو کے بارے میں آخری خط

• خالد صدیقی



سر تیج بہادر سپرو ہندوستان کی سیاست میں
ممتاز ترین فرد اور بلند پایہ راہنما اور رہبر کا درجہ حاصل
کرچکے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برطانیہ میں انھیں دنیا کے ان
چند لوگوں کی صف میں جگہ دی گئی ہے، جنھوں نے قوموں
کے مزاج کو سمجھا اور ان کی رگوں میں اپنا خون دوڑایا۔
سر سپرو ۸ر دسمبر ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ اور ۲۰ر جنوری
۱۹۴۹ء میں رحلت فرما گئے۔ ۷۵ سال کے اس عرصے
میں انھوں نے کم و بیش ۵۰ سال اردو کے لئے وقف
کر دیئے۔

ان کے لئے حلیف اور حریف دونوں ہی اس بات
پر متفق ہیں کہ وہ ایسے دانشور تھے جنھیں دیانت دار
ہونے کا فخر بھی حاصل تھا۔ سر سپرو نے عدالت کے
میدان میں سیاست سے زیادہ نام اور شہرت حاصل کی
لیکن دیانت داری یہاں بھی قائم رہی۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ
میں ابتدائی دنوں میں سات سال تک کوئی مقدمہ اس لئے
نہ مل سکا کہ انھوں نے جھوٹے مقدمات کے لئے دلالوں
کا سہارا نہیں لیا۔ پھر اس میدان میں وہ نام کمایا کہ
۱۹۲۰ء میں وائسرائے کونسل میں مشیر قانون کے عہدے
پر فائز کئے گئے۔ اس دور میں یہ اقتدار کسی ہندوستانی
کے لئے معراج جیسا ہی تھا۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۶ء تک وہ
امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۱۹۳۱ء میں گاندھی
اِروِن معاہدہ بھی انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے جس
نے گول میز کانفرنس میں مہاتما کی شرکت کے لئے راہیں

ہوا رہیں۔ ان تینوں کانفرنسوں میں خود سر سپرو نے بھی شرکت کی۔

سیاسیات سے قطع نظر انھیں اُردو سے شاید جتنا قلبی تعلق تھا وہ کسی اور شخص کے حصے میں نہیں آیا۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں علالت کے دوران ایک وید کی شدھ ہندی بولنے پر اس قدر ناراض ہوئے کہ علاج تو کجا اسے حال بتانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے جو کچھ کمایا خرچ کر دیا۔ ان کے مکان پر شام کو ایک شاہانہ دربار ہوتا تھا جس میں اُردو شاعری، الفاظ، محاورات پر گفتگو ہوتی تھی۔ انھیں اقبال سے عشق تھا، دونوں ہی ہم نسل یعنی کشمیر کے سپرو خاندان کے فرد تھے۔

سر تیج بہادر نے بستر مرگ سے ایک خط آنجہانی جواہر لال نہرو کو لکھا جس میں سوائے اُردو کے مستقبل کے اور کوئی خاص بات نہیں کی گئی۔ یہ خط مرحوم نے ۲ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو لکھا اور ۲۰ر جنوری ۱۹۴۹ء کو وہ رحلت فرما گئے۔ اس انگریزی خط کا ترجمہ پنڈت نہرو کی کتاب اے بنچ آف اولڈ لیٹرز کے صفحہ ۲۴۵ سے کیا گیا ہے جس میں غالب کا شعر مرحوم نے اردو میں ہی لکھا تھا۔

الٰہ آباد

۲ر دسمبر ۱۹۴۸ء

میرے پیارے جواہر لال جی

اخبارات میں آپ کے تمام بیانات پڑھ کر میرے دل میں آپ کی عزت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ آپ کی سالگرہ پر آپ کو تحریر کرنا چاہتا تھا لیکن ان دنوں میری حالت بہت خراب تھی۔ اب میں آپ کو اپنی نیک خواہشات غالب کے ایک غیر فانی شعر کے روپ میں ارسال کر رہا ہوں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

زبان کے مسئلے پر میں یوپی کے چند کانگریس ہمنواؤں کے رویّہ سے قطعی خوش نہیں ہوں، ہر ممکن طریقہ سے ہندی سیکھی جائے لیکن یہ بات فراموش نہ کی جائے کہ اردو "مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے" ہندوؤں نے بھی اس زبان کے لئے بڑا سرمایہ فراہم کیا ہے۔ روہیلکھنڈ اور مغربی یوپی کے باشندے اس ہندی کو سمجھنے سے قطعی معذور ہیں جو مشرقی یوپی میں بولی جاتی ہے میں اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہوں کہ ملک کے دوسرے علاقوں کے لوگ بھی اس شدھ ہندی کے استعمال سے بیزار ہیں چونکہ وہ اسے اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے مجھے اس بات کا بھی یقین کامل ہے کہ بعض انگریزی الفاظ کے ہندی ترجمے آپ کی سمجھ سے بھی بالاتر ہوں گے چونکہ میں اس مسئلے پر جذبات سے بے نیاز ہو کر مقلصانہ رنگ میں سوچنے کا عادی ہوں، اس لئے مجھے احساس ہے کہ یہ روش ایک روز تکلیف کا باعث بنے گی بیماری اور کمزوری کی وجہ سے مجھ میں اس سے زیادہ کچھ اور لکھوانے کی طاقت نہیں ہے۔

میری بیماری میں ابھی تک کوئی اصلاح نہیں ہوئی ہے۔ مثانہ اور فالج کے امراض کے علاوہ مجھے سوءِ ہضم کی بھی شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ اکثر و بیشتر اس بیماری کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ دن میں پانچ چھ بار CATHETER (قثاطیر) کے ذریعہ پیشاب نکالا جاتا ہے۔ بہر حال مجھے ان تمام باتوں کا نتیجہ معلوم ہے جسے سامنے رکھ کر مجھے زندگی کے آخری سفر کی تمام تیاریاں مکمل کر لینا چاہئیں۔ تاہم مجھے اپنے سنا سال پر فخر ہے کہ میں نے ہندوستان کو اپنی زندگی میں آزاد ہوتے ہوئے دیکھ لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ ملک کی سربراہی آپ کو تفویض کی جا چکی ہے نیک خواہشات کے ساتھ۔

مخلص

تیج بہادر سپرو

اُردو ہندی مقدمہ

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

• شاہد صدیقی

اردو، ہندی تنازعہ آج کے دور ہی کی بات نہیں ہے۔ آج سے تقریباً ایک صدی قبل بھی اُردو کے قلب و جگر پر بھرپور وار کیے گئے تھے، لیکن یہ اردو کی سخت جانی تھی یا اس کی ہمہ گیر افادیت کہ وہ ان حملوں سے مجروح نہ ہو سکی۔ اس زبان کو ہندوستان سے مٹانے کی جہاں وہ پیدا ہوئی، بڑھی اور شمال سے جنوب تک سیلاب کی طرح پھیل گئی، ہر ممکن کوشش کی گئی۔ برطانوی حکومت کے ایوان میں درخواستوں اور وفد (اشتو)، کے انبار لگ گئے، صوبائی حکومتوں کے دروں پر دستک دی گئی تاکہ اُردو زبان کا دیس نکالا کیا جائے اور اُس کی جگہ ہندی کو فروغ دیا جائے۔ اگرچہ انگریزوں کی حکومت تھی، لیکن انگریزی زبان کو عوام پھیلانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فارسی کی جگہ تقریباً سارے ہندوستان میں اُردو سرکاری زبان کی جگہ لے چکی تھی۔ دیسی ریاستوں میں بھی، جن میں راجوں مہاراجوں کی اکثریت تھی، اُردو ہی سرکاری زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ آج بھی ہندی کی دفتری کارروائیوں میں کہیں کہیں پچھتر فی صدی الفاظ اُردو زبان کے ہی رائج ہیں۔

اُردو ہندی تنازعہ، انگریزی حکومت نے اگرچہ کوئی باضابطہ کمیشن نہیں بٹھایا۔ پھر بھی مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں کو اپنی اپنی تجاویز بھیجنے کی ہدایات جاری کیں تاکہ اُردو کے خلاف کی گئی شکایتوں کی اصلیت سامنے آسکے اور اُس کی روشنی میں مرکزی حکومت کو کسی آخری نتیجے پر پہنچنے میں آسانی حاصل ہو سکے ہندی اُردو تنازعہ کا یہ سارا ریکارڈ لکھنؤ کے اضلاعی ریکارڈ میں آج بھی موجود ہے۔

اس داستان کا سب سے پُراسرار پہلو یہ ہے کہ ہندی کو اودھ میں سرکاری مقام دلانے کی جدوجہد پٹنہ سے شروع ہوئی جو بہار کی صوبائی راجدھانی تھا۔ یہ واقعہ ۱۸۷۵ء کا ہے جب کچھ لوگ عدالتوں میں ہندی زبان کو درجۂ اوّلیت دلانے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور انھوں نے اُردو کے خلاف احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ اس احتجاج اور ہنگامہ کا تیمیلک ایسی عرضداشت کے رُوپ میں نکلا جس پر ہزاروں آدمیوں کے دستخط تھے۔ درخواست کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ بہار میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دینے کا اعلان کرے۔ پٹنہ کے ان شہریوں کی یہ درخواست اودھ کے چیف کمشنر کو ارسال کی گئی تاکہ وہ اس پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

اودھ کے چیف کمشنر نے اس مسئلے کو اور بھی وسعت دی اور اس نے دیگر صوبائی حکومتوں کو اپنی اپنی تجاویز ارسال کرنے کے لئے مراسلے روانہ کر دیئے۔ اس ذیل میں بہت سی ایسی رائیں اور بہت سے ایسے تجزیات منظرِ عام پر آئے جو آج کی فضا میں تعجب خیز اور چونکا دینے والے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ پٹنہ کے شہریوں کی وقتی ہنگامہ آرائی سرد پڑ گئی لیکن اس نے حکومت کے ایوانوں میں ہل چل مچا دی، طوفان برپا کر دیا۔

ہندی زبان کے حق میں جو آج سرکاری زبان بن چکی ہے۔ جو آراء موصول ہوئیں اُن کے قطعِ نظر میں کچھ ایسے صوبوں کی رائے پیش کرنا چاہتا ہوں جو اُردو طبقے کے قلبی ناسور کو کسی حد تک مندمل کر سکتا ہے۔

بنگال کے صوبے نے اس تنازعہ سے کسی زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بنگالیوں کے خیال میں ہندی اور اُردو دونوں علیحدہ علیحدہ زبانیں نہیں تھیں اس لئے انھوں نے دونوں میں کسی فرق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ حکومت اودھ بھی اسی نتیجہ پر پہونچی کہ ہندی کو اُردو زبان پر ترجیح دینا مناسب نہیں۔

ڈبلیو۔ اے کرافٹ، انسپکٹر آف اسکولز نے ۱۶ر جولائی ۱۸۷۵ء میں مرکزی حکومت کو ایک نوٹ ارسال کرتے ہوئے اس میں تحریر کیا۔

ہندی اور اُردو کو دو زبانیں قرار دینا سخت ترین غلطی ہوگی۔ اس طرح یہ تنازعہ دائمی ہو جائے گا حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی زبان کی دو شاخیں ہیں۔ ایک دیہاتی (ہندی) زبان ہے دوسری شہری (اردو)

اودھ کے چیف کمشنر کے سکریٹری نے اپنے مراسلہ ۳۲ مورخہ ۱۸۷۵ء میں ایک چونکا دینے والی بات لکھی جس کے نتائج آج سب کے ہی سامنے موجود ہیں اس نے لکھا تھا۔

"اُردو کے خلاف ہندی کو لانا ایک اہم سیاسی غلطی کے ارتکاب کے مترادف ہے کیونکہ اس کے نتائج اس غیر مطمئن طبقہ پر زیادہ اثر انداز ہوں گے جو پہلے سے ہی اس بات کا شاکی ہے کہ اس کا ذریعہ معاش محدود ہے۔ اس اقدام سے اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں سے باہر نکال دیئے جائیں گے۔"

محکمہ تعلیم کے یورپین ڈائرکٹر نے جو ان دنوں لکھنؤ میں مقیم تھا اپنے ایک مراسلے مورخہ ۲۸ر مارچ ۱۸۷۵ء میں لکھا تھا کہ کچھ لوگ تو اس میں شک کرتے ہیں کہ یہ زبان (ہندی) عوام بولتے بھی ہیں یا نہیں۔ ڈائرکٹر موصوف نے پٹنہ کے شہریوں کی عرضداشت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا۔

"ایسی کوئی زبان اودھ کے رہنے والے نہیں بولتے۔"

اس کے علاوہ مذکورہ مراسلے میں یہ بھی تحریر تھا۔

"میری بنگال کی پانچ سالہ ملازمت کے



دوران میں نے ہندی کے بارے میں کچھ اتنا سن رکھا تھا کہ میں اودھ آتے وقت یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اُردو بدیسی زبان ہے لیکن یہاں (لکھنؤ) آکر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔"

اودھ کے مغربی ضلعوں کے محکمہ تعلیم کے ایک ذمہ دار نے اپنے ایک خط مرقومہ ۲۵ فروری ۱۸۷۶ء میں ایک ایسا انکشاف کیا جو اُردو کی عظمتوں اور اس کے ذریعہ کی گئی خدمتوں کی تحقیق و تلاش کرنے والے مؤرخین کے لئے اہم ترین معلومات کا خزانہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے لکھا تھا اودھ میں شائع ہونے والے تمام اخبارات اور جریدے سب کے سب اُردو زبان میں شائع

ہوتے ہیں اور مثال کے طور پر ایک بھی اس زبان میں شائع نہیں ہوتا جسے ہندی کہا جاتا ہے۔

اسی خط میں اس تلخ انکشاف کے ساتھ اس نے مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ یہ بات واضح کرتی ہے کہ اودھ کے عوام کون سی زبان استعمال کرتے ہیں اور یہ کہ اودھ میں کوئی ایسا طبقہ نہیں ہے یہاں تک کہ برہمن بھی نہیں جو اپنا کاروبار ایسی زبان میں کرتا ہو جس کا رسم الخط ناگری ہے۔

ڈپٹی کمشنر لکھنؤ نے اپنے مکتوب بہ تاریخ ۲۶ر اپریل ۱۸۷۶ء میں دو ٹوک فیصلہ دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا کہ۔

"اودھ کی زبان ہندی نہیں ہے۔
اُردو ہے"

اُن دنوں مشہور ماہر تعلیم اے تھامسن، بنگال میں انسپکٹر آف اسکولز کے عہدہ پر مامور تھا۔ اس نے اگرچہ اُردو کی بجائے ہندی کو عدالتی زبان بنانے کی سفارش کرتے ہوئے بنگالیوں کی خواہشات کا احترام کیا تھا۔ لیکن اس نے اُردو ہندی کے تنازعہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فارسی رسم الخط کی تعریف کی تھی۔ اس کے خیال میں فارسی رسم الخط بہ نسبت دیوناگری کے زیادہ افادیت سے لبریز تھا۔

۲۸ر مارچ کو محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر نے اپنے خط مذکورہ بالا ۲۸ر مارچ ۱۸۷۶ء میں ناگری رسم الخط کو شکستہ میں تحریر کئے جانے کا اہل نہ بنانے ہوئے اپنی آخری رائے ہندی کے خلاف دی اور لکھا کہ:۔

"یہی اس رسم الخط (دیوناگری) کے عدالتی زبان بننے کی اہلیت کے خلاف بیّن ثبوت ہے"

ڈائرکٹر موصوف کے اس فیصلے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُردو کا رسم الخط شارٹ ہینڈ کی بہت سی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ ان دنوں شارٹ ہینڈ اور اسٹینوگرافی کا چلن نہیں تھا اور اس کی عدم موجودگی میں اُردو تیز رفتاری کے ساتھ لکھی جانے کی وجہ سے علی الخصوص عدالتی کارروائیوں کے لئے بڑا سہارا تھی۔

خود پٹنہ کے کمشنر نے اس تنازعہ سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا اُن کے بین السطور سے کچھ بہت کچھ سوچا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے مراسلے ۲۹۰ میں جو ۸ر اکتوبر ۱۸۷۵ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ بہار کے ہندوؤں کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ بھی لکھے تھے

"اہل ہنود میں کائستھوں جیسا سلیم الطبع حلقہ جو سرکاری اور عدالتی زبان میں تقریباً اجارہ داروں جیسی حیثیت کا مالک ہے۔
اس بات کے خلاف ہے کہ ہندی زبان کو اُردو زبان پر فوقیت دی جائے"

اس مراسلے بازی میں ایک افسر اعلیٰ نے تو یہاں تک تحریر کر دیا تھا کہ ہندی زبان کو ہندوستان میں رائج کرنے کے متعلق سوچنا کچھ ایسا ہے جیسا کہ ہندوستان کی سرکاری زبان بنانے کے لئے چینی زبان کی بابت غور کیا جائے۔

ان دونوں زبانوں کے جھگڑے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انگریزی حکومت نے اس بات پر زور دیا کہ دونوں زبانوں سے الگ انگریزی کو عدالتی زبان قرار دے دیا جائے۔

اس مقدمہ کے دوران جتنی بھی رائیں موصول ہیں ان میں زیادہ تر اُردو کے حق میں تھیں لیکن رائے دینے والے تمام افسران ایک بات پر متفق تھے اور وہ یہ تھی کہ اُردو زبان میں جو فارسی اور عربی کے مشکل اور دقیق الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں انھیں ترک کر دیا جائے اور اُردو لکھتے وقت خصوصاً اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس کی لکھاوٹ عام لوگوں کے لئے قابل فہم ہو۔ ●●

اردو ادب اور ہندوستانی تہذیب

سراج انور مصطفیٰ آبادی



۱۹۴۷ء میں ہندوستان نے آزادی حاصل کرلی لیکن آزادی ملنے کے ساتھ ہی ملک بھی تقسیم ہوگیا۔ ان واقعات کا خاص اثر ہندوستانی سماج اور معاشرت پر پڑا۔ آزادی سے قبل ہی اردو ادب میں انقلاب پسند اور ترقی پسند تحریک چل رہی تھی۔ اس تحریک کے زیر اثر مصنفین نے نظم اور نثر کے میدان میں انسانی حقوق، مساوات، جمہوری اقدار اور قومی روایات پر مشتمل تخلیقات پیش کیں۔ اردو کے روایت پسند شعراء کا کلام بھی مشترکہ تہذیب کی اعلیٰ قدروں اور گنگا جمنی تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ جگر مرادآبادی نے فرمایا تھا ؎

ان کا جو کام ہے اربابِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

جگر مرحوم کی نظمیں میں قحطِ بنگال، گاندھی جی کی یاد میں، اعلانِ جمہوریت اور ساقی سے خطاب، ایسی نظمیں ہیں جو انسانی ہمدردی، مساوات، خلوص، حب الوطنی اور قومی یکجہتی کی آئینہ دار ہیں۔ "ساقی سے خطاب"

اس نظم کا ہر شعر درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

سلامت تو تیرا میخانہ، تری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

انسان کی علمی اور سائنسی ترقی بھی دنیا کو امن و سکون کا پیغام نہ دے سکی۔ جگر اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

کہاں سے جا کے پہونچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی، نہ من ساقی
وہی انسان جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا
وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

روایت سے ہٹ کر نئے انداز میں غزل کہنے والے شعراء جدیدیت کے پرستار کہلاتے ہیں۔ ان شعراء نے اپنی غزل میں نئے علائم ملکی تلمیحات ملکی ماحول۔ اور داستانوں کے علاوہ دیو مالاؤں کے کردار رنگ کو جگہ دی ہے۔ چند اشعار دیکھئے ؎

چل اے دل چل کچھ وقت گزاریں زلفوں کی امرائی میں
شاید میٹھی نیند آ جائے اس آنچل کی پروائی میں

اس پونم کی کیا بات ہے جب پوری ہوں من کی آشائیں
اک چاند گگن کے اوپر ہے اک چاند مری انگنائی میں
(عمیق حنفی)

زلفوں کے بادل بکھرائے جانے تم کس دیس بسے
غم کی دھوپ اتر آئی ہے جیون کی انگنائی میں

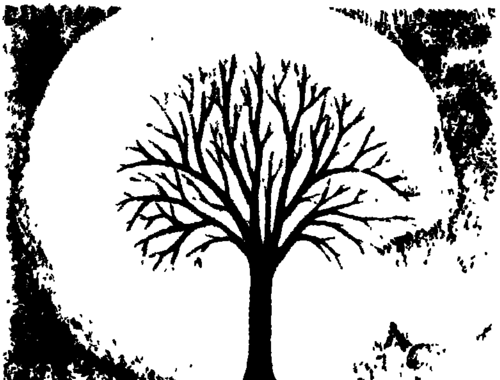
یادیں تو اُکسا دیتی ہیں بھولی بسری چوٹوں کو
آنسو آگ لگا دیتے ہیں ساون کی پُروائی میں
(بیکل اُتساہی)

اسی طرح اُردو کے ہر دور اور ہر مکتبِ فکر کے شعراء وادبا ہندوستانی تہذیب کی آئینہ داری کرتے ہیں وہ ہندوستانی فکر و ذہن رکھتے ہیں۔ وطنی رجحانات کے پیشِ نظر اردو ادب ہندوستانی تہذیب کا آئینہ دار بن گیا ہے جس پر کوئی بھی غیر ملکی ہونے کا الزام نہیں لگا سکتا۔ ضرورت ہے کہ حکومت اس زبان کو اس کا جائز حق دے۔

باہمی ربط کے سانچے میں ڈھلی ہے اُردو
ہندی گود میں نازوں سے پلی ہے اُردو

دل کی آواز یہی کہتی ہے اے اہلِ وطن
اپنی تہذیب کا عنوانِ جلی ہے اُردو

● ●



۱۹۴۷ء کے بعد اردو نظم



صدیق الرحمٰن قدوائی کے قلم سے

آزادی کے بعد وجود میں آنے والا ادب، قبل آزادی کے ادب کی ہی ایک نئی اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ آج کی نظم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس تاریخی تسلسل کو ذہن میں رکھا جائے اور ان کڑیوں کو تلاش کیا جائے جو ان دو زمانوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔

آزادی سے قبل اردو نظم دو محوروں اقبال اور جوش کے گرد گھوم رہی تھی۔ نئے ادب اور ترقی پسند تحریک نے نظم کی روایت کو ایک نیا موڑ دیا۔ بدلتے ہوئے معاشرے میں فرد اور سماج کے پیچیدہ تر ہوتے ہوئے رشتوں اور ان سے پیدا ہونے والی نئی الجھنوں کی بدولت شاعرانہ ادراک و احساس اور اس کے اظہار کی صورتوں میں زبردست تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ آزاد نظم کا فروغ، نئے اسالیب اظہار، نئی شعری علامتیں اور ایک بدلی ہوئی زبان، ساتھ ہی ساتھ نئے موضوعات جن کو چھوتا تو در کنار ان کی سمت بڑھتے ہوئے بھی تخیل کے پر جلتے تھے۔



اب اردو نظم کے مزاج کا مانوس اور مقبول حصہ بن گئے شاعری میں کلاسیکی روایات سے بغاوت محض بعض شاعروں کی جدت فکر اور طباعی کا ہی کرشمہ نہیں تھی۔ یہ رجحان سماجی سطح پر برپا ہونے والی بے شمار بغاوتوں کا ایک تسلسل تھا۔ فیض، مجاز، اختر شیرانی، میراجی، راشد کی نظم کے حسن کا سب سے بڑا راز اس بغاوت میں پنہاں ہے۔ دیہاتوں سے شہروں کی طرف یلغار، مدتوں کی بسی بسائی بستیوں کا منتقل ہونا، خاندانوں کا ٹوٹنا اور بکھرنا۔ نئے کارخانوں کا وجود میں آنا اور صنعتی نظام کا آہستہ آہستہ صدیوں کے بنے بنائے جاگیردارانہ نظام پر چھاپہ مارنا یہ سب ہماری زندگی میں ایک بے اندازہ اور بے پناہ تبدیلیوں کے امکانات لے کر آئے۔ اس تبدیلی کی تیز رفتاری نے ہست و بود فکر کی دنیا میں ایک حشر برپا کر دیا۔ یہ ہمارے دور کے حساس انسانوں کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا۔ اور شاعروں نے اسے جس طرح قبول کیا اس کا نتیجہ ہمارے دور کی نظم ہے۔

چنانچہ جدید نظم میں بڑے اہم اور قابل قدر تجربات کیے گئے۔ میراجی، راشد، فیض، سردار جعفری اور اختر الایمان نے

نظم میں جدید روایات کی بنیاد ڈالی تھی۔ نئے شاعروں نے انہیں نئی وسعت اور نئی معنویت دی۔ چنانچہ آج تکنیک کے اعتبار سے میرا جی اور راشد اور فکر و احساس کے اعتبار سے فیض اور اختر الایمان کی آوازوں کی گونج زیادہ سنائی دیتی ہے۔

آزادی کے بعد سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کی بدولت ادب کی سطح پر بھی نمایاں اور اہم تبدیلیاں نمودار ہوئیں ——— ہمارا شاعر جو شکست زنداں کا خواب دیکھا کرتا تھا اب اس خواب کی تعبیر سے دوچار ہوا۔ تقسیم ملک نے شاعر کے ضمیر کو بے چین کر دیا۔ پہلی بار شاعر نے محسوس کیا کہ کبھی بادہ و ساغر کے بغیر بھی اسے اپنی بات کہنی چاہیے۔ چنانچہ اس زمانہ میں غزل نما نظموں اور نظم نما غزلوں کا ایک بے پناہ ذخیرہ سامنے آ گیا۔ جگر جیسا شاعر اب کہنے لگا۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

جدید اردو نظم ترقی پسند تحریک کی بہت کچھ ممنون منت ہے۔ گو کہ یہ تحریک آزادی کے چند سال بعد انتشار کا شکار ہو گئی۔ مگر ترقی پسند شاعروں کا ایک گروہ جو اس پندرہ برس کے عرصے میں ابھرا تھا وہ خاموش نہیں ہوا۔ ان کے ادبی رویے میں بہت اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ترقی پسندوں کے اس طبقے میں دو قسم کے شاعر نظر آتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کی ابتدا بڑے زور و شور اور گھن گرج کے ساتھ ہوئی تھی مگر جو بہت جلد کلاسیکیت کے معیار اور روایت کے خول میں واپس لوٹ گئے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو مارکسزم کو مانتا تھا۔ مگر جس نے پارٹی ڈسپلن کی مار سے بچنے کے لیے اپنی شاعری کو اپنے خلوص ایمان کی سوگند بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ان شاعروں کو ایک عرصے تک اس لیے نظر انداز کیا گیا کہ ان کی شاعری میں [illegible] اور نعرے کی گونج نہیں تھی۔ مگر ترقی پسندوں کا یہ طبقہ جس کے سب سے [illegible] شاعر اختر الایمان ہیں آج زیادہ مقبول ہے ——— ترقی پسندوں کا ایک اہم حصہ کچھ حد تک



جاں نثار اختر



سردار جعفری



سجاد ظہیر



کیفی اعظمی

کے شاعروں کی بدولت ایک زمانے میں ترقی پسندی اور پست شاعری ایک ہی شے کے دو نام ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ آج کا شاعر اپنے آپ کو اس ترقی پسندی سے ممتاز کرنے کے لیے ترقی پسندی کو بھی رد کرنے لگا۔ حالانکہ خود اس کی شاعری کا خمیر ترقی پسندی کے دبے ہوئے شرارے سے اٹھا ہے۔ فکری اور فنی اعتبار سے فیض کی نظم "تنہائی" مجاز کی "آوارہ" اور جذبی کی "موت" آج بھی اتنی ہی جدید ہیں۔ جتنی کہ کبھی تھیں۔ ترقی پسندوں کی اس طرح کی نہ جانے کتنی تخلیقات ہیں جو اس تسلسل کی نشاندہی کرتی ہیں جو آج کی شاعری اور ترقی پسندی کے دور کی شاعری میں فطری طور پر موجود ہے۔ ایک جذباتی رو ہے جو ان کی تہہ میں نظر آتی ہے اور یہ رو ہے ادبی، تہذیبی اور سماجی سطح پر باغیانہ جرأت فکر و احساس کی رو۔

حال میں ان رجحانات کو اقلیدس کی اصطلاحوں خط مستقیم

اور خط منحنی کے تحت تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر میرے خیال میں اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ شاعر کی شخصیت سماج سے الگ نہیں بلکہ سماجی حقیقت کا ایک جزء ہے وہ شاعر جو اپنی شخصیت اور اپنے زمانے کے درمیان "من تو شدم تو من شدی" کا رشتہ قائم نہیں کر سکتے مگر اپنے آپ کو سماج کا فعال فرد بنانے کی تمنا میں شاعری کو میکانکی طور پر سماجی تبدیلی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا وہ حصہ جسے ترقی پسند سمجھا یا کہا جاتا ہے یقیناً اچھی شاعری کے معیاروں پر بھی پورا نہیں اترے گا۔ اور معمولی درجہ کی شاعری ہونے کی وجہ سے تہذیبی سطح پر وہ انقلابی رول بھی ادا نہیں کر سکے گا جس کی اس سے امید کی جاتی ہے۔ دوسری قسم کی شاعری وہ ہے جس میں شاعر کی تخلیقی فکر اور اس کا سماجی شعور دونوں ایک دوسرے سے اس طرح ہمکنار ہو جاتے ہیں کہ اس کے ہاں داخلی و خارجی حقائق کی دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا اپنا غم زمانے کا غم ہوتا ہے اور زمانے کا غم اس کے اپنے دل کا کرب و اضطراب بن جاتا ہے فیض اور اختر الایمان کے گروہ کے شاعروں کو (یا جنہیں خط منحنی کا شاعر کہا جاتا ہے) اسی رجحان کے نمائندہ میں پہلے رجحان کی نمائندگی ہند و پاکستان اور ہند و چین کی لڑائی کے سلسلے میں وجود میں آنے والی شاعری کرتی ہے۔ قومی یک جہتی بھاکڑا ڈیم، لیڈروں کی موت پر مرثیوں سے لے کر فیملی پلاننگ تک کے موضوعات کی شاعری سب اسی ذیل میں آتی ہے۔

جدید نظم نے مغرب کی تکنیک اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے فکری رجحانات کو بھی اپنایا ہے۔ عالمی ادب کے مطالعے سے نئی چیزیں سیکھنا، ہر لحظہ بہتر اظہار کی تلاش کرنا اور انہیں پاکر اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرنا صحت اور زندگی کی علامت ہے۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اکثر ذہنی کاہلی اور سہل پسندی بھی اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ دوسرے ملکوں کے فلسفیوں کے افکار کو (خواہ ان کو جنم دینے والے ہی ان سے دست بردار کیوں نہ ہو چکے ہوں) اس وجہ سے قبول کر لیا جائے کہ وہ کچھ نئے نئے سے لگتے ہیں۔ چنانچہ وجودیت کا فلسفہ جس کا جنم دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ میں ہوا تھا اردو کے بعض شاعروں کے یہاں جب ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ پہنچا تو اردو دانشور جن میں سے بیشتر کبھی ترقی پسند ہوا کرتے تھے اس طوفان میں بہتے ہوئے نظر آنے لگے۔ بیگانگی ملتوں کو اپنے سر زبردستی اوڑھنے کا بہانہ خواہ ترقی پسندی کو بنایا جائے یا وجودیت کو بالآخر شاعری کے مرتبے کا تعین تو اس حقیقت کے پیش نظر ہی ہوتا ہے کہ شاعر کے یہاں فکری — اور فلسفیانہ خلوص کتنا ہے اور اس کی شخصیت کے واسطے سے اس کے فن پر اس کا کوئی صحت مند اثر پڑا ہے یا نہیں۔ چنانچہ وہ نظم جو موجودہ حالات سے بے اطمینانی پر مبنی ہے اور جس کے پیچھے ایک بہتر زندگی کے لیے سماجی زندگی کی فعال تمنا کام کر رہی ہے وہ خواہ ابدیت کے شوق سے بے نیاز شاعری ہی تخلیق کیوں نہ ہو۔ نہ صرف آج کی عظیم شاعری ہے بلکہ اس کی عظمتوں پر پڑے ہوئے وقت کے پردے ہر دور میں اٹھتے چلے جائیں گے۔

اس دور کی نظم میں چند الفاظ کی تکرار جا بجا ملتی ہے شہر، سایہ، سورج، دھوپ، آئینہ، عکس۔ اور اس طرح کے بہت سے الفاظ نئی شاعری کی جانی پہچانی علامتیں ہیں۔ جو آج کے حساس انسان کے روحانی کرب و اضطراب کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً شہر ہمارے موجودہ سماج کی علامت ہے۔

صنعتی زندگی کی اعصاب شکن ہما ہمی اس کے جنم دیے ہوئے تہذیبی بحران اور اس کے اجتماعی ظلم و جبر کی بدولت فرد کی انفرادیت کی پامالی کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں انسانی رشتہ بہیمانہ کشاکش پر مبنی ہے۔ جہاں انسان اپنا اصلی چہرہ کھو چکا ہے۔ اس کی ذات خود اس کے سائے کی طرح جھوٹی، بے حقیقت، بے معنی بلکہ کبھی کبھی ڈراؤنی بھیانک اور قابل نفریں نظر آتی ہے۔ یہاں سورج روشنی کی علامت نہیں بلکہ سیاہ پوش ہے۔ اور دھوپ جھلسا دینے والی ننگا بھوکا کو سلب کر لینے والی آتش بار شعاعوں کا نام ہے۔

جدید نظم کی یہ علامتیں آج کے شاعر کے ایک مخصوص

ہے جدیدیت کا پیش رو بھی ہیں جو بنیادی طور پر بامقصد اور اسی لیے قابل قدر ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض شاعروں کے ہاں شخصیت پرستی کا رجحان بھی ابھرا ہے۔ ان کے ہاں اپنے گرد و پیش سے بے چینی تو ہے مگر یہ بے چینی انہیں بغاوت سے زیادہ دنیا و مافیہا سے زیادہ منہ موڑ لینے کی طرف زیادہ مائل کرتی ہے۔ یہ رجحان قرون وسطیٰ کی خانقاہیت سے بہت زیادہ قریب ہے۔ مگر شاید نئی شاعری کا یہ موڑ دیرپا نہیں۔ بلکہ ایک عارضی، اضطراری کیفیت کا اظہار ہے۔ جو ہر حساس فنکار اور دانش ور کی فکری و جذباتی نشو و نما میں کسی نہ کسی اسٹیج پر ضرور، غالب نظر آتی ہے۔ ادھر چند برسوں میں اردو شاعری کے اس عارضی موڑ کو ایک فلسفہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر چند کہ یہ کوشش لاحاصل ہے مگر اس اعتبار سے خطرناک بھی ہے کہ وہ شاعر کے فن اور پڑھنے والوں کے مذاق دونوں کو برباد بھی کر سکتی ہے۔

فرد کی تنہائی، سماج کی ساری قوتوں کا اس کے خلاف صف آرا ہونا۔ شہری زندگی کی افراتفری، جہاں کوئی کسی کا ساتھی نہیں۔ باہمی ربط اور صدیوں کی پالی پوسی انسانی قدروں کا اچانک ہوا میں تحلیل ہو جانا۔ فرد کا ایک بے جان مشین کے پرزے کی طرح چکر کھاتا اور ایسا لگتا کہ جیسے ہماری آپ کی تقدیر اور زمانے کی ہر شے کی تکمیل، کسی انجانی بے درد اور اندھی قوت کے ہاتھ میں ہے۔ ایک بٹن کے دبنے کی دیر ہے کہ نیوکلیائی طاقت انسانی زندگی کو فنا کر دے گی۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے اور کائنات کا ذرہ ذرہ بھسم ہو جائے گا۔ شخصیتوں کا بے رحم طاقتوں کے بوجھ تلے کچلا جاتا اور ہر شے کا خاتمہ دکھائی دینے لگنا۔ آج کے شاعر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق زبان، ابلاغ اور ترسیل کی دقتیں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ باہمی رشتے ختم ہو گئے ہیں۔ ایک فرد دوسرے فرد سے اس قدر دور ہو گیا ہے کہ کسی کی آواز کی گونج دوسرے تک پہنچے تو پہنچے اس کی بات کسی تک نہیں پہنچ سکتی۔ ایسی صورت میں فنکار کا فن

> **شخصیتوں کا بے رحم طاقتوں کے بوجھ تلے کچلا جانا اور ہر شے کا خاتمہ دکھائی دینے لگنا۔ آج کے شاعر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے**

اس کے جذبات کا ادھورا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زبان اور وہ شعری سانچے جو صدیوں کے تجربات نے جنم دیے تھے اب جامد ہو چکے ہیں۔ یہ وہ پتھر ہیں جن کی رگوں سے لہو شرابن کر صرف اس وقت ٹپک سکتا ہے۔ جب فنکار کے احساس کی گرمی ان کی تسلیم شدہ اور جانی بوجھی صورتوں کو پگھلا کر ان کے نئے سیوں نے تعمیر ہونے جائیں اس کی بات اگر کوئی سمجھے تو یہ سمجھنے والے کی توفیق و تقدیر پر ہے۔ شاعر کو اس سے غرض نہیں کہ اسے کوئی سمجھنے والا ہے کہ نہیں۔ اس زبان کے نہ سمجھنے والوں کو اکثر یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ یہ تو مستقبل کی زبان اور مستقبل کی نظم جنم لے رہی ہے۔ آپ ماضی کے آدمی ہیں۔ اتفاقاً حال میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لیے یہ زبان آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے اور ابلاغ کی دقتوں کا یہی سبب ہے۔ گویا کہ ہمارے جدید شاعروں کا یہ طبقہ مستقبل کی شاعری کو جنم دے رہا ہے۔ وہ مستقبل جو خود اس کے فلسفے کے مطابق بڑا تاریک ہے —— سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شاعر —— جو آج کی شہری زندگی کی ہماہمی سے سہمے ہوئے ہیں۔ اور نیلی، لال، ہری روشنیاں ان کی آنکھوں کو چکا چوند کیے دے رہی ہیں وہ بھلا مستقبل کی تاب کیسے لا سکیں گے۔ جہاں مشینیں آج سے زیادہ ترقی یافتہ ہوں گی جب مسائل آج سے زیادہ گمبھیر ہوں گے اور انسان کو سماجی رشتوں کے تعین میں اور زیادہ الجھنوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ گاؤں کی سادہ، پرسکون اور خاموش زندگی کو شہروں میں نہ پا کر اپنے وہم و گمان کی دنیا میں سمٹ جانے والے ذہنوں

انسان کی تخلیقات کو بربادی سے بچانے والی قوت جس سے وہ محروم ہیں وہ کہاں سے آئے گی۔ اس کا جواب ان شاعروں کے ہاں نہ جانے کیا ہوگا۔ میرے نزدیک تو ہر دور کی زندگی مادی اور روحانی طور پر انسانی ذہن کو چیلنج کرتی رہی ہے۔ اس چیلنج کو قبول کرکے انسان کو اس کشاکش کو قبول کرنے کی جذباتی اور روحانی صلابت عطا کرنے کا کام فنون لطیفہ اور شعر و ادب نے انجام دیا ہے۔ اور عظیم ادب خواہ وہ کسی عہد کا ہو وہی ثابت ہوا ہے جو جذباتی طور پر اپنے عہد کا مسیحا اور نئے عہد کا پیغامبر ہو۔ دراصل یہی داخلی جذباتی رو ہے جو ایک عہد کی شاعری کو اس عہد سے بلند کرکے ہر عہد کی شاعری بنا دیتی ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یہ پچھلی صدی کا شعر ہے مگر اس کی معنویت نے ہر لحظہ بدلتے نئے پن نے اسے آج کا شعر بنا دیا ہے۔ مستقبل کی شاعری حال سے رو ٹھ کر پیدا نہیں ہو سکتی۔

آج کی نظم کو نئے دور کے چند چیلنج درپیش ہیں۔ ترسیل کے یہ نئے وسائل ریڈیو ٹیلیویژن اور سینما نے چند ٹی سمتوں کو عطا کیا ہے اور اکثر یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ یہ شیطانی قوتیں فنون لطیفہ خصوصاً شعر و ادب کی دشمن ہیں۔ سائنس کے اور ستم ہی کیا کم تھے اس پر طرہ یہ کہ اس نے انسان کی خلوتوں پر بھی چھاپہ مار کر شاعروں اور ادیبوں کے لیے سارے راستے بند کر دیے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ شرفائے ادب کی مجلسوں میں ان شاعروں اور ادیبوں کو برادری سے باہر سمجھا جاتا ہے۔ جنہوں نے سینما کے میڈیم کو اپنا لیا اور اپنی شاعری کو چھپے ہوئے لفظوں سے زیادہ مغنیوں کی آوازوں اور رنگین پردوں کے ذریعے سننے اور دیکھنے والوں تک پہنچایا۔ ان نئے وسائل کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شعر و ادب کو ان طبقوں تک پہنچایا جو پڑھے لکھے نہ ہونے کی بنا پر اس سے محروم تھے۔ آج کے شاعر کو ان وسائل سے



ساحر کی "پرچھائیاں"

فائدہ اٹھانا ہوگا۔ شیکسپیر کے منظوم ڈرامے اسٹیج پر پیش کیے جانے کے باوجود ادب کا بہترین شاہکار پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ ان وسائل کا شعر و ادب سے کس طرح ناطہ مضبوط کیا جائے۔ فلمی شاعروں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ریڈیو اور ٹیلیویژن کا بڑھتا چرچا، یہ کہہ کر ختم نہیں کیا جا سکتا کہ ہن کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔

اس زمانے میں طویل نظموں میں بھی بڑے اچھے اور کامیاب تجربے کیے گئے۔ ساغر کی "انارکلی" کے بعض حصے بڑے دلکش ہیں گو کہ اس میں جگہ جگہ ناہمواری اور غیر ضروری طوالت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ لمبائی چوڑائی کی نسبت سے ہی اگر گہرائی بھی ہوتی تو یہ بڑی کامیاب نظم تھی۔ ساحر کی طویل نظم "پرچھائیاں" نہ معلوم کیوں طویل ہو گئی۔ مختصر ہوتی تو شاید اچھا ہوتا۔ اس کے بعض حصوں

پر ترقی پسندی کے اس دور کا چھاپ ہے۔ جب نظم کہنا اپنے سماجی شعور کے اظہار کے لیے بہت ضروری ہوا کرتا تھا۔ مگر سردار جعفری کی نئی دنیا کو سلام کے بعد سب سے زیادہ چونکا دینے والی طویل نظم عمیق حنفی کی "سندباد" ہے یہ نظم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ مگر مرکزی خیال ایک ہے اور وہ یہ آج کا انسان خود اپنی سرزمین پر اس طرح گزرتا ہے جیسے کہ سندباد نئی سرزمینوں سے گزرا تھا۔ یہ سندباد دراصل غالب کا غریب شہر یا —— WILSON OUTSIDER نظم کی اوپری سطح پر شدید ہونے کی کیفیت اور حیرانی کی ایک شفاف چادر پھیلی ہوئی ہے۔ جو اپنی تہ میں درد و کرب میں ڈوبے ہوئے طنز کی ایک دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ نظم کے ہر ٹکڑے کے سرے کلاسیکی اشعار، دوہوں، مقولوں اور آیتوں سے جوڑے گئے ہیں۔ جس کا مقصد انسانی روح کے اضطراب کو ایک ایسی وحدت کے روپ میں پیش کرنا ہے۔ جو زماں و مکاں سے بلند ہے اور جو ہر پُر آشوب زمانے میں نمودار ہوتی ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک کامیاب اور فکر انگیز تجربہ ہے جس سے مستقبل کی اردو نظم کی سمتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مگر عمیق حنفی کی ساری شاعری کے سیاق و سباق میں رکھ کر اسے دیکھا جائے تو یہ خطرہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ کہیں وہ بھی بالآخر اپنی ذات کے نہاں خانے میں سمٹ سمٹا کر غائب نہ ہو جائیں۔

کلیم الدین احمد کی نظمیں تکنیک کے اعتبار سے تازہ اور دلکش ہیں۔ یہاں تخیل کی تازگی ملتی ہے۔ مگر جنسی تلذذ پر ضرورت سے زیادہ زور اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ نظمیں صرف چونکا دینے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ جبکہ آج کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر اس قدر چونکا جائے۔

آزادی کے بعد ایک اور اہم تبدیلی نظم کا غزل کے اثر سے آزاد ہونا ہے۔ اس دور کے سب سے اہم شاعر جنہوں نے نظم کو نئی سمتوں سے آشنا کرایا، سردار جعفری، اختر الایمان اور مخدوم ہیں۔

انسان کے دکھ پر افسردہ ہونے کا جذبہ ملتا ہے سردار جعفری کی نظم، انیس کی نازک خیالی، اقبال کی مرعوب کن معنویت اور جوش کی رومانیت سے مرکب ہے ان کے ہاں تشبیہات استعارات اور حسین الفاظ کے ذریعے نظم کی آرائش پر زیادہ زور ہے۔ مگر آزاد نظم کو جو میراجی اور راشد کی ابہام پرستی اور داخلی طرز اظہار کی بدولت صرف محدود حلقے تک پہنچ سکی تھی۔ اسے سردار جعفری کے تجربات کی بدولت مقبولیت ملی۔

مخدوم اور اختر الایمان نے اپنی ڈکشن الگ بنائی گو کہ ان کے اسلوب کا سلسلہ فیض سے جا کر ملتا ہے۔ اختر الایمان کی نظم کے حسن کا اصل سبب یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکیت کے شکوہ اور رومانیت کی رنگینی سے آزاد ہو کر زندگی کے کھردرے پن کا شاعرانہ عرفان حاصل کیا وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس طلسم کو توڑا کہ اردو میں تغزل اور رومانیت کے بغیر اچھی شاعری ممکن نہیں۔ مخدوم کی نظم کا سب سے زیادہ اہم پہلو اس کی غنائی دلکشی ہے۔ ان کے ہاں آزاد نظم نے اپنے اندر چھپی ہوئی موسیقیت کو پالیا۔ مخدوم ایک جانے پہچانے مارکسی شاعر ہیں اور ان چند شاعروں میں ہیں جن پر مارکسیت کی ترویج و اشاعت کے لیے شاعری کے جمالیاتی مزاج کو مجروح کرنے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کے ہاں اب رومانیت کی لے بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کے علاوہ ان شاعروں میں جو سنہ کے بعد بہت مقبول ہوئے مگر آہستہ آہستہ روپوش ہونے لگے کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، وامق جونپوری اہم شاعر تھے۔ وامق کی تقسیم ملک کے بارے میں نظمیں بہت مقبول ہوئیں۔ کیفی اعظمی کی خاموشی بہت عرصے کے بہت ٹوٹی ہے اور ادھر ان کی بڑی دلکش نظمیں رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ وحید اختر، شاد تمکنت، باقر مہدی، شہاب جعفری، معصوم رضا راہی نے اپنے آپ کو دریافت کرنے، اپنے گرد و پیش کو سمجھنے، اپنے دور کے شعر شعور کی روایت اردو میں شاید اس لیے زیادہ نہیں پنپ سکی کہ خود ہماری نثر اپنے حسن و زیبائش کے لیے شعر کی مرہون منت رہی ہے۔ اردو ادب پر مجموعی طور پر شاعری کے غلبے اور شاعری پر غزل کے اقتدار نے ہمیشہ شاعری کو نثر کے اثر سے



علامہ اقبال کا فکری احساس

بچائے رکھا ہے۔ نثر کے آہنگ کو اگر شاعری کی بارگاہ میں بہت باریابی ہوئی تو وہ سہل ممتنع کی شکل میں تھی۔ آزادی کے بعد شعر نثور کی بھی داغ بیل پڑی۔ اس صنف میں ابھی تک کوئی چونکا دینے والی نظم تخلیق نہیں کی گئی گو کہ سجاد ظہیر کی نظموں کو جوان کے مجموعۂ کلام "پگھلا نیلم" میں شائع ہوئی ہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس تجربے کی عمر اتنی کم ہے کہ اس پر تفصیلی بحث کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔

آزادی کے بعد کی نظم نے اس وہم کو توڑا کہ ایمائیت صرف غزل ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور نظم میں شاعر چونکہ اپنے خیال کا بے محابا اظہار کر سکتا ہے۔ اس لیے اسے ایسے سہاروں کی ضرورت بھی کیا۔ اس دور کے شاعروں کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نظم کی اپنی ایک دنیا الگ تعمیر کی۔ چنانچہ آج اقبال کی وضع کی ہوئی علامتوں یا جوش کے گرجتے ہوئے الفاظ کو جمع کر کے ایک اچھی نظم کہنا ممکن نہیں۔ آج کے شاعر کو اپنی فکر اور اپنے تاثر پر اعتماد ہے اور اسی بنا پر نئے پیکر تراشنے نئے IMAGES تخلیق کرنے اور نئے الفاظ اور نئی علامتوں کا چھپا چھپا ذخیرہ دریافت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آج کی شاعری کا یہ نیا فنی کردار اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ آج کا شاعر اشیا اور مظاہر کے نئے رشتوں اور انسانی زندگی پر ان کے عمل اور رد عمل سے وجود میں آنے والے اثرات کا نیا عرفان و ادراک رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں ندا فاضلی کی ایک مختصر نظم "بکھی دیواریں" پیش کروں گا۔ بدلتے ہوئے نظام پر پرانے نظام کو سہارا دینے والی فرسودہ قوتوں کا رول۔ مگر تبدیلی کا اٹل اور ناگزیر ہونا اس نظم کا موضوع ہے۔ پرانی تنقیدی زبان میں یہ ایک خارجی موضوع

ہے مگر شاعر نے اسے خارج سے تھوڑی دیر کے لیے جدا کر دیا ہے۔

پکّی دیواریں ———— ندا فاضلی

میری ماں ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے
اِدھر اُدھر سے مٹی لا کر
گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو
بھرتی رہتی ہے
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے
بے چاری کتنا ڈرتی ہے۔

میری ماں کتنی بھولی ہے
برسوں کی سیلی دیواریں
چھوٹے موٹے پیوندوں سے
آخر کب تک رک پائیں گی؟
جب کوئی بادل گرجے گا۔
ہر ہر کر تی ڈھ جائیں گی!!!

(ہماری زبان۔ علی گڑھ)

یہ اور اس قسم کی بہت سی نظموں کا پچھلے چند برسوں میں وجود میں آنا اردو نظم میں ایک نئے اور خوشگوار رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔ بری شاعری ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے برے شاعروں کو دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی کوئی چاہے تو افلاطون بن کر انہیں اپنی مثالی ریاست سے نکال کر بھی دیکھ لے وہ بری شاعری پھر بھی کرتے رہیں گے۔ مگر برا شاعر ہونا اتنی بری بات نہیں جتنی کہ برا شاعر ہونے کے باوجود برا شاعر نہ سمجھا نا' اس کا خطرہ تو ہر زمانے میں رہا ہے۔ مگر ایسے زمانے میں جب ہر شے تحلیل ہو رہی ہو۔ بنے بنائے ٹھوس سانچے ان دیکھی حرارت سے بے اندازہ تیزی کے ساتھ پگھل رہے ہوں تو یہ خطرہ اور بڑھ جاتا ہے۔ آزاد نظم کی مقبولیت، نظم میں جرات فکر اور آزادی اظہار کے نئے امکانات بامعنی تجربات کا ذریعہ اور تخلیقی فکر کی آزمائش کا پیمانہ سمجھے جانے کے بجائے کم فہم اور کور ذوق شاعروں کے ہاں ہر طرح کی چھوٹ اور دنیا بھر کی خرافات کی اجازت سمجھ لیے جاتے ہیں اس قسم کی چیزوں کو شاعری یا صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بعض رسائل میں اتفاق سے نظم کے صفحات پر چھپ جاتی ہیں۔ شاعری کے اس حصے پر شاعری کے ذیل میں نہیں،، پرنٹنگ پریس،، کے نقصانات کے ذیل میں غور کیا جانا چاہیے۔ اس لیے اسے ہم یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔

آج کے شاعر سماج کے نچلے متوسط طبقے سے ابھر رہے ہیں تو ان کے ساتھ شاعری اور نظم کے موضوعات میں ان کی زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ پہلے کے مقابلے میں وسعت پیدا ہونا لازم ہے۔ لہٰذا فصاحت و بلاغت زبان و بیان شاعری کے اصولوں اور شاعری کی نوعیت پر غور کرتے وقت ہمیں اس حقیقت پر بھی نظر کرنی ہوگی کہ شاعر کل کے نہیں بلکہ آج کے پڑھے لکھے طبقے سے ابھر رہا ہے۔ جس کے ذہن کی تہذیب و تربیت میں فارسی کا ذرہ برابر حصہ نہیں ہوتا۔ اس تک اردو شاعری کے ذریعے فارسی روایت کی جو رمق پہنچی ہو سو پہنچی ہو اس کے ذہن کی تربیت میں اس سے زیادہ اس کا حصہ نہیں۔ وہ آج انگریزی، ہندی اور مقامی ہندوستانی زبانوں سے زیادہ متاثر ہے چنانچہ آج کی زبان تیس برس پہلے کی زبان سے مختلف ہے بلکہ بزرگوں کے کہنے کے مطابق تو سراسر غلط اور بگڑی ہوئی ہے۔ مگر یہ آج کی اکثریت کی اردو ہے۔ جس کی بنیاد گلیوں، بازاروں، گھروں اور بے تکلف محفلوں میں ہے۔ لہٰذا آج کے شاعر سے فنی اعتبار سے ان معیاروں کا تقاضا کرنا بے کار ہے جو ہمارے بزرگوں نے وضع کیے تھے۔ آزاد نظم کی روایت، مصرعوں کا ٹوٹنا، الفاظ کی نشست اور ان کا محل استعمال اور تراکیب کی چستی غرض کہ ان سب فنی نزاکتوں کو پرکھنے کے لیے نئے معیار بنانے ہوں گے۔ جو آج کی بول چال کی زبان اور اس ادب سے اخذ کیے جائیں گے۔ جو آج کے شاعر اور ادیب کی تخلیق ہیں۔

اردو کا خط ہندی کے نام



اور ہندی کا جواب

ڈاکٹر سید محمد ہاشم

اردو کا خط ہندی کے نام

نئی دہلی، ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء

میری پیاری بہن ہندی!

تسلیمات

امید ہے تم بخیر و عافیت ہوں گی۔ آج تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی کہ میرا خط تمہارے پاس کیسے؟ لیکن بہن! فرض کیا نہیں کرا دیتی کام پڑنے پر سب ہی مجبور ہو جاتے ہیں۔ اب یا تو زمانے کے دستور کے مطابق پہلے یونہی دو تین خط ڈال کر ظاہری رسم و راہ قائم کرتی، یا ایک ہی خط ہوتا تو اس میں بھی شروع میں اسی طرح کے لایعنی تکلفات اور طویل تمہید کا شکار ہوتی یہ مجھ سے نہ ہو سکا۔ دراصل اب میں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی ہوں اور ہر امید کے مخزن سے مایوس کن جواب پانے کے بعد تمہاری طرف نگاہ اٹھی ہے، اب تمہیں اس طرف متوجہ کر رہی ہوں ممکن ہے کہ تم میری کچھ مدد کر سکو میرا تم سے ایک بہت ہی خاص رشتہ ہے جب تک ہو سکا میں نے اس کو تم پر جتایا نہیں لیکن آج اس کا وقت آ گیا ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ میں اور تم دونوں ہندوستانی زبانیں نہیں ہیں دونوں آریوں کی اولاد ہیں اور آریہ باہر سے آئے تھے یہاں تو اصلاً دراوڑ آباد تھے۔ آریہ فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے نتیجتاً دراوڑی تہذیب اور زبان نے آریائی تہذیب و زبان کے لیے جگہ خالی کر دی۔ جو آگے چل کر رگ ویدی تہذیب

کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی اور رگ ویدی زبان ہی اس معاشرہ کی زبان قرار پائی لیکن اپنے اصول کے مطابق عوامی زبان محدود نہ رہ سکی۔ چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا ارتقا ہوتا رہا اور جب کئی صدیاں گزر گئیں تو یہ زبان بھی اپنی ابتدائی شکل سے مختلف ہوتی گئی، خود یجر وید اور سام ویدی زبان رگ وید سے خاصی مختلف ہے۔ اور زبان کی یہ تبدیلی اس کا عیب نہیں خوبی اور قوت نمو کی دلیل ہے لیکن بعض علماء نے عوام میں مقبول ہوتی ہوئی رگ ویدی زبان شدھ کرنے کے لیے اصول و قواعد مقرر کر لیے نتیجہ یہ ہوا کہ اصل زبان تو ان قیود میں محصور ہو گئی اور وہ مقبول زبان کلاسیکی سنسکرت کی شکل میں ترقی کرتی رہی۔ وقت کے ساتھ یہ فاتح آریہ اور ان کی نسلیں ہندوستان کی وسعتوں میں پھیلتے گئے اور ان کی کلاسیکی زبان علاقائی بولیوں سے متاثر ہو کر بتدریج اتنی بدل گئی کہ مختلف علاقوں میں کچھ نئی، نئی زبانیں وجود میں آ گئیں۔ علماء نے انہیں "پراکرت" کے نام سے یاد کیا ہے اور "پالی" جو چھٹی صدی قبل مسیح میں بدھ اور جین مذہب کی تبلیغ کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی۔ اشوک کے زمانے میں اسے پورے ملک کی سرکاری اور علمی زبان کی حیثیت میں تسلیم کیا گیا۔ پالی کو کسی مخصوص پراکرت کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ پراکرتیں دراصل پانچ ہیں۔ شورسینی پراکرت، ماگدھی، اردھ ماگدھی، اپبھرنش، اور مہاراشٹری پراکرت، پالی کی مقبولیت کے علاقے ماگدھی اور اردھ ماگدھی والے سمجھے جا سکتے ہیں۔ باقی علاقوں میں دوسری پراکرتیں ترقی کرتی رہیں اور انہیں بھی عروج ہونے لگا ان میں بھی علمی و ادبی کاوشیں ظہور پذیر ہوئیں۔ اور رفتہ رفتہ یہی ادبیت عوام کو اس زبان سے دور کرنے لگتی ہے۔ جب یہ زبانیں عوام کا وسیلۂ اظہار نہ رہیں تو عوامی بول چال کی زبان کی حیثیت سے انہی پانچ پراکرتوں نے پانچ اپبھرنشوں نے جنم لیا اور ۱۰۰۰ عیسوی تک ان کا دورِ عروج رہا۔ گیارہویں صدی کے اوائل میں ان اپبھرنشوں کا اختلاط پھر مختلف علاقوں کی مقامی بولیوں سے ہوا۔ اور یوں دوسری بہت سی نئی زبانیں وجود میں آ گئیں۔ جنہیں علمائے لسانیات نے جدید ہند آریائی زبانوں کے نام سے یاد کیا ہے۔

شورسینی اپبھرنش کا علاقہ دوآبہ (مدھیہ پردیش) کا علاقہ ہے اس سے جو بولیاں پھوٹیں ان کے مجموعہ کو مغربی ہندی بھی کہا گیا ہے۔ یہ پانچ ہیں برج، کھڑی، ہریانی (جاٹو) بانگرو اور قنوجی۔

میرا اور تمہارا تعلق اسی کھڑی بولی سے ہے۔ برج نے بھی کچھ دن ہماری پرورش کی ہے اور پنجابی سے ہم نے جو کچھ سرمایہ حاصل کیا ہے اسے تو زندگی کے کسی لمحہ میں بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اس لحاظ سے ہم دونوں (میں اور تم) بہنیں بہنیں ہیں۔ ابتدائی چند صدیوں میں ہم دونوں پر عربی ترکی اور فارسی اثرات یکساں طور پر پڑے لیکن تمہیں برج کی ادا زیادہ پسند آئی اور ہماری ایک خالہ ناگراپ بھرنش نے تمہیں گود لے لیا تھا۔ تم نے اسی کا ہی گھونگھٹ نکال لیا اور یوں کافی بعد میں تمہارا لباس ۔۔۔ دیوناگری رسم الخط کہلایا اور میرا پورا ظاہری لباس وہی رہا۔ ہماری نانی کی بہن (ہند ایرانی) فارسی نے جو لباس اختیار کیا تھا۔ پورے مغلیہ عہد میں اسی تہذیب اور زبان کی آغوش میں میری تربیت اور پرورش ہوئی۔ میری منزل شباب اسی تربیت کی مرہون احسان ہے چنانچہ میرے لیے یہ تصور بھی محال اور کم ظرفی کی علامت تھا کہ میں اس یونیفارم سے بغاوت کر دیتی دونوں کے جداگانہ اطوار اختیار کر لینے کی وجہ سے ہم دونوں کی مادری اور موروثی صفات تو مجروح نہیں ہو سکتیں۔ ہم دونوں کے مشترکہ قواعد اس پر دال ہیں۔ ایک ہی مذہب کے لوگ دو الگ قسم کے طرزِ معاشرت اختیار کرتے ہیں ان میں سے کسی ایک کو مذہب بدر کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ آج بے سرے قسم کے لوگ سیاست و مصلحت کے دباؤ میں کچھ سوچا کریں لیکن جس وقت میں بالغ اور جوان ہو رہی تھی اس وقت فارسی زبان اور رسم الخط نہ صرف یہ کہ معیوب نہیں تھا بلکہ یہ رسم خط مستحسن تھا اور بلا امتیاز مذہب و ملت پورے ہندوستان میں فارسی دانی طرۂ امتیاز اور سرمایۂ افتخار سمجھی جاتی تھی۔ میں کوئی سیاسی لیڈر تو ہوں

نہیں کہ حالات کے ساتھ چہرے اور پوشاکیں بدلتی رہیں، ہر تہذیب کی کچھ اقدار ہوتی ہیں۔ میں بھی بعض بہت ہی اعلیٰ اقدار کی حامل ہوں، لہٰذا اپنی مضبوط و مستحکم اور زندہ تہذیب و اقتدار سے بغاوت میری کم ظرفی کی علامت اور موت کی نقیب ہوگی۔ جاں گسل حالات سے گھبرانا زندوں کا کام نہیں۔ میرا شمار دنیا کی دوسری یا تیسری بڑی زبان میں ہوتا ہے۔ میرا ادبی سرمایہ میرے لیے ہی نہیں ایک بہن کی حیثیت میں تمہارے لیے بھی باعث فخر و انبساط ہوگا۔

اتفاق سے ہم دونوں میں میرا ہی لٹریچر قدیم ترین ہے اور یہی حال رسم الخط کا ہے۔ اس وقت جب کہ مسعود سعد سلمان اور خسرو وغیرہ شاعری کے ذریعہ میرے دامن کو باغ و بہار بنا رہے تھے دیوناگری رسم خط کو کون پوچھنے والا تھا؟ ہندو ہو یا مسلمان اس وقت نہیں بعد کے چار سو سال تک بھی برضا و رغبت اور بڑی خواہش و تمنا سے میرا رسم خط اختیار کیے رہے اس کے بعد کبیر، تلسی، جائسی، نانک وغیرہ نے مجھے عروج کی منزلوں سے ہمکنار کیا۔ ملک کافور کے ہاتھوں دکن میں علاؤ الدین خلجی کی فتح وہاں میرا سفر اول ہے۔

محمد بن تغلق کے جانے کے بعد میری پذیرائی ہوئی ہے۔ اس سے کون واقف نہ ہوگا یہاں تک کہ اورنگ زیب کے بعد تک وہاں میری یہی صورت حال رہی ادھر شمال میں بھی مجھ سے بے اعتنائی نہیں برتی گئی لیکن لباس اور رسم خط کے جھگڑوں نے ہم دونوں میں افتراق پیدا کیا جسے انگریزوں کی کوششوں سے مزید فروغ ملا۔ فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) میں اس اختلاف کا ظہور ہوا۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کے قیام و استحکام کی خاطر ہم دونوں کے چاہنے والوں کو لڑوا دیا گویا ہم دونوں میں جھگڑا کرا دیا اس کے باوجود ان کے دل و دماغ اور پورے ملک کی لسانی صورت حال کے پیش نظر ان کے ذہنوں پر میرا ایسا سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ اپنی حکومت کے لیے انہوں نے پورے ملک میں بولی جانے والی زبان کی حیثیت میں مجھے ہی تسلیم کیا۔ انہوں نے میرا ہی رسم خط بھی قبول کیا اور میرا نام ہندوستانی رکھا۔ ظاہر ہے اس وقت تک



پنڈت آنند نرائن ملا

بھی مجھے کسی خاص مذہب یا فرقے کے ساتھ وابستہ منسلک و محدود نہیں کیا گیا تھا۔ چندر بھان برہمن اور لچھمی نارائن شفیق سے لیکر فراق گورکھپوری، آنند نرائن ملا۔ اور جگن ناتھ آزاد تک سیکڑوں غیر مسلم مستند شعراء، ادبا، تذکرہ نگار، ناول و افسانہ نگار اور ناقدین فن نے میری اسی تہذیب کو اخذ و قبول کرکے مجھے مادری زبان کا درجہ دیا برتا اور پیش کیا یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ میری جائے پیدائش، جائے تربیت و پرورش، جائے شباب اور جائے بزرگی یہی سرزمین ہندوستان ہے اور میں تمہاری بہن ہوں۔ میرا پہلا مخطوطہ تیرہویں صدی عیسوی کا دستیاب ہے۔ (بارہویں صدی کا علم تو ہے لیکن دستیاب نہیں) تمہاری شکل اس کے دو تین صدیوں بعد تک بھی نظر نہیں آتی۔ بعض لوگ ہمارا سلسلہ سدھو سے ملاسکتے ہیں تو اس بحث میں لوگ مجھے فارسی پھر عربی اور سندھی سے بھی جا ملائیں گے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہماری والدہ کا نام جدید ہند آریائی ہے۔ اس سے پہلے ہمارا سراغ



آزاد ہندوستان کے پہلے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد

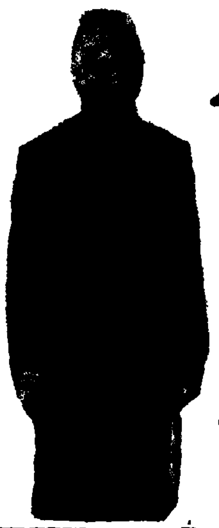
لگانا خلاف فطرت ہے۔ مذکورہ پانچ بولیوں کے وجود کے بعد ہی ہماری تحقیق مفید مطلب ہوگی اور ہم عمری کے باوجود اس میدان میں جیسا کہ میں نے وضاحت کی مجھے ہی تم پر سبقت حاصل ہے۔ میرا معیار بھی ادبی، سماجی اور سیاسی ہر اعتبار سے تم سے ہمیشہ بلند رہا ہے سرکاری عہدوں پر تجنے عرصہ میں فائز رہی ہوں تم نہیں رہیں۔ داستانوں کا زبردست دفتر، تنقید کا بہترین سرمایہ ترجمہ کا عمدہ ذخیرہ، اصطلاحات کی وافر تعداد اور کہانی کی اعلیٰ ترقی اس وقت بھی تمہارے مقابلہ میں میرے یہاں بدرجہا زیادہ اور بہتر ہے۔ زبان کی سلاست اور شیرینی، فقروں کی برجستگی و عمدگی دور دور تک اس پر مستزاد ہے۔ اب بعض سوکالڈ دانشوروں کی سنیے "صاحب اردو تو ہندی کی ایک شیلی ہے" بہت خوب، لیکن ہندی شعبوں میں تمام اسالیب پڑھائے جاتے ہیں۔ بس منہ میں قفل پڑ جائے تو کوئی کچھ ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی پرچہ ہے۔ کیا خوب انیل و شرن کی زبان ملاحظہ فرمائیں کون سی زبان استعمال ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسے بلند معیار الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں کہ مجھے زندگی میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاتا ہے فلموں کی زبان اور گانے بھان اللہ! لیکن اعلیٰ ظرفی اسی کو کہتے ہیں تاکہ ان پر لکھا ہوتا ہے "ہندی فلم" "ہندی گانے" ہنر پور سب کچھ کر سکتا ہے لیکن اس حقیقت کے اظہار کی تاکید نہیں کر سکتا۔ کیا خوب۔

بہن! یہ دلچسپ داستانیں کہاں تک سناؤں اتم بھی ہنس رہی ہوں گی کہ یہ کہاں کہاں سے کھوج لائی ہے دراصل بتانا یہ مقصود ہے کہ رسم خط کے علاوہ آج بھی ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں اور تمام سرکاری مراعات اور سہولیات کے باوجود تمہارے مقابلے میں میری ہی زیادہ مقبولیت اور شیرینی کی تعریف ہوتی ہے۔

دراصل ہم دونوں میں آزادی سے پہلے تک چند باتوں کے علاوہ تمام ہی چیزیں مشترک تھیں اور اس حقیقت کو سب ہی لوگ تسلیم بھی کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان رنجش پیدا کی گئی، آزادی کے زمانے میں یہ اختلاف اور کشمکش روز افزوں ہوتی گئی "قومی زبان اردو ہو یا ہندی" اس مسئلہ پر جب ووٹ ڈالے گئے تو دونوں کے حق میں ۴۵۔۴۵ ووٹ آئے۔ اس وقت بھی میری ہی مقبولیت کا سکہ رائج تھا لیکن۔ صدر ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کے حکم (کاسٹنگ) ووٹ لے تمہیں گویا ایک ووٹ سے کامیاب کرا کے سرکاری زبان کا درجہ دلا دیا ظاہر ہے کسی ایک ہی کو پورے ملک کی سرکاری یا رابطہ کی زبان بننا تھا۔ سو وہ تم بن گئیں۔ لیکن آزادی کے بعد دل دوز حالات میں مجھے برابر کے ووٹ ملنا جہاں میری سابقہ حیثیت کو بحال رکھتا ہے وہیں اس ملک سے میرے ازلی اور مستحکم رشتہ کی دلیل اور ضمانت بھی ہے۔ انگریز نے ملک تقسیم کرایا اور پاکستان بنوایا تھا تو اس سے زیادہ بہتر موقع میرے نکالنے کا کون سا ہو سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ الزام مجھ پر بہت بعد میں سیاسی مصلحتوں کے تحت لگایا گیا ہے اور یہ بھی اسی زمانے کے بعد کی بات ہے کہ پاکستان بننے کے کافی بعد ہم اہمارے پیارے وزیراعظم

پنڈت جواہر لال نہرو جب پاکستان کراچی گئے تو انہیں وہاں انگریزی میں سپاسنامے پیش کیے گئے۔ موصوف نے ان کا جواب اردو میں دیا اور بڑے فخریہ انداز میں فرمایا کہ اردو دہلی لکھنؤ اور بھارت کی زبان ہے۔ کیا ارشاد رہنمایان ارکان سیاست کا جو مجھے تقسیم ہند کا ذمہ دار ٹھہرا کر گردن زدنی قرار دیتے ہیں؟؟

آج صورت حال یہ ہے کہ مخالفت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ کوششوں کے باوجود میرا سنبھلنا کبھی خاصا دشوار ہو جاتا ہے۔ تیماردار مجھے سرکاری و سیاسی ڈاکٹروں کے پاس لے کر جاتے ہیں لیکن کبھی مبہم اور کبھی صاف لفظوں میں (جیسا موقع ہو) مجھے ٹھکرا کر جواب دیا جاتا ہے کہاں ہم ووٹ اور برابری کا درجہ اور کہاں تمہارے برابر تک بیٹھنے نہیں دیا جا رہا۔ میرے چاہنے والے مجبور ہو کر ثانوی زبان کا درجہ مانگنے پر ہی راضی ہو گئے تو اس کے لیے بھی جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ عرصہ تک اس سلسلہ میں ٹال مٹول چلتی رہی ابھی چند برس قبل کہیں جا کے بہار کے اہل تدبیر حضرات کی کوششوں اور جناب جگن ناتھ مشرا کے پُرعزم مبارک و مستحسن اقدام کی بدولت ایک نقطہ نظر سے مجھے صوبہ بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا تو اس پر بڑی واویلا مچی۔ یوپی کے سابق وزیراعلیٰ اور موجودہ وزیر مالیات جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے بہت پریشر کے بعد معاملات کی گہری چھان بین اور سخت تحقیقات کرائی، اور بمشکل تمام اپنا وعدہ پورا کرنے کی شکل میں ۱۴ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو مجھے یوپی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا آرڈی ننس جاری کر دیا۔ اگرچہ اس کے دو روز پہلے اور دو روز بعد بھی ان پر سخت گزرے اور انہوں نے برداشت کیا حالانکہ یہ آرڈی ننس برائے نام تھا۔ کیونکہ کافی عرصہ کے بعد اس سلسلہ میں جو بل پیش کیا گیا وہ آرڈی ننس کی روح کے سراسر منافی تھا۔ اور بہار کی نسبت نوعیت سے یکسر مختلف۔ گویا میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کے باوجود بھی یار لوگ اس مسئلہ کو عدالت لے گئے اور ارکان حکومت دیگر معاملات میں



پنڈت نہرو نے فخریہ فرمایا تھا: "اردو دہلی لکھنؤ اور بھارت کی زبان ہے"

تو خاصے ہوشیار ہیں لیکن اس مسئلہ میں اتنے بھولے اور سیدھے نکلے کہ کانپ گئے اور سپریم کورٹ پہنچے یعنی ظاہر بینوں کو یہ باور کرا دیا گیا کہ الٹ اس قدر پیچیدہ مسئلہ ہے یہ۔ بہرحال چاہے دیگر ارکان حکومت کے نرم لہجے میں ہوں یا شری واسدیو سنگھ جی کے تلخ لہجے میں۔ کوشش یہی ہو رہی ہے کہ مجھے دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہ ملنے پائے۔ حالانکہ اگر یہ ہو جائے تو اس میں تمہارا کیا بگڑ جائے گا، لیکن لوگ یہی لنگڑا سہارا بھی لیتے ہیں۔

بہن تم خود ہی بتاؤ کہ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ زمانہ میرا ساتھ کیوں نہیں دے رہا ہے۔ لوگ میرے ہی جھنڈے تلے پروان چڑھے اور ایوان کی کرسیوں تک پہنچے ہیں لیکن مجھ ہی کو دھتا کرتے ہیں۔ الیکشن کے موقع پر ہمیشہ میرے ساتھ انصاف کے وعدے ہوتے ہیں مگر بعد میں زخموں پر نمک چھڑکا جاتا ہے۔

اس وقت تمہارا راج ہے۔ اگر تم میرے پژمردہ جسم اور نزار بدن کو تندرست و توانا کرنا اور باقی رکھنا چاہتی ہو تو مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ انگریزوں کی علم دوستی نے علمی اور سیاسی دونوں اعتبار سے میری مدد کی تھی اور مجھے تقویت پہنچائی تھی تم اگر اتنا نہیں کر سکتیں تو مجھے دوسری سرکاری زبان کا درجہ باقاعدہ عملی درجہ تو دلوا ہی دو۔ دفتروں میں میری شناسائی نہیں، میری اقتصادی اہمیت کچھ نہیں ہے اس کے بغیر زبان ترقی نہیں کر سکتی اس میں میری کچھ مدد کرو اور سرکار میں میری یہ بات پہنچا دو اور ان کم علموں کو یہ بتا دو کہ یہ ظلم رسیدہ اردو میری حقیقی بہن ہے جو برسہا برس مجھ سے زیادہ جاندار اور عظیم رہی ہے۔ میری شادی ہندوستان میں ہوئی اور میں آگے دبڑھ سکی جبکہ یہ باہر کے ممالک تک پہنچ کر دنیا کی مستند زبانوں میں شمار ہونے لگی ہے۔ اس کے باوجود اس کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی ترقی سے میرا کچھ نقصان نہیں ہوگا میں تو دائمی حیثیت و عظمت کی حامل ہوں۔ یہ کمزور ہے مضبوط اور خوش ہو جائے گی۔"

بہن اگر اتنا کر سکو تو میں ہمیشہ تمہاری شکر گزار رہوں گی۔

امداد اور جواب کی منتظر

تمہاری بہن

اُردو

ہندی کا خفیہ جواب

پریہ بہن!

نمسکارم

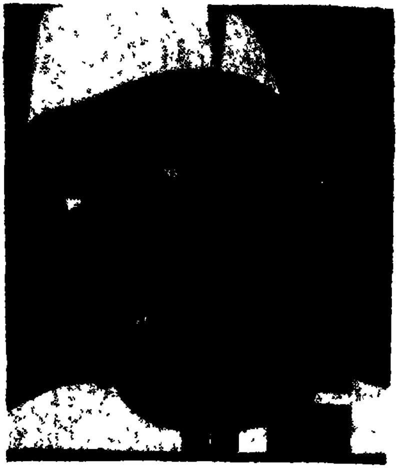
۲۷ر اکتوبر کا لکھا تمہارا درد بھرا خط پڑھ کر دکھ ہوا۔ تمہارے حالات کا پتہ لگا ہم دونوں کی ابتدا پر تم نے جو پرکاش ڈالا ہے اس سے میں پوری طرح سہمت ہوں اور بھی بہت سے لوگ اس بات کو جانتے ہیں۔ میں جو بہت سی باتیں بھول گئی تھی، وہ سب یاد آگئیں۔ کچھ باتوں میں مجھے تم سے اتفاق نہیں ہے جیسے تلسی داس کے اردو ہونے پر۔ ایک بات مجھے اچھی نہیں لگی کہ تم نے اپنی زندگی سے مایوسی اور پریشانی پرکٹ کی ہے۔ پریشانی تو سمجھ میں آتی ہے پر مایوسی اور نراشا میں آدمی کو نہیں گھر جانا چاہیے اور تمہاری جیسی مضبوط سندر اور شوخ زبان کو بھلا کوئی بھارت درش سے مٹا سکتا ہے؟ رہتے بھارت تک تم زندہ اور اہم رہو گی۔ یہی میری پرارتھنا، اچھا اور ابھیلاشا ہے۔ اوہ! میں تم سے کس اسٹائل میں باتیں کرنے لگی۔ لو اب تم خالص اپنے اور ہمارے لہجہ میں سنو۔

بہن! جب سے میں راجیہ کے کاموں کی ذمہ دار بنی ہوں مجھے باہر کی باتوں کا ٹھیک سے پتہ ہی نہیں لگ پاتا۔ تمہاری یاد مجھے بہت بار آتی ہے اور بہت سے اوسر ایسے آتے ہیں جب ہم تم ملنے کے قریب ہو جاتے ہیں لیکن تمہارے لیے بدلنی کا شبد پریوگ کر کے مجھے وہاں جانے سے روک دیا جاتا ہے اور میں چپ ہو جاتی ہوں۔

بہن میں یہ جانتی ہوں کہ تم ہر طرح مجھ سے بہتر ہو۔ تم مجھ سے بڑی ہو، تمہارا لٹریچر مجھ سے پرانا اور زیادہ ہے۔ اگر تمہارا داستانی لٹریچر ہی میرے مقابلے میں رکھ دیا جائے تو شاید میرا کل سرمایہ اس کے برابر ہی نکلے۔ سرکار میں تم مجھ سے پہلے پہنچیں۔ اتر اور دکن دونوں جگہ تم بہت پہلے سے بڑے بڑے عہدوں پر رہ چکی ہو، تمہارا یہ کہنا بھی ٹھیک ہے کہ صرف ایک VOTE CASTING سے تمہارے مقابلے میں مجھے سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تھا، اور آج میں ہی پارلیمنٹ میں رانی بنی بیٹھی ہوں اور کیا تم کو اپنی بہن کے اس اعزاز سے خوشی نہ ہوتی ہوگی۔ لیکن بہن! یہ بتاؤ کوئی اپنے عہدے کو یوں ٹھکرا تو نہیں دیتا، میرے پاس یہ عہدہ ہے تمہارے پاس نہیں، آج پارلیمنٹ میں ہی نہیں، ملک کے پورے نظام میں اعلیٰ عہدوں پر لاکھوں غیر مستحق لوگ فائز ہیں، یہ تو قسمت کی بات ہے جس میں ہم دونوں میں سے کسی کا قصور نہیں۔

کبھی کبھی ایوان میں تمہاری چرچا ہوتی ہے، اس سے مجھے تمہارا ہم سن کو بہت تسلی ہوتی ہے۔ لیکن جب تمہارے ہی لوگ تمہارے خلاف بولتے ہیں اور مصلحت کی باتیں کرتے ہیں تو مجھے بہت ہی دکھ ہوتا ہے۔ میرا خیال کچھ ایسا ہے کہ جب تک تمہارے

بازوؤں میں خود طاقت نہیں آجاتی اس وقت تک تو ہندوستان
کی کوئی بھی برسرِ اقتدار پارٹی تمہیں تمہارا حق دلانے والی نہیں
اور یہ تو تم جانتی ہو کہ الیکشن کے وعدوں کی کیا حقیقت ہوتی ہے
اگر کام کرانا ہی ہے تو الیکشن سے پہلے پہلے ہی کرا لینا چاہیے
ورنہ تو یہی ہوتا جو تم سے بیٹھے بیٹھے وعدے کر گئے تھے یہاں
اس قدر کاٹ کرتے ہیں کہ میں دانت تلے انگلی دبا لیتی ہوں۔
تعصب کا واحد الزام (جو سب سے زیادہ PROVOCATIVE
الزام ہے) لگا کر نہ جانے کب کب کے بدلے آتارے جاتے ہیں۔
اور کانگریسی یا برسرِ اقتدار جماعت کے نیتاؤں کا تو پوچھنا
ہی کیا ہے۔ اندر کچھ بولنے کا سوال نہیں، باہر اردو اردو گاتے
پھرتے ہیں اگر ان سے کوئی تحریک چلانے کو کہا جائے تو وہ مخالفتوں
اور فسادوں کی دھمکیاں دیتے اور خطرات کا ہوا بٹھلاتے ہیں جبکہ
حکومت تو سب کا بھلا چاہتی ہے اور صحیح صورت حال جاننا
چاہتی ہے۔ اگر اس کا دل چاہے تو بڑے سے بڑا خطرہ مول لے
کر وہ کام کر دیتی ہے۔ نہ چاہے تو لاکھ تحریکیں چلائی جائیں احتجاج
کیے جائیں آسانی سے ماننے والی نہیں، ۴۷ء سے ۷۷ء تک
یہاں ایک پارٹی کی حکومت رہی، اس سلسلے میں ان کے کانوں
پر جوں تک نہ رینگی، تین سال کے لیے جنتا کی حکومت آئی ان لوگوں
نے کیا کیا وعدے نہ کیے تھے۔ لیکن شاید تمہیں یاد نہیں رہا کہ جنتا
گورنمنٹ بن جانے کے کچھ ہی دن بعد مسٹر مرارجی ڈیسائی نے اردو
گھر کے افتتاح کے موقع پر کہا تھا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان
نہیں بنایا جا سکتا، اس کے بعد چودھری چرن سنگھ نے تم کو پاکستان
اور عربوں کی زبان بتا کر تقسیم ملک کا ذمہ دار ٹھہرایا در صحت مسٹر
راج نارائن جی نے کیا تمہیں نکال باہر کرنے کی تجویز نہیں رکھی تھی؟
دراصل کسی تحریک کے چلانے والے اور دانشور اگر سیاسی بد عملی
کا شکار نہ ہوں اور بہت سلیقہ و تاثیر کے ساتھ حکومت کے سامنے
اپنے نقطۂ نظر پیش کریں اور اس پر مرکزی و صوبائی حکومت آپس
میں صلاح و مشورے کے بعد متفق ہو جائے تو ہر کام ہو سکتا ہے۔
بہار کا آرڈیننس اور بل انہی تین چیزوں کا مرکب تھے وہاں لاکھ
مخالفتیں ہوئیں لیکن ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا اس سے مس نہیں ہوئے۔



چودھری چرن سنگھ نے اردو کو پاکستان اور عربوں کی زبان بتا کر تقسیمِ ملک کا ذمّہ دار ٹھہرایا۔

اور انہوں نے تمہیں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ تیواری
جی کہتے تھے کہ میں گیانی جی سے کہوں گا دفعہ ۳۴۷ کے تحت یو پی
میں سرکار کو یہ ہدایت کریں کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا دیا
جائے۔ گیانی جی مان سکتے ہیں اور ایسا کر بھی سکتے ہیں اس لیے
کہ انہیں تم سے پریم ہے۔ انہوں نے اپنا ایم پی کا حلف بھی تمہارے
ذریعے (اردو میں) ہی لیا تھا (یہ تو مسلمانوں سے بھی نہ ہو سکا)
لیکن مختلف قسم کے دانشوروں کے وفود ان سے جلد سے جلد مل کر
اپنے موقف کی وضاحت کر کے انہیں مطمئن کر دیں۔ انجمن
ترقی اردو والے الگ ملیں، دہلی جامعہ اور جے این یو کے دانشور
الگ ملیں۔ جمعیۃ، مشاورت، اکیڈمی اور دوسرے اداروں کے
لوگ اپنے منتخب وفود کر جائیں۔ کام ہونے سے پہلے تشہیر نہ
کریں۔ اخباروں میں اشاعت کے منتظر نہ رہیں۔ ورنہ اس سے
پہلے ہی مخالفت شروع ہو جائے گی۔ پھر ہم دیکھیں کیسے بنتا ہے

ساتھ انصاف نہیں ہوتا ہے۔ گیانی جی تو اتنے پریمی ہیں کہ انہوں نے لمحہ بھر میں غالب ایوارڈ کی رقم پانچ ہزار سے بڑھوا کر دس ہزار کر دی۔ لیکن کوئی کام کرنے اور لینے والا بھی تو ہو۔ تمہارے لوگ تو میری صحیح حیثیت سے بھی واقف نہیں۔ مجھے قومی زبان گاتے پھرتے ہیں جب کہ قومی زبانیں تو یکساں طور پر پندرہ تسلیم کی گئی تھیں۔ مجھے سرکاری رابطہ کی زبان بنانے کے سلسلے میں ووٹنگ ہوئی تھی۔ جس میں دونوں کو ۴۵۔۴۵ ووٹ ملے تھے اسی سے اندازہ لگا لو کہ ہندوستان آزاد ہونے کے تین سال بعد جب آئین کی تشکیل ہو رہی تھی اس وقت بھی (ایسے کربناک حالات میں بھی) تمہاری حیثیت و مقبولیت اتنی مسلمہ تھی کہ تمام تعصبات کے نعروں کے باوجود اور ایوان میں ٹنڈن جی اور سیٹھ گووند داس کی موجودگی کے باوجود تمہیں برابر ووٹ ملے۔ آج تو ایسی کوئی کشمکش بھی نہیں ہے اور اس کے بعد تو تمہارے نام پر کوئی ملک تقسیم بھی نہیں ہوا ہے پھر کیسے تمہارے مخالف اور موجودہ ظرف والے سیاست دانوں کی بات میں وزن ہو سکتا ہے اور تمہیں سرکاری زبان کیوں نہیں بنایا جا سکتا بس بات ہے سچی اجتماعی اور ذمہ دارانہ طور پر کام کرنے اور CE IN E.L.E.N C.O.V.I.N کرنے کی۔ یہ ممکن ہے کہ صدر صاحب آج پھر ۱۹۵۲ء والی دستخطی مہم کا حوالہ دیں لیکن چوں کہ آج کی اور اس وقت کی حقیقت ان کے سامنے ہے اس لیے ان کی طرف سے اس کی توقع نہیں، وہ عام سیاسی رہنماؤں کی طرح نہیں ہیں۔

اب تم سے مجھے تلخ باتیں بھی کہنا ہیں۔ تمہارے ادیب، تمہارے نام پر روٹی کمانے والے، حکومت سے انعامات اور وظائف حاصل کرنے والے، تمہارے نام پر لڑنے والے اور تمہارا حق دلوانے کے دعویدار کتنے فیصد ایسے ہیں جن کے گھروں میں تمہاری رسائی ہے، تم سے ہمدردی کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور اپنے بچوں کو حروف ہجا سے ایک قدم آگے نہیں بڑھانا چاہتے۔ ان بچوں کو میڈیم کے لیے ہندی اور اردو میں سے کسی ایک کے انتخاب کے لیے کہا جائے تو ان کی نگاہ صرف مجھ پر جاتی ہے فیصلہ میرے حق میں ہوتا ہے۔ ان کے والدین اور تمہارے نام نہاد دوست و ہمدرد کانونٹ اور پروفیشنل کورسز کے نام پر یا اس عنوان سے کہ اردو پڑھ کر کہاں نوکری مل رہی ہے؟ تم سے اپنے بچوں کو محروم و محفوظ رکھتے ہیں۔ تف ہے ان پر! کیا ایسے لوگوں کو تمہارا مخلص و ہمدرد کہا جا سکتا ہے! حیف صد حیف!!

دوسری بات اردو میڈیم اسکولوں کی ہے حکومت نے کئی سال پہلے بہت سی جگہ مڈل تک اردو میڈیم کلاسیز کی اجازت دے رکھی تھی اس کا اردو نصاب بھی تیار کیا گیا تھا۔ تم ہی بتلاؤ تمہارے کتنے ہی خواہ ہندی اسکولوں اور کالجوں نے اردو میڈیم اختیار کیا، کتنے جدید اردو میڈیم اسکول کھولے گئے، کتنے اردو میڈیم اسکولوں نے اچھے نتائج حاصل کیے۔ گورنمنٹ نے تمہاری مدد کے لیے ترقی اردو بورڈ اپنی خصوصی نگرانی میں قائم کیا، اردو اکاڈمیاں قائم کیں اور دوسرے تمام اداروں کو کروڑوں روپیہ کی امدادیں دیں۔ کیا اس کا صلہ یہی ہے کہ اپنے نکمے اور ناکارہ پن کو چھپانے کے لیے ایک طرف حکومت سے امداد حاصل کریں اور دوسری طرف اسے برا بھلا کہتے پھریں۔ ترقی اردو بورڈ نے کتنے لوگوں کو کتابیں لکھنے کے لیے دے رکھی ہیں اور وہ آٹھ آٹھ سال سے ان کے پاس سے واپس نہیں آتیں۔ کیا یہ اردو والے، خود تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بنے ہوئے ہیں؟ ترقی اردو بورڈ کے ذریعہ چھپی ہوئی ہزاروں کتابیں بے کار محض پڑی ہوئی ہیں۔ کوئی تمہارا بہی خواہ اسکولوں اور کالجوں میں جا جا کر اہل اردو کو اردو لینے کی ترغیب کیوں نہیں دیتا کیا اس سے حکومت کا نقصان نہیں ہوا۔ اور کیا یہ الزامات نہیں ہیں تمہارے ادیب و شاعر ن م راشد اور میرا جی کی بنائی ہوئی پگڈنڈیوں کو آج بھی نہیں چھوڑنا چاہتے یا وہ اپنا کہا آپ ہی سمجھے، کی تخلیقات پر مصر ہیں، کیا ایسے ادب سے زبان کی خدمت ہو سکتی ہے۔ اس وقت جتنی ضرورت ادب کو بہتر بنانے کی ہے اتنی ہی شدید ضرورت زبان کے تحفظ اور بقا کی ہے، اردو پڑھنے والے ناپید ہو گئے (جیسا کہ ہوتا جا رہا ہے) تو وہ دن دور نہیں کہ وہ سارا پگڈنڈوی ادب اور ادب عالیہ بھی دھرا رہ جائے گا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ زبان اور رسم الخط پر توجہ نہیں کی جا رہی ہے تو آج تمہارا سارا ادب عالیہ چاہے وہ میر، غالب

،، امرا آوگا جان ادا۔ ساحر، اختر الایمان، رتن ناتھ سرشار،
ہی متعلق ہو وہ ہندی میں دستیاب اور مقبول ہو جا
، پھر کسی بچے کو یا غیر مسلم کو یا غیر اردو داں کو اردو بھی
ے سیکھنے یا پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اس پر توجہ نہ کی
مختلف ذرائع ابلاغ تمہاری شکل کو نیست و نابود کر لے
ہیں۔ اس کے لیے صرف دس سال کی مدت بہت کافی ہوگی۔
ب تو ضرورت ہے کہ رسم الخط پر اصرار کیا جائے۔ اس کو
انے کی کوشش جاری رکھی جائیں۔ دوسرے فلموں کے،
ے، مکالموں کے، کہانی کے، ٹی وی اور ریڈیو پروگراموں
واضح طور پر اردو کہلوائے اور نشر کرائے جائیں، اگر ایسا
اس پر اصرار کرتے ہوئے اس کے خلاف احتجاج کیا
مثلاً آج کل ٹی وی پر مختلف سیریز آرہی ہیں یہ سب
اردو پروگرام ہیں۔ ان کو ہندی کا نام دیا جاتا ہے یہ قطعاً
ہے، اسے اردو کہا جائے یہ دراصل نتیجہ ہے تمہارے
والوں کی ہر معاملے میں خاموشی اور بے حسی کا ـــــ وہ
ے معصوم زیادہ سے زیادہ یہ کرتے ہیں کہ پروگرام دیکھتے
کسی زیادہ معیاری لفظ پر خوش ہو لیتے ہیں کہ دیکھیے کتنی
ستہ اردو بول رہا رہی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ ہمدردی یہ محض
ناک ہی ہمارے اور ہمارے کلچر کے زوال کی علامت اور
ب ہے۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ تمہارے ہمدرد تمہارے
ے میں ایسی لچر سی دلیلیں دیتے ہیں جس سے احساس کمتری کے
لاوہ کچھ ظاہر ہی نہیں ہوتا۔ یہ سنتے سنتے لوگوں کے کان پک
ہیں کہ فلاں فلاں ہندو ادیب بھی دراصل اردو ادیب و
رہتے اور ہیں اس لیے اردو مسلمانوں کی نہیں۔ ہندوؤں کی
زبان ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اردو
مانوں کی وجہ سے نہیں آئی۔ یہ غلط ہے، یہ بات واضح طور علی
لان، ببانگ دہل اور جم کر کہنی چاہیے کہ ہاں اردو مسلمانوں کی
ن ہے اور مسلمان تیرہ کروڑ ہیں۔ پھر اردو ان غیر مسلموں کی بھی
ن بھی ہے جن کی تعداد کم از کم پندرہ کروڑ ہے۔ وہ لوگ اردو

کو اسی طرح سمجھتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں جس طرح مسلمان۔
پورے پنجاب کو جا کر دیکھ لیجیے۔ وہاں پنجابی کے بعد اردو
ہی کا بول بالا ہے۔ دکنی صوبوں میں بھی یہی حال ہے۔ جب یہ
بات کہی جائے گی تو اردو چند لوگوں کی زبان نہ سمجھی جائے گی۔
بلکہ اس کے بولنے والے اور سمجھنے والوں کی تعداد دو سے ۳۰
کروڑ تک ہوگی اور یہی دراصل اس وقت تمہاری شان ہے
یہ بات اگرچہ میرے خلاف جاتی ہے لیکن تمہاری کتنی ہی ترقی
ہو، میرا اور یہ کبھی کم ہونے والا نہیں ہے اور صرف جذبات بحث
میں ہی ان تلخ حقائق و کوائف کا اظہار کر دیا ہے ورنہ سیاسی
شعبدہ بازی کرتے کرتے تو بچے چالیس برس گزر رہے
ہیں۔

تم نے اپنے خط میں (RE-COGNISATION ECONOM.C)
کی بات کہی ہے۔ یہ مطالبہ بالکل درست ہے اس کے لیے جو کچھ
مجھ سے ہو سکے گا کر گزروں گی۔ تمہارے عاشقوں کو بھی چاہیے
کہ تجارت، بنکوں، دفتروں، ڈاکخانوں، ریلویز وغیرہ میں
تمہارے لیے آزادی اور سہولت پیدا کرائیں۔ ریلوے ٹائم ٹیبل
اردو میں دستیاب ہے مگر لوگ لیتے نہیں، منی آرڈر فارموں
میں اردو میں اندراجات ہیں لیکن اردو میں نہیں بھرتے، پتے
اردو میں نہیں لکھتے۔ یہ عادت ختم ہونی چاہیے۔ ہر دفتر میں کچھ
نہ کچھ اردو کے جاننے والے ہونا ضروری ہیں تاکہ درخواستیں
جوابات اور ٹائپ وغیرہ کی دشواری نہ ہو۔ ڈاکخانہ کے ہر
ملازم کے لیے اردو جاننا لازمی ہے۔ یہ دستوری بات ہے۔
لیکن بتایا جائے تقرری کے وقت افسران اس کا قطعی خیال
نہیں رکھتے کہ ہر پوسٹ مین بھی اردو سے واقف ہو۔ یہی وجہ
ہے کہ ہزارہا خطوط ضائع ہوتے ہیں لیکن اس سلسلے میں نہ کوئی
آواز ہے نہ تحریک۔ پرائمری اردو ٹیچرز کے سلکشن میں دو سے
پانچ ہزار تک رشوت کی اطلاعات سنی گئی ہیں۔ ۲ ہزار سے
زیادہ اسامیاں اب بھی خالی ہیں۔ انہیں اردو والوں سے ہی
بھرا جانا چاہیے۔ بچوں کا اور سستا مگر مفید ادب وجود
میں آنا چاہیے کہ تاکہ نئی نسلیں اردو سے بے بہرہ نہ رہیں مصنفین

اور ناشرین کو اکیڈمیوں سے امداد ملنے کے باوجود کتاب کی قیمت پر زیادہ نفع لینے سے فی الحال احتراز کرنا چاہیے، یہ ہوس ختم ہونی ضروری ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ ہندوستان ہی میں بعض وہ جگہیں جہاں کوئی میرا نام لینا بھی پسند نہیں کرتا تمہاری رسائی اور نفوذ وہاں تک بھی ہے، اگر گورنمنٹ انصاف سے جائزہ لے تو جس زبان کو اردو کہتے ہیں اسے پورے ملک کی دوسری سرکاری زبان بنانا لازمی ہو جائے گا۔ آخری بات یہ کہ تم کسی بھی قسم کے احساس کمتری کو اپنے اندر جگہ مت دو، اپنے بازوؤں کو مضبوط و مستحکم کرنے کی فکر میں لگی رہو۔ تمہارے اندر زبردست صلاحیت شیرینی اور صلابت ہے۔ توانائی کے اعتبار سے تم نوجوان ہو تمہارے اندر ابھی قوتِ نمو ہے، بیتا لوگوں کی مخالفت کی پرواہ مت کرو یہ تو مانسون کی طرح ہوتے ہیں۔ رہتے ہندوستان تک تمہیں چمکنا ہے۔ اس بات پر سب کو فخر ہے کہ ہندوستان کی اردو زبان دنیا کے بیشتر ملکوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، ان ملکوں میں صرف پاکستان ہی نہیں، انگلینڈ، امریکا اور فرانس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اور پھر میں یہ کہوں گی کہ تمہاری کم سرمایہ دار لیکن زیادہ خوش نصیب بہن میں موجود ہوں۔ میرا وجود ہی تمہاری اہمیت کی شہادت و ضمانت دینے کے لیے کافی ہے۔

مصروفیتوں کے باوجود میں نے چھٹی یے کو خط لکھنے کے لیے وقت نکالا یہ صرف تمہاری محبت تھی تاکہ تمہیں حقیقت سے آگاہی اور سکون و اطمینان ہو۔ لیکن میری اچھی سی بہت ہی اچھی بہن! اس خط کو پڑھتے ہی چاک کر دینا کیونکہ سچی بات کہنا اور اقتدار ہاتھ میں رکھنا متضاد امور ہیں۔

فقط

تمہاری اپنی بہن ہندی



علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی دانش گاہ تک سے تو مجھے ذریعہ تعلیم بناتے ہوئے ڈرتی ہے

اردو بنام ہندی

تمہارا محبت نامہ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ دل آسائی کے لیے میں تمہاری بے حد ممنون ہوں۔ اگرچہ اس میں بعض باتیں نامناسب اور تلخ بھی تھیں لیکن تمہاری حق گوئی اور اخلاص کی چاشنی نے انہیں بھی گوارا اور لطیف بنادیا۔ کچھ لمحوں کے لیے میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ برسرِ اقتدار جماعت میں میرے حامی افراد کی طرح تم بھی میری درخواست سے عدم التفات کا ثبوت دے دو لیکن تم نے واقعی بہن ہونے کا حق ادا کرنے کی کوشش کی اور بڑا خطرہ بھی مول لیا۔ یہی نہیں بلکہ سفر کی چھٹی لے کر مجھے خط لکھا۔

تلسی داس کا اردو کوی ہونا بلاشبہ ابھی تک مسلم نہیں ہے۔ لیکن حقائق کچھ اس قسم کے سامنے آرہے ہیں کہ رام چرت مانس اصلاً اردو رسم الخط میں ہی لکھی گئی تھی۔ بعد میں دیوناگری خط میں آئی ہے۔ یہ بحث تفصیل طلب بھی ہے اور قبل از وقت بھی، اس لیے آئندہ کسی موقع پر گفتگو ہوگی۔

میں اس کے لیے بھی تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے بعض اہم حقائق کا انکشاف کیا۔ مفید مشورے دیے اور بعض مسائل کو سلجھانے میں رہنمائی کی۔ البتہ چند مسائل کی بنیادی وجہ سمجھنے کی تم نے بھی کوشش نہیں کی۔ مثلاً ترقی اردو بورڈ سے شائع ہونے والی کتابیں یا مڈل تک اردو نصاب کی منظوری اور تیاری۔

جہاں تک مڈل کے نصاب کا تعلق ہے۔ یہ درست ہے کہ منظور ہوگیا تھا اور حساب وغیرہ کی کچھ کتابیں تیار بھی ہوئی تھیں لیکن مڈل تک اردو میڈیم اسی وقت کارگر ہوسکتا ہے۔ جب ہائی اسکول میں بھی اسے جاری رکھنے کی اجازت ہو اور اسی طرح اعلیٰ تعلیم تک انتظام ہو ورنہ مڈل پاس کرنے کے بعد کیا پھر تمہارے میڈیم میں آئیں؟ کیا دل بدلو کی طرح میڈیم بدلو کا بھی کوئی مستقبل ہے؟ دہلی بمبئی میں اس کی سہولت ہے تو نتائج مثبت ہیں۔ یوپی میں مڈل تک کی سہولت کی موجودہ صورت حال خاصی مشکوک ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی دانش گاہ تک تو مجھے ذریعہ تعلیم بناتے ہوئے ڈرتی ہے پھر کونسا ادارہ ہے جو میری اس حقیقت کو تسلیم کرے گا۔ کہاں تک روئیے۔ علی گڑھ میں انجینئرنگ، میڈیسین لا (قانون) اور ایم بی اے وغیرہ کے طلبا کے لیے تو میری حروف تہجی سکھانے کا انتظام نہیں۔ جبکہ میری مقبولیت اور کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ آئی اے ایس کے امتحان میں مجھے اختیار کرکے کئی طلبا کامیابی حاصل کرچکے ہیں لیکن اس کا ذکر تک نہیں ہوتا۔

میں نے تمہارا بہت وقت صرف کیا۔ اجازت چاہتی ہوں۔

"تمہاری شکر گزار بہن اردو"

(ماخوذ) ●●



اردو ہماری مادری زبان ہے اپنی مادری زبان کی بقا اور ترقی کے لیے جدوجہد کرنا، اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو دور کرنے کے لیے کوشش کرنا اور اس کے حقوق کی بازیابی و بحالی کے لیے مطالبات کرنا ہمارا جمہوری، اخلاقی اور آئینی حق ہے۔ اگر ہمیں اپنی زبان سے سچی محبت ہے اور صدق دل سے اس کی ترقی چاہتے ہیں تو ہم پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اپنے جمہوری حق کا استعمال کریں اور اپنی مادری زبان کو وہ مقام دلائیں جس کی وہ مستحق ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند، ریاستی اردو اکاڈمیاں اور ان گنت تنظیمیں و ادارے اپنے اپنے ذرائع اور وسائل کے بموجب کام کر رہے ہیں۔ اردو کاز کے لیے جدوجہد کا یہ عمل جاری ہے۔ کاروان اردو آگے بڑھ رہا ہے کبھی سست رفتار سے اور کبھی تیز گامی کے ساتھ، لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ ہماری ساری جدوجہد اور مساعی حکومت یا انتظامیہ سے مطالبات کرنے یا حقوق کی بھیک مانگنے تک محدود ہیں۔ اردو کے بنیادی مسائل آج بھی جوں کے توں موجود ہیں جیسے چالیس برس پہلے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس عرصہ میں اردو پر جو مظالم ہوئے جن ناانصافیوں سے کام لیا گیا اور اسے جتنی حق تلفیوں کا سامنا کرنا پڑا اس کی ذمہ داری اہل اقتدار پر عائد ہوتی ہے۔ اس ظلم و زیادتی یا ناانصافی و حق تلفی کے خلاف ــــ ارباب اقتدار سے احتجاج کرنا ضروری ہے اور جائز بھی۔ لیکن اس سے زیادہ ضروری اور اہم یہ ہے کہ ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہوں۔ اپنی مادری زبان کے تئیں اپنے فرائض کی انجام دہی میں ایمان دار ہوں اور اردو کاز کے لیے خلوص دل سے عملی جدوجہد

کریں۔ پنڈت آنند نرائن ملا کے بقول ــــ "جب تک ہم اپنا دل مضبوط نہیں کر پائیں گے اور تحریک کو منظم نہیں رکھیں گے اردو کی حالت نہیں بدلے گی۔"

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ زبانیں نہ تو حکومت کے سہارے زندہ رہتی ہیں اور نہ حکومت کے ختم کرنے سے ختم ہوتی ہیں۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو سنسکرت جس کے فروغ کے لیے کروڑوں روپے خرچ کیے جا رہے ہیں ملک کی مقبول ترین زبان ہوتی اور اردو جسے ختم کر دینے کی ہر کوشش کی گئی آج زندہ نہ ہوتی۔

زبان کی بقا اور ترقی کا انحصار اس کے بولنے والوں، اس کے پڑھنے والوں اور اس کے خادموں پر ہوتا ہے۔ ہمیں دیانت داری کے ساتھ اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھنا چاہیے کہ اردو کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں میں ہم کہاں تک شریک ہیں؟ اپنی مادری زبان کے تئیں ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی انجام دہی میں ہم کتنے مخلص ہیں؟ اردو تعلیم کے فروغ کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟

اردو پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے۔ وہ بچے جن کی مادری زبان اردو ہے، اردو سے ناآشنا ہوتے جا رہے ہیں۔ روزمرہ کے کاموں میں اردو کا چلن کم ہوتا جا رہا ہے۔ جن گھروں میں اردو کا بول بالا تھا، وہ گھر مٹ رہے ہیں۔ بہت سے اردو والے جن کا ذریعہ معاش اردو اور صرف اردو ہے۔ اپنے بچوں کو اردو پڑھانا پسند نہیں کرتے۔ اردو اخبار اور رسائل خرید کر پڑھنے میں ہمیں شرم آتی ہے۔ کیا یہ سب ذمہ داریاں بھی حکومت کی ہیں؟ ہم پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا؟ سوچیے اور فیصلہ کیجیے کہ ہمارا دامن کتنا اجلا اور بے داغ ہے۔

اگر ہم واقعی سچے دل سے اردو کے بہی خواہ ہیں اور اسے پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا اندازِ فکر اور طرزِ عمل بدلنا ہوگا۔ کاسۂ گدائی لے کر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بجائے خودداری اور خوداعتمادی کا راستہ اپنانا ہوگا۔ اردو کی بقا اور ترقی کا منصوبہ خود بنانا ہوگا اور اس پر عمل کرنا ہوگا۔ ہمیں سب سے زیادہ توجہ اردو تعلیم کے فروغ کی طرف دینا ہوگی۔ گاؤں، گاؤں، شہر، شہر اور محلہ، محلہ اردو کا پیغام پہنچانا ہوگا۔ اور یہ کام ایک مشن کی طرح انجام دینا ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اشتراکِ عمل اور باہمی تعاون کی ضرورت ہے۔ عزم و حوصلہ درکار ہے۔ نیک نیتی اور صدق دلی مطلوب ہے تبھی ہم مادری زبان کو زندہ رکھ سکتے ہیں اور سربلند ہو سکتے ہیں۔

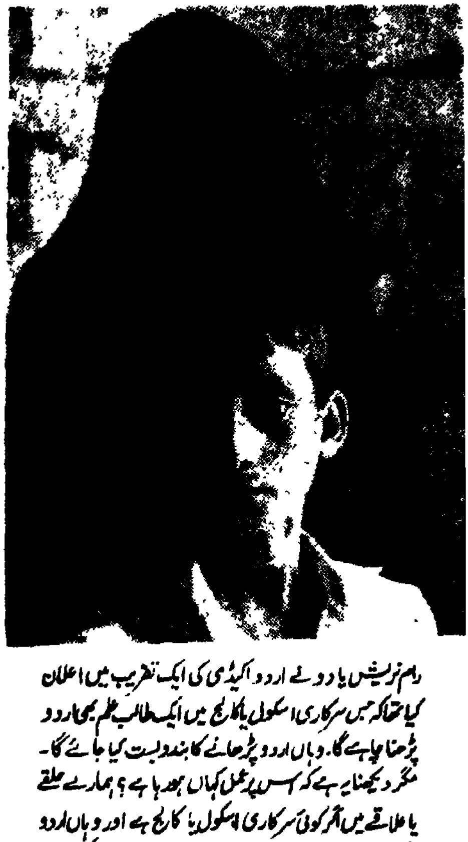
اردو کے مرکز (مثلاً روہیل کھنڈ، مرادآباد اور بریلی کمشنریاں) میں تھوڑا بہت اچھا یا برا کام کرنے کے بعد میرا تجربہ یا خیال یہ ہے کہ حالات اتنے مایوس کن اور مسائل اتنے پیچیدہ نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ اردو کے بنیادی اور اہم مسائل توجہ طلب اور مشکل ہیں جن کے حل کے لیے جدوجہد جاری ہے۔ لیکن بعض ضمنی اور نسبتاً چھوٹے مسائل ایسے بھی ہیں جنہیں ہم اپنی پرخلوص جدوجہد سے حل کر سکتے ہیں۔ پیشِ نظر تحریر میں بعض ایسے ہی مسائل پر عام فہم بلکہ عامیانہ زبان میں اردو دوستوں سے گفتگو کی گئی ہے جو ان کی ذرا سی توجہ اور تھوڑی سی کوشش سے دور ہو سکتے ہیں۔

تدریس اور تعلیم ہی اردو کا سب سے اہم اور سنگین مسئلہ ہے۔ آزادی کے سورج نے سب سے زیادہ نقصان اردو تعلیم کو پہنچایا۔ اگر ہم اپنی کوششوں اور کاوشوں سے اس میدان میں کامیابی حاصل کر لیں تو رفتہ رفتہ اردو کے دیگر مسائل بھی حل ہو جائیں گے لیکن قربانی اور مسلسل جدوجہد کے بغیر کامیابی کے خواب دیکھنا خوش خیالی ہے۔ تعلیمی اداروں میں اردو زبان کی تدریس کے لیے ہمیں سخت محنت کرنا ہوگی۔ پرائمری اور ثانوی درجات کی سطح پر اردو بحیثیت مضمون پڑھنے اور پڑھانے کی بات جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ جس سطح پر اور جن شرائط کے ساتھ ہمیں سہولتیں دینے کا اعلان کیا جاتا رہا ہے وہیں دشواریاں اور مشکلات حائل ہیں۔ تقسیم سے پہلے جیسی صورتِ حال یا آٹھویں درجہ تک اردو زبان کی تعلیم لازمی ہونے کی منزل ابھی بہت دور ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ جہاں جہاں اور جس جس سطح پر ریاستی حکومت نے اردو کی تعلیم کی سہولتیں دینے کا اعلان کیا ہے، وہاں اردو تعلیم کے اجرا کے لیے بھرپور جدوجہد کریں۔ سابق ریاستی وزیراعلیٰ مسٹر

اپنے پیش نظر رکھیے کہ ہمارے جمہوری نظام میں افسر شاہی اور لال فیتہ شاہی کے باعث ہمارے ان کاموں میں بھی غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے۔ جو حکومت کے مفاد میں ہوتے ہیں اور جن میں افسروں اور کلرکوں کی دلچسپی کا سامان بھی ہوتا ہے۔ مثلاً انکم ٹیکس سیلس ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، بجلی ٹیکس، واٹر ٹیکس وغیرہ کی شکل میں ہم حکومت کو رقم فراہم کرتے ہیں۔ اس رقم کے جمع کرنے میں ہمیں کتنی دشواریوں اور منزلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فائیلوں کے پیچھے کتنا بھاگنا پڑتا ہے اور متعلقہ افسروں کو کیسے کیسے رام کرنا پڑتا ہے اس کا تجربہ ہم میں سے ہر ایک کو ہے یہ مشکلات تو اس صورت میں پیش آتی ہیں جب کہ اس میں محکمہ کی دلچسپی بھی ہوتی ہے اور ذمہ داران محکمہ کی بھی۔ پھر ذرا سوچیے ایسا کام جس میں حکومت کی بھی دلچسپی نہیں افسروں کی بھی نہیں اور کارندوں کی بھی نہیں۔ کتنا صبر طلب اور دشوار گزار ہوگا؟ کتنے پل صراط طے کرنے ہوں گے؟ خود اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن جس طرح آپ پہلے کام کی خاطر پاپڑ بیلتے ہیں دوسرے کام میں بھی اتنی ہی دلچسپی لیں تو مایوسی اور ناکامی کا کوئی سبب نہیں ہے۔

غیر سرکاری تعلیم گاہوں میں اردو تعلیم کے اجرا کے لیے قانون سے زیادہ ترغیب حکم سے زیادہ گزارش اور رعب سے زیادہ اخلاق سے کام لے کر راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔ اسکول یا کالج کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیجیے ان کی غلط فہمیاں دور کیجیے۔ حسن اخلاق اور حسن سلوک سے دشمن بھی رام ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہم اردو کی مٹھاس، شائستگی، تہذیبی قدر و قیمت کا احساس دلا کر غیر مسلم بچوں کو بھی اردو پڑھنے پر رضامند کر سکتے ہیں جیسے جیسے فاصلے کم ہوں گے منزل قریب آتی جائے گی۔

یہاں اپنی تلخ نوائی کی معذرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کر دینا بھی ضروری ہے کہ جن تعلیم گاہوں میں اردو پڑھانے کا بندوبست نہیں ہے وہاں اردو تعلیم کے اجرا کے لیے ہم زور و شور سے مطالبہ کرتے رہتے ہیں لیکن جن اداروں میں یا جس سطح پر ہمیں یہ آسانیاں حاصل ہیں وہاں ہم کیا کر رہے



رام نریش یادو نے اردو اکیڈمی کی ایک تقریب میں اعلان کیا تھا کہ جس سرکاری اسکول یا کالج میں ایک طالب علم بھی اردو پڑھنا چاہے گا۔ وہاں اردو پڑھانے کا بندوبست کیا جائے گا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس پر عمل کہاں ہو رہا ہے؟ ہمارے حلقے یا علاقے میں اگر کوئی سرکاری اسکول یا کالج ہے اور وہاں اردو پڑھانے کا انتظام نہیں ہے تو یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس اسکول میں یہ انتظام کرائیں۔ سب سے پہلے وہاں اردو پڑھنے والے بچوں کا داخلہ کرانا چاہیے۔ ان کی معقول تعداد ہونے کے بعد اسکول کے انتظامیہ بیک شکشا ادھیکاری، ضلع انسپکٹر آف اسکولس، ڈپٹی ڈائرکٹر سے رجوع فرمائیں۔ اور اپنی کارگزاری سے یوپی اردو اکیڈمی اور اپنے علاقے کی فعال اردو انجمنوں کو مطلع کیجیے۔ ابتدا میں دشواریاں ہو سکتی ہیں لیکن اس تلخ حقیقت کو

ہیں؟ اس نقطۂ نظر سے جب ہم اپنا محاسبہ کرتے ہیں تو دوسروں کو الزام دینے کے بجائے خود کو قصوروار ٹھہرانے پر مجبور ہیں۔ یوپی سرکار نے سنہ ۱۹۷۲ء میں شہری اسکولوں میں اردو تعلیم کی سہولت کا سامان فراہم کیا اور لگ بھگ ۴ ہزار اردو ٹیچر کا تقرر ہوا۔ یہ ایسا موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر ہم ریاست میں تعلیمی انقلاب لا سکتے تھے۔ ۴ ہزار اردو ٹیچر اگر یہ عہد کر لیتے کہ ہم ہر سال کم از کم پانچ مزید بچوں کا داخلہ مزید کرائیں گے تو آج اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں کتنا اضافہ ہو گیا ہوتا؟ کتنے اردو ٹیچرز کی مزید تقرریوں کا امکان ہو گیا ہوتا اور صورت حال میں کتنی تبدیلی ہو گئی ہوتی؟ لیکن غیر محفوظ اور غیر مستقل اردو اساتذہ نے کوئی جنبش نہیں کی اور ان کا سارا جوش و خروش اپنی تنخواہوں، سہولتوں اور حقوق کے مطالبات تک محدود رہا تو غیر متعلق محبان اردو کے کانوں پر جوں کیوں رینگتی؟

ثانوی درجات میں اردو تعلیم کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ یوپی ایجوکیشن بورڈ کی "ماڈل تیا سبق" اس راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ طالب علم مہیا ہو جاتے ہیں، انتظامیہ راضی ہو جاتے ہیں۔ بنیادی شرائط پوری کر دی جاتی ہیں لیکن "ماڈل تیا سبق" کی ضد اور ہٹ دھرمی برقرار رہتی ہے۔ اس ضمن میں ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ پرائمری اور ڈگری سطحات میں اردو تعلیم کے اجرا کے لیے جو مراعات دی گئی ہیں، ثانوی درجات میں بھی ملنا چاہئیں۔ اتر پردیش ایجوکیشن بورڈ کو یہ ہدایت کی جانی چاہیے کہ اس کی ماڈل تیا سبق غیر مشروط طور پر اور بلا تاخیر اردو پڑھانے کی سہولت فراہم کرے۔

ڈگری درجات کی سطح پر یہ رعایت دی گئی تھی کہ جس کالج میں کم از کم ۱۵ طالب علم اردو پڑھنا چاہیں، اس کالج کی طرف سے باقاعدہ درخواست موصول ہونے پر اردو پڑھانے کا بندوبست کیا جائے گا۔ اگر ہم اردو والے تھوڑی سی محنت کریں تو کامیابی کا ملنا دشوار نہیں۔ ڈگری کالجوں کے اسٹاف کی تنخواہ سرکار دیتی ہے (یوپی سرکار نے لیکچرر کے تقرر کی تاریخ سے ہی گرانٹ دینے کا اعلان کیا تھا) یوجی سی کی طرف سے عائد کردہ شرط کے بموجب کتابیں خریدنے کے لیے رقم فراہم کرنے کی ذمہ داری اتر پردیش اردو اکاڈمی نے قبول کر لی ہے۔ سوال صرف طلبا کی فراہمی کا رہ جاتا ہے جسے پورا کرنا اردو والوں کا فرض ہے، حکومت کا نہیں۔ اتر پردیش اردو تعلیمی جائزہ کمیٹی نے جدوجہد کر کے روہیل کھنڈ یونیورسٹی کے سات کالجوں میں اردو تعلیم کے اجرا کی منظوری حاصل کی۔ اردو والوں کی جدوجہد سے مرادآباد کے چار ایسے کالجوں میں اردو شعبے قائم ہو گئے جہاں اردو کا نام لینا گناہ تھا۔ گلاب سنگھ ڈگری کالج چاندپور میں اردو والوں کی کوتاہی کی وجہ سے غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ وہاں اب آسامی مشتہر ہوئی ہے لیکن اس سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ گورنمنٹ گرلز کالج بریلی اور کنیا مہا ودیالیہ بریلی میں یونیورسٹی کی طرف سے ضابطے کی کارروائی پوری ہونے اور اجازت دے دینے کے باوجود محض اردو والوں کی غفلت سے اردو تعلیم کا اجرا ممکن نہیں ہو سکا۔ مرادآباد، بریلی اور بجنور میں حالات یکساں ہیں، یونیورسٹی بھی ایک ہے۔ تینوں ایک ہی حکومت کے زیر سایہ ہیں۔ محض عمل اور بے عملی کے باعث نتائج ایک جیسے برآمد نہیں ہوئے۔ قصور کس کا ہے۔ یونیورسٹی کا؟ حکومت کا؟ یا خود ہمارا؟

تعلیمی سطح پر اس غلط نظریے کی تردید اور مذمت بھی ضروری ہے کہ ہم اردو پڑھ کر کیا کریں گے؟ ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ اقتصادی یا معاشی پہلو سے اردو ہمیں کیا دے سکتی ہے؟ اس طرح کے خیالات و نظریات رکھنے والوں کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ جب کوئی طالب علم ہائی اسکول، انٹر یا بی۔ اے کرنے کے بعد کسی شعبے میں جانے کی کوشش کرتا ہے تو آگے بڑھنے میں اس کے نمبر یا ڈویژن مددگار ہوتی ہے۔ مضامین کا سوال تو بہت کم یا خاص شعبوں میں اٹھتا ہے۔ اردو مضمون کے ساتھ فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والے طالب علم کو دس یا دلگے میں اردو کی وجہ سے کب اور کہاں نقصان پہنچتا ہے؟ سائنس یا دیگر مضامین کے ساتھ تھرڈ ڈویژن کے حامل طالب علم کو کس شعبے یا محکمے میں اردو نہ پڑھنے کی بنا پر

ترجیح یا فوقیت دی جاتی ہے۔ اس ملک میں ہزاروں انجینئر ڈاکٹر اور سائنسداں بے روزگار ہیں۔ یہ بے روزگار ڈاکٹر یا انجینئر اپنے مضامین کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے۔ رونا روتے ہیں تو اپنی بدنصیبی کا۔ رشوت خوری، بدعنوانی، جانب داری، اقربا پروری اور کرپشن کا یا اس نظام کا جس کی وجہ سے وہ ناکام ہیں۔ لیکن اس کا کوئی اردو والا بے روزگار ہے یا زندگی کی دوڑ میں پیچھے ہے تو وہ بلاتکلف، اپنی نااہلی یا بدنصیبی کا ذمہ دار اردو کو ٹھہرا دیتا ہے۔ اور اس کی گردن مارنے پر آمادہ رہتا ہے۔ یہ طرزِ عمل اور اندازِ فکر کہاں تک درست اور جائز ہے؟ اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اردو پڑھنے سے معاشی اور اقتصادی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تب بھی ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اگر ہمیں اپنی مخصوص تہذیب، مخصوص تمدن، مخصوص تاریخ، مخصوص کردار، شائستگی و شگفتگی، فصاحت و نفاست کو برقرار رکھنا ہے تو ہمیں اپنے بچوں کو اردو پڑھانا ہوگی۔ اردو سے ناواقف بچہ نہ اپنا نام صحیح طور پڑھ سکتا ہے، نہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے باخبر رہ سکتا ہے، نہ اپنے کلچر کو برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ ان معنوں میں مہذب اور شائستہ ہو سکتا ہے جو اردو سے عبارت ہے۔

سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں اردو کا چلن نہ ہونے کی شکایت سو فیصد درست ہے جب تک حکومت اردو کو قانونی حقوق یا سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیتی یہ صورت حال باقی رہے گی۔ اس تصویر کا ایک رخ اور بھی ہے اور اس کی ذمہ داری خود اردو والوں پر ہے۔ جن محکموں یا اداروں میں حکومت کی طرف سے سہولت دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر جہاں جہاں ہم اردو کا استعمال کر سکتے ہیں وہاں ہم اس ذمے داری کو کس حد تک نبھاتے ہیں؟ جن محکموں میں اردو استعمال کرنے کی اجازت (وقت طلب اور صبر آزما سہی) وہاں اگر ہم اردو والے اردو کا ہی استعمال کرنے پر ڈٹ جائیں تو حالات کبھی نہ کبھی موافق ہو ہی جائیں گے۔ مثال کے طور پر اگر ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ آج سے ہم ساری خط و کتابت اردو میں کریں گے تو ہمیں کون روک سکتا ہے؟ یہ ممکن ہے کہ ایک یا دو یا ایک درجن دو درجن خطوط غائب ہو جائیں یا تاخیر سے ملیں لیکن جب ہزاروں لاکھوں خطوط اردو میں لکھے جائیں گے تو محکمے والے بھی اردو داں حضرات تلاش کرنے پر مجبور ہوں گے اس سے اقتصادی طور پر بھی اردو والوں کو فائدہ پہنچے گا اور اردو کا چلن بھی عام ہوگا۔ خطوط کے ضائع ہونے کا تو خدشہ ہے بھی، لیکن رجسٹری، منی آرڈر وغیرہ میں تو یہ خدشہ بھی نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اردو میں پتہ لکھنے میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔ وہی سہل پسندی اور احساس کمتری ہمارے آڑے آتی ہے۔ اگر ہم اس کا شکار نہ ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی نہ ملے۔ یہ عمل ہر محکمے اور ہر شعبے میں دہرایا جا سکتا ہے۔ رہی دشواری کی بات تو یہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ایک قومی المیہ ہے اور اس سے بچ کر بھاگ نہیں سکتے۔ یہ صورتِ حال سنبھل میں تھی اور اب بھی ہے لیکن مسلسل جد و جہد کی بدولت

اُردو آبادی مُلک کی تہذیب و تمدّن کا اٹوٹ حصّہ ہے

اب یہاں کے بینکوں، پوسٹ آفس اور دیگر محکموں میں پہلے جیسی ضد نہیں ہے اردو میں لکھے گئے چیک، درخواستیں، منی آرڈر اور عرضداشتیں قبول کر لی جاتی ہیں اور اردو میں کام کرنے کا عام رجحان بڑھا ہے۔ اگر یہ تجربہ ہر شہر اور ہر محکمہ میں کیا جائے تو ہم کہاں سے کہاں پہنچ سکتے ہیں؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں اردو کو اس کا جائز مقام دینے کا مطالبہ بھی جمہوری اور آئینی ہے۔ اردو آبادی ملک کی تہذیب و تمدّن کا اٹوٹ حصہ ہے۔ اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کے ذریعہ ملک کی تہذیب، ثقافتی اور سماجی زندگی میں اپنا موثر رول ادا کرے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن ترسیل کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ ان مراکز میں اردو کو ہندی کے بعد سب سے زیادہ وقت ملنا چاہیے۔ اہم مراکز سے نشر ہونے والے اردو پروگراموں میں قابلِ لحاظ اضافہ ہونا چاہیے اور ہر اہم اسٹیشن اور ٹیلی ویژن سینٹر سے اردو اسباق اور اردو میں علاقائی خبریں نشر کرنے کا انتظام کیا جانا چاہیے۔ کہ اردو داں علاقے مثلاً حیدرآباد، بھوپال، رامپور، نجیب آباد کو اردو سروس کے طرز پر اردو پروگراموں کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ یہ مطالبے اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہر اردو دوست اس طرف توجہ دے۔ ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے پروگرام سننے والوں کے خطوط اور ان کے مشوروں کی بنیاد پر ترتیب دیے جاتے ہیں ہم اردو والے اوّل تو اردو پروگرام سننے کے عادی نہیں ہیں اور ہیں بھی تو اردو پروگراموں کے بارے میں اپنی رائے یا ردِ عمل کا اظہار خطوط کے ذریعہ نہیں کرتے۔ ہمارے خطوط فلمی گانے، فرمائشی گیتوں، قوالیوں اور اس طرح کے دوسرے پروگراموں تک محدود رہتے ہیں۔ اگر کسی بات کے لیے سنجیدگی سے آواز اٹھائیں اور جدوجہد کرتے رہیں تو کامیابی ضرور ملتی ہے۔ آکاشوانی رامپور سے اردو پروگرام شروع کرنے کا مطالبہ سب سے پہلے محبانِ اردو کانفرنس سنبھل میں ۱۹۷۴ء میں کیا گیا تھا اور اس وقت یہ مطالبہ ہوائی نظر آتا تھا لیکن مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں کامیابی ہوئی آج اس اسٹیشن سے ۲ منٹ روزانہ، ہر اتوار کو ۱۵ منٹ کا اردو پروگرام نشر ہوتا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہونے والے پروگراموں کو سنیں، ان کے بارے میں ریڈیو اسٹیشن کے اسٹیشن ڈائرکٹر کے نام خطوط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کریں اور ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو، آکاشوانی بھون، نئی دہلی اور وزیر اطلاعات و نشریات مرکزی حکومت نئی دہلی کے پاس زیادہ سے زیادہ خطوط بھیج کر یہ مطالبہ کریں کہ آل انڈیا کے مختلف مراکز اور ٹی وی سینٹروں کے اردو پروگرام میں قابلِ لحاظ اضافہ کیا جائے۔ آپ کے ہزاروں لاکھوں خطوط ہی نشریاتی اداروں



میں اردو کو اس کا صحیح مقام دلا سکتے ہیں۔

سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ ہم خود اپنے دل میں اپنی مادری زبان کو اس کا صحیح مقام دیں۔ حکومت یا اقتدار اردو کے حقوق سلب کر سکتا ہے تعلیمی اداروں سے اس کا اخراج ممکن ہے۔ سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں اس کا چلن ختم کیا جا سکتا ہے لیکن اردو والے اپنے دل میں اس کی عظمت و اہمیت بٹھا دیں تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی افسوس تو یہ ہے کہ صورتِ حال اس کے برعکس ہے یا تو ہم ضرورت سے زیادہ احساسِ کمتری کا شکار ہیں یا مصلحت اندیشی و مفاد پرستی کے مارے ہوئے ہیں۔ دور کیوں جایئے ہم اردو کے اساتذہ و طلبا اردو سے اپنا رشتہ جوڑتے ہوئے شرماتے ہیں کوئی پوچھ بیٹھے تو اس انداز سے جواب دیتے ہیں۔ جیسے اعترافِ گناہ کر رہے ہوں۔ اپنے گھروں میں اردو اخبارات و رسائل منگوانے کے بجائے انگریزی اخبارات و رسائل کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ قوت خریدنے والے مجاہدین یا محبان اردو کا حال ہے۔ عام لوگ بھی اس سے مبرا نہیں، اسٹیشنوں، ہوٹلوں بازاروں اور بس کے اڈوں پر آپ کو ایسے لوگ کثیر تعداد میں مل جائیں گے۔ جو انگریزی یا دوسری زبانوں کے رسائل وغیرہ خرید کر ساتھ رکھنا باعثِ فخر سمجھتے ہیں، چاہے انہیں ان زبانوں کے حروفِ تہجی سے بھی آگاہی نہ ہو۔ اسی طرح بعض لوگ اپنے نام کی پلیٹیں یا دکانوں پر سائن بورڈ میں اردو لکھنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ شاید انہیں یہ خوش فہمی یا خوش خیالی ہوتی ہے کہ اردو نہ لکھنے سے اس کے بزنس پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ حالانکہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ ایماندار ہیں اور صاف ستھری تجارت پر یقین رکھتے ہیں تو آپ کسی بھی زبان کا استعمال کریں، کاروبار اچھا چلے گا۔ (امین آباد لکھنؤ کی برما بکری اس کی زندہ مثال ہے) اسی طرح کاروبارِ حیات کے ہر شعبے میں ہم اردو والے اردو کو نظر انداز کرنے کا فیشن ختم کر دیں اور زیادہ سے زیادہ اردو کا استعمال کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو کا چلن عام نہ ہو جائے۔ جب چلن عام ہوگا تو ہر شعبے میں اردو داں افراد کی ضرورت ہوگی اور اردو کا رشتہ روزی اور روٹی سے خود بخود جڑ جائے گا۔ مثلاً اردو میں لیٹر پیڈ چھپوانے، نام کی تختی لکھوانے اور سائن بورڈ اردو میں بنوانے میں، اردو پریس، اردو کمپوزر یا اردو کاتب، اردو پینٹر کی ضرورت پڑے گی اور اردو والوں کے روزگار میں اضافہ ہوگا۔

آخر میں ہر اردو دوست سے میری مخلصانہ اپیل ہے کہ وہ مادری زبان کی بقا و ترقی کے لیے اپنی ذمے داریاں نبھانے سے گریز نہ کرے اور ہمہ وقت قربانی و ایثار کے لیے تیار رہے روزمرہ کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ اردو کا استعمال کرے اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالے۔ اردو انجمنوں و تنظیموں کو فعال و موثر بنانے میں موثر رول ادا کرے اپنی آمدنی کا ایک یا دو فیصد حصہ اردو تحریک، اردو اخبارات و رسائل یا اردو کتابوں کے لیے وقف کرے۔ اگر اس میں یہ شعور (یہ بیداری) اور یہ احساس پیدا ہو جائے تو اردو کا یہ پودا لہلہاتے ہوئے سدا بہار درخت میں تبدیل ہو جائے گا اور اس کے مسائل آہستہ آہستہ حل ہو جائیں گے۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

●●

غالب سے پروین شاکر تک

منتخب اشعار

(ادارہ)

آرزو

- نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ
(غالب)

- پہلے تیری محبتیں چُن کر، آرزو کے محل سجاتے تھے
بے نیازانہ زیست کرتے تھے، صرف تجھ کو گنگناتے تھے
(مصطفےٰ زیدی)

- اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تُو نے آئینہ تمثال دار تھا
(غالب)

- مرگِ آرزو پر اب دل لہو نہیں روتا
راس آ گئے دل کو زندگی کے غم شاید
(عرفانہ عزیز)

- بے تابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو
آخر بچے نہ اُس نگہِ بدگماں سے ہم
(حسرت موہانی)

- کسی طرح دن تو کٹ رہے ہیں فریبِ اُمید کھا رہا ہوں
ہزار ہا نقش آرزو کے بنا رہا ہوں مٹا رہا ہوں
(رضا علی وحشت)

- آرزو اُن کی، طلب اُن کی، تمنا اُن کی
کتنی رونق ہے مری زیست کی ویرانی میں

- ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بُو
سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو
(اقبال)

- یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں
(فیض)

- پھولوں کی آرزو تھی ملے خارزارِ غم
مجھ پہ ہی میری سوچ کی دیوار گر گئی
(نامعلوم)

- بڑے خلوص سے ہم نے کیا تھا عہدِ وفا
خطا معاف کہ اب تیری آرزو بھی نہیں

- جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے!
(خواجہ حیدر علی آتش)

- خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے
(علامہ اقبال رح)

- اب کوئی آرزو نہیں ذوقِ پیام کے سوا
اب کوئی جستجو نہیں شوقِ سلام کے سوا!
(حفیظ ہوشیارپوری)

- حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی
(علامہ اقبال)

- ہم نے تجھے سُنا تو دیا حرفِ آرزو
یہ اور بات ہے کہ وضاحت نہ کر سکے
(شفقت کاظمی)

- ہر سوالِ آرزو کا ہے جواب اِک بازگشت
سُننے والے ہی سُنیں شاید مری آواز کو
(تابش دہلوی)

- نظر آتا نہیں دل کی رگوں میں کچھ لہو مجھ کو
بہت مہنگی پڑی نشو و نمائے آرزو مجھ کو
(مظفر شاہجہاں پوری)

- ترے غم کو نشاطِ جستجو کہنا ہی پڑتا ہے
شکستِ آرزو کو آرزو کہنا ہی پڑتا ہے
(یزدانی جالندھری)

- یزداں نے مُسکرا کے بڑی دیر میں لکھا
اِک حرفِ آرزو مرے دل کی کتاب میں
(ساغر صدیقی)

- غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مرے شوق کی بلندی، مری ہمتوں کی پستی
(حسرت موہانی)

- ترے خیال، تری آرزو کے بعد اے دوست
ٹھہر سکا نہ نگاہوں میں کوئی بھی عالم!
(نامعلوم)

- بے نام آرزو کا تعاقب ہے، کیا غلط
سُنتا نہیں ہے کوئی تو کہنا بھی چھوڑ دے
(حافظ محمد اکبر)

- تجھ کو پانے کی آرزو کرنا
آندھیوں میں دیے جلانا تھا
(شاہینہ اعجاز)

- خوشیوں کی آرزو ہے دلِ داغ داغ میں
کچھ پھول کھل گئے ہیں شرارتوں کے شہر میں
(نامعلوم)

- تیری یادوں سے پیار کرتے رہے
آرزو کے بہار کرتے رہے!
(جمیل گنگوری)

- چراغِ شامِ آرزو بھی جھلملا کے رہ گئے
ترا خیال راستے سُجھا سُجھا کے رہ گیا!
(ناصر کاظمی)

- اب دل کی خلوتوں میں تم آ کے کیا کرو گے
ہم آرزو کی شمعیں کب کی بُجھا چکے ہیں!

- زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے
وہ خود اگر کہیں ملتا تو گفتگو کرتے
(مصطفےٰ زیدی)

- وہ آرزو سے ملا جب کچھ آرزو نہ رہی
گئی نہ ملنے کی جب تک کہ آرزو نہ ملا
(حضرت مذاق)

- تجھ سے میری زندگی، سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو!
پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو!
(اقبال)

- کتابِ آرزو ہے میرا چہرہ
زباں پر آئے حرفِ مدعا کیا
(حامد یزدانی)

- یہ ناز ہے کہ تری آرزو میں جیتے ہیں
یہ فخر ہے کہ تری ذات سے تعلق ہے
(عبدالحمید عادم)

- کوئی آرزو نہیں ہے کوئی مدعا نہیں ہے
تیرا غم رہے سلامت مرے پاس کیا نہیں ہے
(شکیل بدایونی)

- یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

- نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے
(آتش)

- آتشِ آرزو عجب شے ہے
اس کی ٹھنڈک میں جل کے دیکھ کبھی

- یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے، مگر ہمدم!
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں
(فیض)

- کوئی دن ایسا نظر آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے! نگار خانہ ہے آرزو کا
(اقبال)

- چشمِ حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے
آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے
(اقبال)

- فسانے دورِ محرومی کے دہرائے نہیں جاتے
کچھ ایسے زخم ہوتے ہیں جو دکھلائے نہیں جاتے
(نامعلوم)

- تمنا، آرزو، چاہت، اُمیدِ وصل اور حسرت
یہ لاشے رکھ لئے جاتے ہیں دفنائے نہیں جاتے

- عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں!
(بہادر شاہ ظفر)

- ٹوٹا طلسمِ عہدِ محبت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے
(نامعلوم)

- میں اور اُس غنچہ دہن کی آرزو
آرزو کی سادگی تھی، میں نہ تھا
(عدم)

- تجھے تو میں نے بڑی آرزو سے چاہا تھا
یہ کیا کہ چھوڑ چلا تو بھی اور سب کی طرح
(احمد فراز)

دل ہی تو ہے



● اثر ایسا الٰہاں سے لاؤں یا رب نالۂ دل میں
جو اس بے مہر کو بھی راہِ غم سے آشنا کر دے
(حسرت موہانی)

● دل میں تکلفات کے خنجر گڑے رہے
ہونٹوں پہ اہتمامِ تبسم کیا بھی تھا!
(انور)

● دل بے حوصلہ ہے اِک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا!
(یاس یگانہ)

● اِک دل کا درد ہے کہ رہا زندگی کے ساتھ
اِک دل کا چین تھا کہ سدا ڈھونڈتے رہے
(جاں نثار اختر)

● یوں بے رُخی سے پیش نہ آ اہلِ دل کے ساتھ
اٹھ کر چلے نہ جائیں تری انجمن سے ہم!
(حمایت علی شاعر)

● دل کا ہاتھ میں لے حجِ اکبر جان لے
ایک دل کو لاکھ کعبے کے برابر جان لے
(میر انیس)

- وہ کہہ رہے ہیں وفا کچھ نہیں وفا کیا ہے؟
نہ جانے اب دلِ مضطرب کا فیصلہ کیا ہے؟
(سید اظہار الحسنین)

- دل کو یہ وہم کہ وہ بھول گیا ہے مجھ کو
پھر بھی یہ آس کہ وہ اذنِ رسائی دے گا

- آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
(غالب)

- لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا
(غالب)

- پیکرِ رنگ جس کے تعاقب نے بے گھر بنا یا مجھے
بس گیا میرے دل کے شبستان میں خوشبوؤں کی طرح
(محمد جلیل عالی)

- دل کے گیانگر سے ہم کو ملا تھا جب نروان
رانا جی تو اس لمحے سے بن گئے ہم بھگوان
(راشد حسن رانا)

- یہ جو گھر لٹا لٹا ہے یہ جو دل بجھا بجھا ہے
اسی دل میں رہ گئے ہیں کئی آفتاب ڈھل کے
(ناصر کاظمی)

- کاش کرتے کوئی ویرانیٔ دل کا بھی علاج
چاند پر جا کے نئے شہر بسانے والے
(اشرف شاہین)

- کچھ دل ہی بے نیاز سا ہو گیا ہے اب
کچھ تیرے غم میں پہلی سی لذت نہیں رہی
(فرناز ملک)

- پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
(اقبال)

- جو دل وِل کے لینے کے ڈھب جانتے ہیں
وہ ترکیب در کیب سب جانتے ہیں
(مضطر خیر آبادی)

- اس کے دل پر بھی کڑی عشق میں گزری ہو گی
نام جس نے بھی محبت کا سزا رکھا ہے
(ناصر کاظمی)

- سادہ دل چارہ گروں کو نہیں معلوم فراز
بعض اوقات دلاسے بھی بلا ہوتا ہے
(احمد فراز)

- مٹ گئی بربادیٔ دل کی شکایت دوستو
اب گلستاں رکھ لیا ہے میں نے ویرانے کا نام
(ساغر صدیقی)

- سر سے سودا گیا محبت کا
دل سے پر اس کی بے کلی نہ گئی
(منیر نیازی)

- دل کے آئینے میں تصویر سجا لی تیری
اپنی ہستی میں تری ذات کو پانے کے لئے
(عابدہ تحسین)

- بھنورے، بلبل، عاشق، شاعر سب کا دل بہلائے پھول
چاک اپنے سینے کے لے کر کس کے سامنے جائے پھول
(شوکت علی اکبر)

- خانہ بدوش اور ازل سے غریب تھا
دل کا بتاؤں تجھ کو بھلا آشیاں کہاں؟
(میر سوز)

- تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
  اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر!

- وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
  کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا
  (اقبال)

- قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل
  التجائے ارنی سرخیٔ افسانۂ دل
  (اقبال)

- عرش کا ہے کبھی کعبے کا ہے دھوکا اس پر
  کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل
  (اقبال)

- ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی
  میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا
  (غالب)

- خوب کیا یہ اپنے چارۂ اضطرارِ دل
  سینے پہ رکھ کے دستِ ناز کھینچ لیا قرارِ دل
  (ضیا بدایونی)

- دل گیا رونقِ حیات گئی
  غم گیا ساری کائنات گئی
  (جگر مراد آبادی)

- دیر ہوئی آنے میں تم کو خیر ہے پھر بھی آئے تو
  صبر کا دامن دل سے نہ چھوٹا کہنے کو گھبرائے تو
  (عندلیب شادانی)

- تنہائیوں کی آگ میں جلتا ہے رات دن
  گویا کہ دل بھی ایک دیا ہے مزار کا

- اچھا نہیں ہے یوں دلِ سوزاں کو چھیڑنا
  جلتے ہوئے چراغوں سے کھیلا نہ کیجئے

- وہ کوئی اور عالم تھا وہ کوئی اور دنیا تھی
  ارے اب تو حسابِ دوستاں [illegible]
  (نامعلوم)

- تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
  نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
  (اقبال)

- تری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
  کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ!
  (اقبال)

- دل کو دیوانہ بنانے کا ہے موقع اب کہاں
  ہوش میں دنیا کو لانے کا زمانہ آگیا
  (سیماب اکبر آبادی)

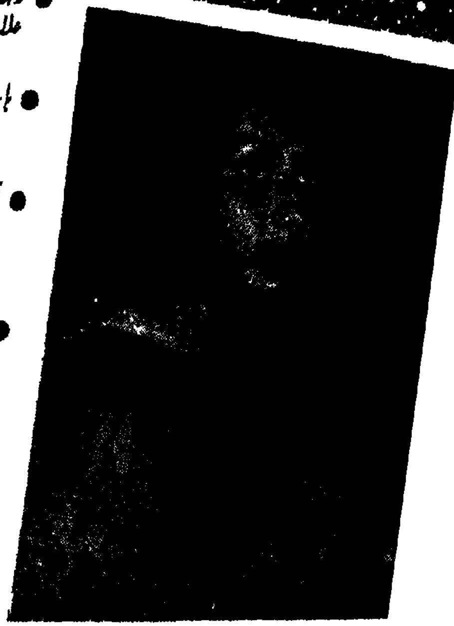
- قدم شوق بڑھے ان کی طرف اے اکبر
  دل سے ملتے نہیں یہ ہاتھ ملانے والے
  (اکبر الٰہ آبادی)

- ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
  پر کیا کریں کہ ہو گئے مجبور جی سے ہم
  (حکیم مومن خاں)

- خدا جانے یہ اندازِ مزاجِ دوستاں کیا ہے
  کہ دل کچھ اور کہتا ہے زباں کچھ اور کہتی ہے
  (ضیا عباس ہاشمی)

- گئے موسم میں جو کھلتے تھے گلابوں کی طرح
  دل پہ اترے ہیں وہی خواب عذابوں کی طرح
  (پروین شاکر)

- شاید اب اس کے بعد قیامت نہ آئے گی
  لکھ رہا ہوں دل کا حال وطن چھوڑتے ہوئے
  (ماہر القادری)



- وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی
(اقبال)

- ہائے کس کا نام تم نے لے دیا
اضطرابِ دل کی حالت اور ہے
(پیارے لال شاکر)

- آیا ہوں ابھی ہو کے پشیمان جہاں سے
پھر دل کا تقاضا ہے کہ اک بار وہاں اور
(سُہا)

- یوں دمِ مرگ علاج دلِ ناشاد کیا
جب دوا سے نہ چلا کام تمہیں یاد کیا
(شمس لکھنوی)

- میں اپنے دل کا مالک ہوں مرا دل ایک بستی ہے
کبھی آباد کرتا ہوں، کبھی برباد کرتا ہوں
(ہری چند اختر)

- مرا وجود کہیں، دل کہیں، خیال کہیں
مری طرح نہ مجھ غربت سے آشنا کوئی!
(م۔ح۔ لطیفی)

- جلوہ تو اس کا دیکھ لیا چشمِ شوق نے
پروا نہیں ہے اس کی اگر دل گیا، گیا
(اکبر سروری)

- کیا عقدہ نہ اب تک حل یہ میری فکر کا مل نے
ستم میں نے کئے ہیں دل پہ یا مجھ پر کئے دل نے
(معنی لکھنوی)

- سجا کر میّتِ امید، ناکامی کے پھولوں سے
کسی بے درد نے رکھ دی مرے ٹوٹے ہوئے دل میں
(رسا جالندھری) ●●

- کیا مچائی اُس نے میرے دل کے کاشانے میں دھوم
شور ہے جس کے تئے کعبے میں بت خانے میں دھوم

- کسے خبر ہے جو دل پر گزر گئی تسلیم
میرا افسانہ مرے بعد کیا بیاں ہو گا؟
منشی امیر اللہ خاں تسلیم

- مطمئن ہو دل تو ویرانوں کے سناٹے بھی گیت
دل اُجڑ جائے تو شہر دل ربا بھی ویران بہت

دُعاء



علامہ اقبال مسجد قرطبہ (اسپین) میں نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے

- فقیرانہ آئے صدا کر چلے
  میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے
  (میر تقی میر)
- دُعا میں ذکر کیوں ہو مدّعا کا
  کہ یہ شیوہ نہیں اہلِ رضا کا
  (حسرت موہانی)
- لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری
  زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
  (علامہ اقبال)
- تری دُعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری
  مری دُعا کہ تری آرزو بدل جائے
  (اقبال)
- تری دُعا سے قضا تو نہیں بدل سکتی
  مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے
  (اقبال)
- ہے دُعا منصورہ کی ہر دم یہی میرے خدا
  دائمی ہوں یہ بہاریں، نکہتیں قائم رہیں
  (منصورہ)
- مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں اُن کو
  دُعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں
  (اکبر الٰہ آبادی)
- دُعا بلا تھی، شبِ غم، سکونِ جاں کے لئے
  سخن بہانہ ہوا، مرگِ ناگہاں کے لئے
  (حکیم مومن خاں مومن)
- کھل اُٹھے پھر سے دُعا کے غنچے
  پھول رُت کو وہ دامن تک پہنچی
  (امینہ بہار رُونا)
- فاصلے ختم ہو کے رہ جائیں
  ہونٹ تیرے ہوں اور دُعا میری
  (امینہ بہار رُونا)
- لرزیدہ تھا جو ماں کے لبوں پر دمِ آخر
  اب تک ہے مرے دل کو وہ اِک حرفِ دُعا یاد
  (یزدانی جالندھری)
- پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
  رونا مرا وضو ہو نالہ مری دُعا ہو!
  (اقبال)

- ہوتی نہیں قبول دُعا، ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں
(حالیؔ)

- دُعائے بد نہیں دیتا فقط اتنا ہی کہتا ہوں
کہ جس سے دل لگے تیرا وہ تجھ سا بے وفا نکلے
(محمد اکرم مدنوی)

- ہم جانتے ہیں آئے گا کیا عرش سے جواب
دستِ دُعا سے ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہیں ہم
(یزدانی جالندھری)

- سزا جب میں بھگت بیٹھا تو پھر جاگے زمیں والے
فلک پر میری بخشش کی دُعا تاخیر سے پہنچی
(امداد آکاش)

- التجا کوئی نہیں حرفِ دُعا کوئی نہیں
میں وہ سائل ہوں کہ ہونٹوں پہ صدا کوئی نہیں
(یزدانی جالندھری)

- چھین لے گا جب وہ مجھ سے زندگی کی راحتیں
مجھ کو خالدؔ عمر بڑھنے کی دُعا دی جائے گی!
(خالدؔ علیم)

- سُنتے ہیں کہ مل جاتی ہے ہر چیز دُعا سے
اک روز تمھیں مانگ کے دیکھیں گے خدا سے
(مقصود احمد ساحرؔ)

- دُنیا سے میرا ایک تعلق ہے آج بھی!
وہ دوستی دے رہی ہے دُعا کو رہا ہوں میں
(انور شعور)

- مجھ کو پانے کے لئے جب تُو نے مانگی تھی دُعا
عمر بھر آنکھوں میں وہ منظر لئے پھرتے رہے
(ناصرہ حمید رانا)

- ہیں اُن کے حق میں کیوں قہرِ الٰہی کی دُعا مانگوں
بشر ہیں بے خبر ہیں کیوں تباہی کی دُعا مانگوں

- موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لو دُعا کر چکے، اب ترکِ دُعا کرتے ہیں
(یاسؔ یگانہ چنگیزی)

- دُعا کو ہاتھ اُٹھانے سے خوف آتا ہے
کہ خوفِ برق بھی ابرِ کرم کے ساتھ رہا
(احمد ندیم قاسمی)

- کچھ رہے یا نہ رہے میری دُعا ہے کہ امیرؔ
نزع کے وقت سلامت مرا ایمان رہے
(امیرؔ مینائی)

- ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دُعا دینے لگے
(ثاقبؔ لکھنوی)

- مرے نصیب کی خوشیاں بھی تجھ کو مل جائیں
مری دُعا ہے کبھی غم نہ تیرے پاس آئے

- اندھیری رات، تھکی منزلیں، کڑی منزل
سلامتی کی دُعا مانگ کارواں کے لئے

- وہ دل ہی کیا ترے ملنے کی جو دُعا نہ کرے
میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے

- وہ ستمگر مائلِ مہر و وفا کیسے ہُوا
کارگر اُس پہ مرا حرفِ دُعا کیسے ہُوا
(بسمل صابری)

- جو میرا نام بھی لیتا تھا دُعاؤں کی طرح
سوچتا ہوں مجھے کس طور سے بھولا ہوگا
(فرحت احمد خاں)

- پھول پھر زخم بنے ہیں ناصر
پھر خزاؤں کو دُعا دے کوئی
(ناصر کاظمی)

- دُعا یہ ہے رہِ منزل سے آشنا نکلیں
یہ رہنما جو ابھی کارواں میں آئے ہیں !

- اب تو ہیں لگا ہیں ترے اندازِ کرم پر
سائل کو دُعا یاد نہ الفاظِ دُعا یاد
(زیڈ۔ اے بخاری)

- اس عہد میں جینے کی دُعا مانگ رہا ہوں
جس عہد میں مرنے کی دُعا کام نہ آئے
(صبا اکبر آبادی)

- چاند دیکھا ہے تو یاد آئی ہے صورت تیری
ہاتھ اُٹھے ہیں مگر حرفِ دُعا یاد نہیں !

- سوچتی ہوں تجھے میں کیا بھیجوں
پیار بھیجوں کہ یا دُعا بھیجوں

- دنیا سے جُدا اگانہ ہے یہ رنگِ دُعا بھی
مفہوم ادا ہوتا ہے بے صوت و صدا بھی
(حامد یزدانی)

- جذبوں میں صداقت کا بھرم ٹوٹ نہ جائے
میں تجھ سے بہت دور رہوں ملنے کی دُعا کر

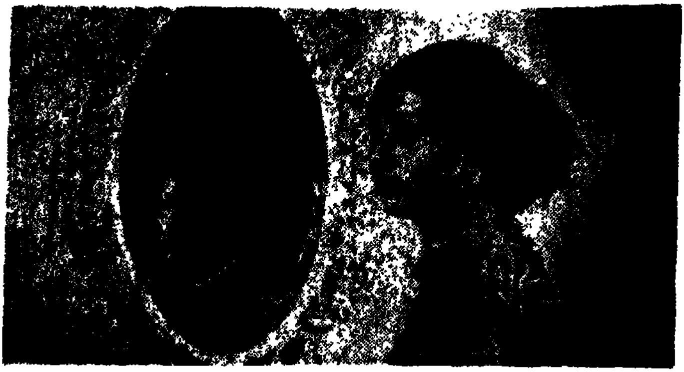


- کتنے مسرور تھے جینے کی دُعاؤں پہ شکیل
جب ملے رنج تو تاثیر پہ رونا آیا
(شکیل بدایونی)

- عطا ہوئی ہے مجھے اضطراب کی دُنیا
دُعائیں مانگی تھیں میں نے سکون پانے کے لئے
(سید رضوی)

- سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دُعا کے بعد
(محمد علی جوہر)

- یہ اضطراب دیکھ کر اب دشمنوں سے بھی
کہتا ہوں اُس سے ملنے کی کچھ تم دُعا کرو



● دستِ دُعا بلند ہے بابِ قبول کے لئے
اے مرے ربِّ کارساز مژدۂ فتح یاب دے

● یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دُعاؤں سے فضا معمور ہے

● پھوں پھر زخم بنے ہیں ناصر
پھر خزاؤں کو دُعا دے کوئی
(ناصر کاظمی)

● گوشۂ دل سے نکلتی ہے دُعا تیرے لیے
تُو رہے شاد سدا میری تمنّا یہ ہے!

● دُعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھِلے
کہیں جگہ نہ ملی میرے آشیانے کو
(قمر جلالوی)

● پچھلے برس تھا خوف تجھے کھو نہ دوں کہیں
اب کے برس دُعا ہے ترا سامنا نہ ہو

● دُعا بھی صرف عزائم کا ساتھ دیتی ہے
دوائے درد بھی ڈھونڈو فقط دُعا نہ کرو

● ہے دُعا یاد مگر حرفِ دُعا یاد نہیں
میرے نغمات کو اندازِ نوا یاد نہیں

● تیرے دامن کی ہوا مانگتے ہیں
ہم بھی جینے کی دُعا مانگتے ہیں
(ساغر صدیقی)

● یارب غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پہ ہے وہ دستِ دُعا ہوتا

● کون دیتا ہے محبت کو پرستش کا مقام
تم ذرا غور سے دیکھو تو دُعا دو مجھ کو!

● میری طلب تھا ایک شخص وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دُعا سے یوں گرا بھول گیا سوال بھی!
(پروین شاکر)



ہندوستان میں زبان کا مسئلہ دوسرے ملکوں سے کسی قدر مختلف ہے۔ دوسرے ملکوں میں قوموں کی عموماً ایک ہی زبان ہوتی ہے اس لیے لسانی مسئلہ پیچیدہ نہیں ہوا کرتا یا کم از کم اس قدر پیچیدہ نہیں ہوتا۔ اس لیے وہاں انصاف اور ناانصافی کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہندوستان میں مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کے ساتھ متعدد اور مختلف زبانیں بھی بولی جاتی ہیں کسی تاریخی اور سماجی تبدیلی کے سبب سے اردو، ہندی انیسویں صدی میں ہندوستان کی سربرآوردہ زبانیں ہوگئیں جن میں اردو کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی انگریزوں نے اردو کو عوامی بولی اور زبان دیکھ کر اسے عدالت کی زبان بھی قرار دے دیا پھر کچھ تنگ نظر لوگوں نے اسے صرف مسلمانوں کی زبان اپنے ذہن میں قرار دے لیا بس یہی ذہن میں چھپا ہوا خیال اردو کے حق میں ستم قاتل بن گیا جب ملک تقسیم ہوا تو اسی خیال کے لوگوں نے یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور چونکہ پاکستان مسلمانوں کا ہے اس لیے مسلمانوں کو بھی پاکستان چلا جانا چاہئے اور اردو زبان کو بھی ہندوستان میں رہنے کا حق نہیں یہ وہ لوگ تھے جو زبان کو مذہب اور سیاست کی عینک سے دیکھتے تھے ان میں سے کچھ اردو زبان کی لسانی تاریخ جانتے ہوئے بھی تعصب کی بنیاد پر ایسا کہہ رہے تھے اور کچھ لوگ محض نادانستہ طور پر اس نقطہ نظر کو اپنائے ہوئے تھے، ایسی صورت میں کسی زبان کے ساتھ انصاف ممکن نہیں

ہوتا۔ پھر اردو کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کے آئین نے جب ملک کی زبان ہندی کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ طے کیا تو لوگ یہ سمجھنے لگے کہ حکومت کی زبان کے بعد مادری زبانوں کا کوئی حق نہیں رہ جاتا۔ اس لیے اب صرف ہندی ہی کو حق حاصل ہے کہ وہ ملک میں بڑھے پھیلے ابتدا میں حکومت نے اس مسئلے کی طرف زیادہ توجہ بھی نہیں دی اس لیے یہ خیال اور زیادہ مضبوط ہوتا گیا اسکولوں اور کالجوں میں جہاں اردو پہلے سے موجود تھی وہاں کہیں تو باقی رہی اور کہیں سے ختم کر دی گئی۔ آزادی کے بعد ملک میں تعلیم کا جو چرچا ہوا نئے اسکول اور کالج کھلے تو ان میں اردو کو نصاب میں شامل نہیں کیا گیا۔ جہاں شامل کیا گیا وہاں یہ شرط رکھی گئی کہ جب تک چالیس طالب علم نہ ہوں اردو کلاس نہیں کھل سکتے اور جہاں چالیس طالب علم ہوتے وہاں اساتذہ کا تقرر نہ ہوتا غرض کہ ہر طرح سے اردو سے بغض و عناد برتنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ حکومت اردو کے ساتھ کچھ کرنا بھی چاہتی تو حکومت کے کارندے اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے دیتے اور یہ سلسلہ آجتک کسی نہ کسی شکل میں چلا آتا ہے۔ پہلے تو اسکولوں میں اردو کا نصاب ہی نہیں ہوتا پھر اگر ایسا ہوا بھی تو کبھی استاد نہیں کبھی استاد ٹیڑھے میڑھے مقرر ہو گئے تو کورس کی کتابیں بازار سے غائب طالب علم امتحان کی پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے اسے یہ شعور بہت بعد میں آتا ہے کہ وہ کسی نصاب کو کیوں پڑھتا ہے اس لیے وہ گھبرا کر اردو ہی چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح اردو کی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد منتشر ہو جاتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ حضرات بھی جو اردو کی درس و تدریس میں یونیورسٹیوں اور دوسرے علمی اداروں میں مشغول ہیں خود ان کے بچے بھی اردو سے تقریباً ناواقف ہیں۔ اس طرح اردو کے ساتھ ناانصافی کے مختلف رخ ہیں۔ جب تک ان کمیوں اور خامیوں کو دور نہیں کیا جاتا اردو کے ساتھ انصاف مشتبہ رہے گا

اردو دوستوں اور اردو پسند حلقوں کو اس بات کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ ان کے بچے اردو کی تعلیم حاصل کریں اور ہر اردو دوست اس بات کا تہیہ کرے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو ضرور پڑھائے گا چاہے پرائیویٹ طریقے پر یا اسکول میں اگر انتظام ہے تو اسکول میں لیکن اگر کہیں اسکول میں انتظام نہیں ہے تو اپنے طور پر تو یہ کام کیا ہی جا سکتا ہے۔

وہ لوگ جو یونیورسٹیوں اور دوسرے اداروں سے وابستہ ہیں وہ مختلف کمیٹیوں کے سربراہ ہوتے ہیں وہ اردو کے اساتذہ کے انتخاب کے وقت سفارشوں اور دوستیوں سے زیادہ اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کے منتخب کئے ہوئے اساتذہ میں اردو کی لیاقت کیا ہے؟ اگر پیر خود ہی ضعیف ہیں تو وہ مریدوں کی کیا مدد کریں گے اچھے استاد اچھے طلبا برآمد کریں گے۔

(ڈاکٹر محمد عقیل رضوی الٰہ آباد یونیورسٹی)

آج کل اردو اخباروں میں یہ خبریں جوش خروش سے شائع ہو رہی ہیں کہ اردو کا مستقبل روشن ہے۔ شاید اس لیے کہ اردو کی ترقی کے لیے کثیر رقم دی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں ہماری سرکار اردو کے ادیبوں کو انعامات بھی تقسیم کر رہی ہے یہ تمام باتیں بظاہر بڑی دل خوش کن معلوم ہوتی ہیں لیکن واقعہ دراصل اس سے بالکل برعکس ہے اہل علم خوبی جانتے ہیں کہ تاوقتیکہ اردو زبان کی درس و تدریس کا انتظام ثانوی زبان کی حیثیت سے لازمی قرار نہیں دیا جاتا ہے اس وقت تک یہ تمام کوششیں بے معنی ہیں۔

حکومت کو چاہیے کہ تمام پرائمری اسکولوں میں اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت دلائے محض اختیاری مضمون ہونے سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ عدالتوں میں درخواستیں تمام اسٹیشنوں کے نام اور پوسٹر ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ہونے چاہیں۔

حکومت کے فرائض کے ساتھ ہی ساتھ کچھ اردو

والدوں کے فرائض بھی ہیں ان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے بچوں کو گھر میں اردو سکھائیں۔ انگریزی اسکولوں میں داخل ضرور کرائیں جواب ان TATRSE SYMBOL ہو گیا ہے لیکن گھر پر اردو کی تعلیم و تدریس کا بھی معقول انتظام ہونا ضروری ہے۔

اردو دوستوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے علاقے میں چھوٹے چھوٹے مکتب کھولیں جن میں اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام ہو اور شبینہ مدارس قائم کریں تاکہ تعلیم بالغان کا درس و تدریس ممکن ہو سکے۔ آل انڈیا ریڈیو سے اردو زبان کی تعلیم کا پروگرام نشر کرنے ——— کا پُرزور مطالبہ کریں۔ اردو زبان کے ایسے شیدائی جن کے سپرد اسکولوں اور کالجوں کے انتظامات بھی ہیں وہ اپنے اسکولوں کے انتظامات پر خاص طور پر توجہ کریں اردو میں اچھے نمبروں سے پاس ہونے والے بچوں کو وظیفے دیں کارسپانڈنس کورس کو عام بنائیں یہ تمام امور اردو کے پرستاروں کی خاص توجہ کے محتاج ہیں۔

انعامات اور ترجموں کے لیے دی گئی رقمیں اردو کی ترقی کے لیے مفید تو ضرور ہو سکتی ہیں لیکن صرف انعامات حاصل کر کے خوش ہو لینا کافی نہیں۔ جہاں تک ترجموں کا سوال ہے اس سے اب تک خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے اور نہ ہی آئندہ کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ہے تاوقتیکہ نئی نسل کے لیے بحسن و خوبی اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ہو جاتا۔ حکومت نے جن ذمہ دار حضرات کے سپرد ترجمہ نگاری کا کام کیا ہے ان کا بھی فرض ہے کہ وہ علاوہ اساتذہ کے ایسے لوگوں کو بھی تلاش کریں جو ترجمہ نگاری کے فن سے واقف ہیں مگر وہ استاد نہ ہونے کی وجہ سے گمنامی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنا پورا وقت ترجمے پر صرف کر سکتے ہیں جس کی توقع ہمیں اساتذہ سے ان کی دوسری ذمہ داریوں کے پیش نظر کم ہی ہے۔

بعض حلقوں سے اردو یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ بھی زور و شور سے کیا جا رہا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یونیورسٹی کا قیام اردو کی ترقی اور بقا میں کہاں تک معاون ہو سکتا ہے۔ اس یونیورسٹی سے تعلیم پا کر کتنے لوگ کھپ سکتے ہیں اور جو اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کریں گے کہاں سے آئیں گے۔ اس وقت اہم مسئلہ یونیورسٹی کا نہیں بلکہ اردو کی بنیادی تعلیم کا ہے اور جب تک ابتدائی اردو زبان کی بنیاد پختہ نہیں ہوگی اس وقت تک ہمیں اردو یونیورسٹی کا خواب دیکھنا ایک بے معنی سی بات ہے۔

(قیصر جہاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

بلاشبہ اردو کے ساتھ بڑی ناانصافی ہو رہی ہے۔ اردو کو ہمارے آئین کے آٹھویں شیڈول میں ہندوستان کی ایک قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے لیکن عملاً آئین کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے اس لیے یہ صرف ناانصافی ہی نہیں بلکہ سراسر دستور ہند کی مخالفت کے مترادف ہے۔ ہم

ہم کمیونسٹ پارٹی والے یہ بات پارلیمنٹ، اسمبلیوں اور ان کے باہر کہتے آئے ہیں۔ وزیر اعظم نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اردو کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔

مرکزی حکومت کو چاہیے کہ وہ ہندوستان کے دستور کا احترام کرے اور سختی کے ساتھ صوبائی سرکاروں کو لکھے کہ اردو زبان کی مکمل حفاظت کی جائے۔ اردو بولنے والوں کے بچوں اور بچیوں کے لیے ہر جگہ (جہاں اردو بولنے والوں کی مناسب تعداد میں آبادی ہو) اسکول کھولے جائیں نصاب کی کتابیں شائع کی جائیں۔ عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں اردو کی درخواستوں اور خطوط کو پڑھنے اور جواب دینے کا مناسب انتظام کیا جائے۔ مرکزی سرکار کو اس کے لیے ایک باقاعدہ مشینری مقرر کرنی چاہیے اور صوبائی سرکاروں کو بھی ایسی ہی مشینری قائم کرنے کے لیے کہنا چاہیے۔ اس مشینری کا مقصد یہ ہو کہ وہ حکومت ہند کے احکامات اور فیصلوں پر عمل درآمد کرائے۔

اردو پسند حلقوں کو چاہیے کہ وہ اس قسم کی مشینری

قائم کرانے کے لیے جدوجہد کریں اور سرکار کو مجبور کریں کہ ایسا قدم اٹھایا جائے۔

اردو ادیبوں اور شاعروں کو انعامات ضرور ملنے چاہئیں اور اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمہ بھی کرانا چاہیے۔ حکومت کو یہ قدم اٹھانے ہی چاہئیں لیکن اتنا کافی نہیں ہے اردو بولنے والوں کی تعداد تین اور چار کروڑ کے درمیان ہے۔ اس لحاظ سے یہ ہندوستان کی بڑی زبانوں میں سے ہے اس لیے اہم بات یہ ہے کہ ان کروڑوں ہندوستانیوں کو بھی دوسری زبان والوں کی طرح ترقی کا برابر موقعہ ملنا چاہیے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو ایک سیاسی تعصب کا شکار بن گئی۔ فرقہ پرست لوگ کانگریس کے اندر بھی تھے اور کانگریس کے باہر جن سنگھ اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر۔ ایس۔ ایس) کی شکل میں منظم طور پر فرقہ پرستی کی آگ بھڑکاتے رہے مسلم اقلیت کے خلاف اور اردو زبان کے خلاف زہر اگلتے رہے۔

لیکن اس عرصہ میں کانگریس کی حکومت رہی ہے اس کے اکثر رہنما جمہوری اور سیکولر رجحان رکھتے ہیں لیکن جس مستقل مزاجی کے ساتھ انہیں اور ان کی حکومت کو فرقہ پرستی اور ایڈمنسٹریشن میں بیٹھے ہوئے فرقہ پرست افسروں کے خلاف حرکت میں آنا چاہیے تھا اس کا ثبوت انہوں نے نہیں دیا۔ ان کی کمزوری سے فرقہ پرست جن سنگھ فرقہ پرست افسروں اور کانگریس کے بعض فرقہ پرست وزیروں نے فائدہ اٹھایا اور اس ماحول میں اردو کے ساتھ ناانصافی ہوتی رہی۔

اگر اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے تو اس سے اردو کا فائدہ ہوگا اس سے اردو کی اہمیت بحال کرنے میں مدد ملے گی لیکن یہ تو ایک قدم ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت کو چاہیے کہ ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم کرنے کی ہدایت دے اور اس کے لیے مناسب فنڈ مہیا کرے

تمام ہندوستان میں اور خاص طور پر ان صوبوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی خاصی آبادی ہے۔ اردو کی تعلیم کے لیے اسکول کھولے جائیں۔ عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں اور خاص کر ان صوبوں میں جہاں اردو بولنے والے رہتے ہیں) اردو کی درخواستیں اور چٹھیاں وصول کرنے اور ان کا جواب اردو میں دینے کے لیے انتظام کیا جائے۔

ان پر عمل کرانے کے لیے مشینری ہونی چاہیے (اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے)

میں اور میری پارٹی اس معاملہ میں متفق ہیں کہ اردو کو اس کا جائز حق ملنا چاہیے۔ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں ہمارے ممبر اس سوال پر بارہا آواز اٹھاتے رہے ہیں پارلیمنٹ میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ پر بولتے ہوئے ہماری پارٹی کے لوک سبھا میں لیڈر کامریڈ اندرجیت گپتا نے زوردار الفاظ میں اردو کے لیے آواز بلند کی۔ یہ بات اخباروں میں شائع ہو چکی ہے۔۔۔

(مقیم الدین فاروقی ممبر سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کمیونسٹ پارٹی)

اردو کے ساتھ بے انصافی ہو رہی ہے اور اس بے انصافی کرنے والے بھی کبھی انکار نہیں کرتے۔

حکومت کو کیا کرنا چاہیے؟ حکومت کو دستور ہند کی متعلقہ دفعات کو عمل میں لانا چاہیے اور اردو کو مرکزی اور ریاستی حکومت میں سرکاری زبان تسلیم کر کے ضروری کارروائیاں کرنی چاہئیں (ب) اردو پسند حلقوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اردو پسندی کا عملی ثبوت دینا چاہیے اپنی صحافتی اور ذاتی سیاسی اغراض کے لیے اردو دوستی کا ڈھونگ رچانا ترک کر دینا چاہیے۔ اردو کے ابتدائی، فوقانی اور ثانوی مدارس کا قیام کرنا چاہیے اور ان مدارس کو سرکاری منظوری دلانے کی جدوجہد کرنی چاہیے الغرض پہلے خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنی چاہیے محض شکوہ سنجی سے بات نہیں بنتی۔ پچھلا برس کا تجربہ سامنے ہے

۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو سب سے زیادہ نقصان اردو



کے بہی خواہوں نے پہنچایا وہ ایک بیرونی استعماری حکومت سے کام نکالنے کے طریقے جمہوری دورِ حکومت میں آزماتے رہے حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اردو کی تعلیم کا ایک منظم اور مربوط سلسلہ شروع کرنے کے بعد مدارس کی سرکاری منظوری کی تحریک شد و مد سے چلائی جاتی لیکن نہ ایسا کیا اور نام نہاد اردو دوستوں کا گرمئ انجمن میں مہمک رہے نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کے یہ فرہاد اور مجنوں تو کرسی وزارت اور مجالس مقننہ میں پہنچکر اپنی نجی دلچسپیوں میں مشغول ہو گئے اور غریب اردو گلیوں اور بازاروں میں ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ ••(پروفیسر اختر قادری مظفر پور)

تقسیم وطن کے بعد اردو زبان کے ساتھ جو بے انصافی ہوئی ہے میں نے اسے شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے میں اسے بے انصافی نہیں بے رحمی کہوں گا دنیا بھر کی زبانوں کی تاریخ میں اس طرح کا لسانی المیہ کہیں نظر نہیں آتا ہماری جمہوری اور سیکولر حکومت نے اس ارتقا پذیر شستہ شائستہ اور جیتی جاگتی زبان کو دھیرے دھیرے زہر خوانی کے ذریعے ختم کر دینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

حکومت حکمت ہے اور رموزِ سلطنت شاہاں بدانند مگر حکومت کو کچھ کرنا ہو تو اس کے پاس ہر طرح کے وسائل ہیں لیکن خوئے بد را بہانہ بسیار۔ اگر حکومت اردو کو کچھ پردیشوں میں دوسری سرکاری زبان بنا دے تو عوام کے دلوں میں اس کی افادیت کا جذبہ از سرِ نو پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

اردو پسند حلقوں کو چاہیے کہ جب تک حکومت مناسب علاقوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہ دے اور پرائمری تعلیم کا انتظام نہ کرے اس وقت تک مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے انعام و اکرام وظیفے اور زرِ امداد کے لیے آنکھوں میں دھول جھونکنے والے حربوں کا مکمل مقاطعہ کریں میرے نزدیک یہ ہنگامی اور عارضی انعام و اکرام قبول کرنے والے ادیب اور شاعر اردو زبان کو نقصان پہنچاتے ہیں اور حکومت کو اس کے فرض کی تکمیل کا احساس دلانے

انہیں بے معنی باتوں تک محدود ہو جانے کی ترغیب دیتے ہیں ••
(گنگا دھر تسنیم پنجاب یونیورسٹی)

کسی بھی زبان یا انسان کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے حکومت اور اردو پسند حلقے کو کوئی رائے دینا حماقت ہے حکومت کی پالیسی صرف اردو ہی نہیں ہر صوبہ کی زبان کے حق میں ستم قاتل بنی رہے گی جب تک کہ کوئی معجزہ ظہور میں آجائے جب تک ہندوستانی زبانیں انگریزی زبان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور رہیں گی ان کا حق نہیں مل سکے گا۔ زبان کا مسئلہ بھی چھوڑیا کی گٹھڑی میں سے نکلا ہوا کچے سوت کا گولہ ہے جتنا سلجھایا جاتا ہے الجھتا ہی جاتا ہے بالکل زندگی کے دوسرے مسائل کی طرح۔ ادبی اونچی عمارتیں بنتی جا رہی ہیں مگر جھونپڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے بس اردو کا حق دلانے کے لیے جو اودھم پچیس سال سے مچایا جا رہا ہے وہ مچتا رہے گا۔ اردو کا رسم الخط بڑی خوش سلیقگی

سے نابود کیا جا رہا ہے اور ایک دن بالکل معدوم ہو جائے گا کوئی طاقت اسے نہیں روک سکے گی۔ نعرے بازی کے سوا کوئی نہ کچھ کرتا ہے اور نہ کرے گا۔

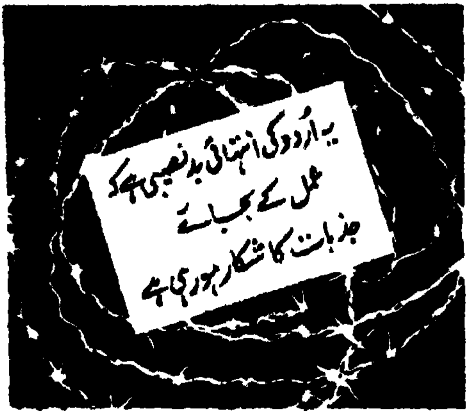
اردو کی ترقی کے لیے جو شاعروں اور ادیبوں کو انعام دیئے جاتے ہیں ان کی حقیقت ہی کیا ہے سال میں مشکل سے ایک نیا طبقہ فی اردو دان خرچ آتا ہوگا اسے مضر سمجھنا بھی مضحکہ خیز ہے بچہ کو بہلانے کے لیے منہ میں انگوٹھا دینے سے قیامت نہیں آجاتی۔ دو چار آنسو بجھ جاتے ہیں کیا برا ہے کسی کو کچھ پیسہ مل جاتا ہے۔ مگر اسے اردو کی ترقی کے لیے نیک قدم کا نام دینا تھوڑی زیادتی ہوگی اپنی سرکار نعروں پر چلتی ہے نعروں کے ساتھ تھوڑے ڈھول تاشے بھی چلتے ہیں حکومت کی اس مہربانی کی مخالفت کیوں کی جائے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی مگر جتنا روپیہ ایک ادیب یا شاعر کو انعام ملتا ہے وہ اونٹ کی داڑھ میں زیرہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ساری عمر کی ریاضت کا انعام پانچ ہزار ملتا ہے اس کے ساتھ پبلک کی گالیاں جو ملتی ہیں ان کا حساب کسی رجسٹر میں درج نہیں ہوتا کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے یہ انعام صرف اس غرض سے دیا جاتا ہے کہ جنہیں ملے باقی کے محروم رہ جانے والے ان سے جلیں اور گالیاں دیں تاکہ ادیبوں میں بدمزگی کا امکان پیدا ہو اور یہی ہو رہا ہے ادبی ادارے دن بدن کمزور اور ناکارہ ہوتے جا رہے ہیں۔ سب بڑے بڑے انعام یافتہ ہو کر کچھ الگ الگ اوپر چلے گئے ہیں انجمنوں کی رونق کچھ محدود سی ہو گئی ہے ادبی جہاد کا فیشن ختم ہو چکا ہے کوئی مرتا ہے تو چند لوگ جمع ہو کر اکھڑی اکھڑی باتیں کہہ لیتے ہیں اکثر عدیم الفرصتی کی آڑ لے کر یا تو شرکت ہی نہیں کرتے یا جلدی سے بھاگ لیتے ہیں جیسے معلوم ہو کہ مرنے والا دامن تو پکڑنے آنے سے رہا۔

اردو کو سب سے زیادہ نقصان اردو دان طبقے نے پہنچایا ہے جنہوں نے اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں بھیجا ادھر لمبے چوڑے نعرے لگاتے رہے ادھر اردو رسم الخط کو جھٹلا دیا حکومت برطانیہ نے کبھی اردو کی ترقی کے لیے کچھ نہ کیا نہ اسکولوں میں لازمی قرار دیا نہ ادیبوں شاعروں کی ہمت افزائی کے لیے انعام و اکرام دیئے پھر بھی اردو نے جتنی ترقی کی وہ اردو داں طبقہ کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھی۔ آزادی ملتے ہی سب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہے گورنمنٹ کو گالیاں دیتے رہے اپنے بچوں کو انگریزی اور ہندی پڑھاتے رہے۔ یہودیوں نے عبرانی زبان کو کس طرح زندہ رکھا اور آج وہ ایک طاقتور ملک کی سرکاری زبان ہے دراصل اردو کے حمائتیوں کو اردو پر یقین نہ تھا اس پر یقین نہ تھا۔ اس پر فخر نہ تھا آج بھی فخر نہیں انگریزی بولتا بچہ آج بھی مرعوب کرتا ہے اس کے والدین کی چھاتی غرور سے چوڑی ہو جاتی ہے۔ انگریزی اگر فرانسیسی یا جرمن زبان کی طرح ایک زبان رہتی تو ہندوستانی زبانوں کی یوں مٹی پلید نہ ہوتی انگریزی روٹی کمانے کا واحد وسیلہ ہے ترقی کا زینہ ہے۔ آج انگریزی کے بغیر کوئی کام نہیں چل سکتا ڈھکوسلے کے لیے سائن بورڈ لگا دینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا، جڑوں میں انگریزی گھسی ہوئی ہے

ہو گھسی رہے گی۔

اردو یونیورسٹی کے فوری یا غیر فوری قیام سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہاں انگریزی لازمی ہوگی ہندی بھی لازمی ہوگی اردو کے مسئلہ سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ عمارت کا ٹھیکا جسے ملے گا وہ کچھ بٹورے جائے گا کچھ پرانے اردو کے ماہرین جو آج بھی اردو کی ٹانگیں تھامے ہوئے ہیں وہاں بھی ڈٹ جائیں گے۔ کچھ لائبریری کے نام سے گول مال ہوگا خوب نوچ کھسوٹ ہوگی۔ اپنے بچوں کو وہاں پڑھنے جب ہی بھیجے گا جب اسے یقین دلایا جائے گا کہ صرف اردو کی وجہ سے اس کے بچے کو نوکری ملے گی۔ ورنہ کس کام آئے گی اردو؟ کس محکمہ میں اسے اردو سے واسطہ پڑے گا۔ کیا یہ لازمی ہے کہ اسے اس صوبہ میں نوکری ملے گی جہاں اردو کا راج ہوگا بس اس یونیورسٹی کے قیام سے اسی قسم کے چند لوگوں کو فائدہ ہو جائے گا جنہیں مرزا غالب کے ہنگامے سے ہوا۔ یہ بھی کچھ برا نہیں اس مہنگائی کے زمانے میں چند افراد کا بھلا بھی غنیمت ہے اس لیے اس اسکیم کی مخالفت مناسب نہیں اگر حکومت اپنی بیشتر اسکیموں میں چند لاکھ روپیہ اگل دے تو کیا برا ہے۔ اردو کا نہ سہی اردو کے نام سے کسی کا تو کام بن ہی جائے گا۔

بذاتِ خود ہم سب صرف بکواس کر سکتے ہیں انشاءاللہ اسی تندہی اور سنجیدگی سے یہی کرتے رہے ہیں گے۔ اردو کا جائز یا ناجائز مقام کیا ہے اس کا بھی ابھی ٹھیک سے فیصلہ نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی امید نظر آتی ہے یہ اردو کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ عمل سے زیادہ جذبات پر زور ہے بس چند نعرے ہیں وہ پچیس برس سے لگائے جا رہے ہیں آج جو مشکلیں شری بھٹو کو درپیش ہیں وہی اردو کے سامنے ہیں سمجھوتہ کرنے ناک کٹتی ہے اور سمجھوتہ بنا چارہ نہیں سوال یہ ہے کہ ناک بچائی جائے یا گردن آثار تو کہتے ہیں دونوں کی خیر نہیں۔



گردن بچانے کا ایک بہت تکلیف دہ طریقہ ہے کہ اسکرپٹ مٹ رہی ہے تو کم از کم الفاظ اور تراکیب ہی بچالی جائیں اردو ادب کا جو کچھ سرمایہ ہے اسے کسی بھی صورت میں کسی بھی لب و لہجہ زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ آنے والی پود تک پہنچ سکے ہندی کے ساتھ دیوناگری رسم الخط میں اردو بھی کورس میں ہو۔ آج جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے صرف ہندی لپی جانتے ہیں وہ اگر چاہیں تو دیوناگری رسم الخط میں اردو پڑھ سکیں وہ حروف جو اردو زبان کی جان ہیں مگر دیوناگری میں نہیں مثلاً ق غ ض وغیرہ ان آوازوں کی ادائیگی کے لیے صرف نقطہ لگا کر کام چلایا جاتا ہے عموماً نقطہ غائب ہو جاتا اور آوازیں مسخ ہو جاتی ہیں ان آوازوں کو زندہ رکھنے کے لیے دیوناگری رسم الخط میں نئے حروف ایجاد کر کے شامل کیے جائیں حلق سے نکلنے والی آوازیں جو فارسی اور عربی سے آئی ہیں ایک زبان کا سرمایہ ہیں انہیں ضد اور ہٹ دھرمی سے مٹا دینا انتہائی ظلم اور حماقت ہے۔ انہیں زندہ رکھنا اردو داں طبقہ کا فرض ہے خواہ کسی صورت میں زندہ رہیں۔

یہ اردو کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ عمل کے بجائے جذبات کا شکار ہو رہی ہے۔ اردو والوں پر جھنجلاہٹ

اور بے بسی طاری ہے اردو رسم الخط کی بقا کے لیے جو لوگ کوشش کر رہے ہیں ان کی اہمیت برآ فروں ہے مگر اردو کے ساتھ اتنی زیادتی ہو چکی ہے کہ ایک نیا مورچہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ کورس میں جو درجہ ہندی کو حاصل ہے وہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی اردو کو ملنا چاہیے جو بچے اردو لینا چاہیں وہ اردو لیں جو ہندی لینا چاہیں۔ وہ ہندی رسم الخط کا سوال ہی نہیں وہ دیوناگری ہی ہوگا وہ تو ہر بچہ لازمی طور پر سیکھ ہی رہا ہے فرق صرف اتنا ہوگا کہ طالب علم ہندی کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی پڑھنے کا موقع حاصل کرے گا شرط یہ ہے کہ اردو کا ہندی ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ صرف رسم الخط بدلا جائے۔

اس قسم کے سمجھوتے سے اردو کی ہتک ہو سکتی ہے مگر موت نہیں ہوگی۔ ••

یہ کہنا کہ اردو کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ اصل صورت حال کا نہایت سطحی مطالعہ ہے۔ اس دنیا میں ناانصافی یا انصاف کا فیصلہ کسی مفروضہ حق کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ کسی چیز کے حق میں کتنا زور فراہم کیا گیا ہے۔ اردو کی اصل کمزوری موجودہ جغرافی قومیتوں کے زمانہ میں یہ ہے کہ وہ ملک یا ملک کی کسی ریاست کی عمومی زبان نہیں۔ وہ گروہ جس کو ہم اردو بولنے والا گروہ کہتے ہیں، وہ مختلف علاقوں میں بٹی ہوئی ایک منتشر قوم ہے۔ اگر وہ تمل، تلگو، بنگالی، ملیالم وغیرہ کی طرح کسی پورے علاقہ کی زبان ہوتی تو اردو کو وہ مسئلہ پیش نہ آتا جس سے وہ آج دوچار ہے۔

اردو کے جائز حق کے لئے حکومت سے کوئی توقع کرنا صرف اس وقت کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ بجائے کرنے کے لئے ہمیں حاصل ہے۔ یہ کام مکمل طور پر صرف اردو داں طبقہ کو کرنا ہے۔ اور وہ کام یہ ہے کہ دوسرے اور تیسرے درجہ کے تمام اخبارات و رسائل کو بند کرکے صرف اول درجہ کے اخبارات و رسائل نکالے جائیں۔ تصنیفات کا معیار بلند کیا جائے۔ متوازی ابتدائی تعلیم کا انتظام قائم کرکے نئی نسل کو اردو خواں بنایا جائے۔ ہر آدمی اپنے اوپر یہ لازم کرے کہ وہ اخبار اور رسالے اور کتابیں خرید کر پڑھے گا نہ کہ عاریتاً لے کر۔ اس قسم کی کارروائیاں کرکے تو ہم اردو کو بچا سکتے ہیں باقی حکومت سے مطالبات کسی بھی درجہ میں اردو زبان کو زندگی نہیں دے سکتے۔ حکومت سے مانگ کر کسی کو کچھ نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو صرف ان کو جو اپنی مانگ کے پیچھے سماجی قوت رکھتے ہوں۔

اردو کی ترقی کے لئے حکومت کی نوازشوں کے سلسلے میں میرا احساس یہ ہے کہ جن کو ان نوازشوں میں حصہ ملتا ہے وہ اس کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں اور جو اتفاقاً اس سے محروم رہ جاتے ہیں وہ اپنی محرومی کا انتقام اس طرح لیتے ہیں کہ انعام لینے والے دونوں کے خلاف لفظی طوفان شروع کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کو اس دردسری کی کیا ضرورت حکومت جو کرتی ہے کرنے دیجئے اور آپ کو جو کرنا ہے اس میں لگ جائیے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو نقصان پہنچانے کی ذمہ داری ان کے سوا کسی پر نہیں ہے جو اپنے کو اردو کا بہی خواہ کہتے ہیں حالانکہ ان کا یہ حال ہے کہ یا تو انہیں اصل مسئلہ کی خبر نہیں یا وہ اس کے لئے کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ اردو کا مسئلہ حقیقتاً سماجی اور لسانی قوت سے محروم ہونا ہے، کوئی اس کمی کو پورا کرنے میں نہیں لگتا۔ البتہ لفظی بازیگری دکھا کر مفت کا کریڈٹ لینا چاہتا ہے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان میں اردو کو ہر شعبہ میں انگریزی کے بعد دوسرا مقام حاصل تھا۔ اس صورت حال میں تبدیلی کی اولین ذمہ داری بٹوارہ کی سیاست پر ہے۔ بٹوارہ کی سیاست نے ملک کے ایک حقیر حصہ کو اردو کا مفروضہ ہوم لینڈ بنانے کی قیمت میں بقیہ پورے ملک کو ان لوگوں کے غلبہ میں دے دیا جو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں سے محبت کرنے والے تھے۔ یہ واقعہ اپنے اندر اتنا زیادہ وزن رکھتا تھا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ایک اردو

۔ کا مرکز بنے یہ تعلیم ہو نا بھی اس مسائل کو حل کر سکتا جو تقسیم کے فطری نتیجہ کے طور پر بحال ہونیوالا تھا۔

اس کے بعد اردو کو نقصان پہنچانے والی دوسری چیز وہاں کی قیادت ہے جو نعروں اور بیانات کو مسئلہ کا حل سمجھتی ہے۔ اردو کو ہندوستان میں مقام دیجئے کی جگہ یہاں پہنچی کہ اردو زبان میں معیاری اخبارات جاری کئے جاتے۔ اعلیٰ درجہ کی کتابیں تصنیف کی جاتیں، تعلیمی نصاب کے لئے معیاری کتابیں شائع کی جاتیں، اردو کو ترقی یافتہ بنا کر یہ ثابت کیا جاتا کہ ملک کو اردو زبان کی ضرورت ہے۔ انگریزی زبان دستور ہند کے سان شیڈول میں کسی نمبر پر نہیں مگر وہ ملک میں اول درجہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے برعکس اس شیڈول میں اردو بہ نمبر پندرہ درج ہے مگر اس کو وہ مقام حاصل نہیں۔ اس کی وجہ کوئی تعصب یا مرضی نہیں، بلکہ خود دونوں زبانوں کا وہ نسبتی علمی مقام ہے جو انھوں نے اپنے ماضی کے عمل کے نتیجہ میں حاصل کیا ہے۔

اردو کو اس کا جائز حق دلانے کی واحد صورت یہ ہے کہ ہر اردو والا اپنے آپ کو جائز طور پر اردو کے حوالے کر دیں ہم میں سے ہر شخص اردو کے لئے وہ کام کرنے پر آمادہ ہو جائے جو وہ کر سکتا ہے جس دن ہر آدمی یہ فیصلہ کرے اسی دن اردو کو اس کا جائز مقام ملنا شروع ہو جائے گا۔

(مولانا وحید الدین خاں دہلی)

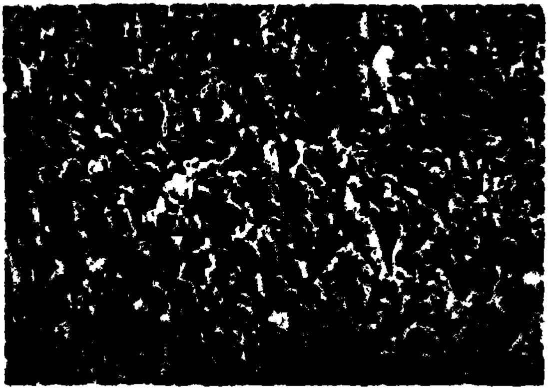
مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان اردو یا جو لوگ اردو کے حامی اور دوست ہیں ان کی اس معاملے میں دو رائیں نہیں ہوں گی کہ آزادی کے بعد اردو کو سرکاری طور پر وہ حیثیت نہیں ملی جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہے۔ البتہ تفصیلات میں بہت سے اردو کے حامیوں اور دوستوں کی رایوں سے میری رائے کچھ مختلف ہے۔ مثلاً مجھے اب یقین ہو چلا ہے کہ جن ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کئے جانے کا ہم اردو والے مطالبہ کر رہے ہیں غالباً اب اس کے منظور کئے جانے کا امکان نہیں رہا اور جہاں تک میں سمجھ سکا

ہوں کہ حکومت اس معاملے میں بڑی حد تک مجبور و معذور ہے تقسیم کے بعد ملک کے حالات اردو کے کچھ ایسے خلاف ہو گئے ہیں کہ اس کی بے حد مقبولیت کے باوجود کوئی حکومت بھی اردو والوں کے مطالبے کو منظور نہ کر سکی، ایسی صورت میں جبکہ اردو کے لئے ملک کے حالات ناساز گار ہوں ایک خاص حلقے کی رائے عامہ جو بہت مؤثر تھی اور بڑی حد تک اب بھی ہے خلاف تھی۔ تو حکومت پر بے انصافی کا الزام لگانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں سے زیادہ بدقسمتی سمجھتا ہوں پاکستان میں اردو کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس سے مایوس ہو کر بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے ایک نجی خط میں لکھا تھا "اردو زبان بہت بدنصیب معلوم ہوتی ہے جو جگہ اس کے بدخواہ کسی نہ کسی صورت میں آ موجود ہوتے ہیں"۔

دہلی میں اردو کو دوسری زبان کی حیثیت سے سرکاری طور پر تسلیم کئے جانے کے لئے جو کوششیں کی گئیں اور ان کا جو انجام ہوا ان سب سے میں اچھی طرح واقف ہوں اور اس واقفیت کی بنا پر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دہلی میں اگر اردو زبان کو اس کا جائز حق نہیں ملا تو اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر کے علاوہ کچھ ——— بلکہ بہت کچھ ——— ہمارا بھی قصور ہے۔

میرے نزدیک اردو پسند حلقے کچھ نہیں کر سکتے، بے بس اور معذور ہیں، البتہ اگر حکومت جرأت سے کام لے اور مصلحت پرستی چھوڑ دے تو وہ بہت کچھ کر سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ملک کی تقسیم کی وجہ سے اردو کی ہمہ گیری اور اہمیت پر اثر پڑا اور جن سنگھی ذہنیت رکھنے والوں کو اردو کی مخالفت کا بہترین موقع مل گیا، مگر یہ الزامات درست نہیں ہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور یہ کہ تقسیم ملک کی تحریک میں پیش پیش رہی ہے۔ اردو پہلے بھی مختلف فرقوں کی مادری زبان اور اظہار خیال کا ذریعہ رہی ہے اور اب بھی ہے۔ اردو ادب کی کوئی صنف ایسی نہیں ہے



۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو سب سے زیادہ نقصان فرقہ پرستی سے پہونچا ہے، چاہے وہ ہندو فرقہ پرستی ہو یا مسلم فرقہ پرستی

جس میں غیر مسلموں کو امتیازی حیثیت حاصل نہ ہو۔ ۱۹۷۱ء کے وسط میں جامعہ ملیہ میں ہندی اور انگریزی کے ذریعہ اردو سکھانے کے لئے کرسپانڈنس (خط و کتابت) کورس شروع کیا گیا، تو مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اس لئے اردو کو ملک کے بٹوارے اور فرقہ پروری کی سزا دینا کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں ہے۔ لہٰذا ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت سے سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جاتا۔ مگر ۱۹۴۷ء سے اب تک جس قدر حکومتیں بنیں، سب کی سب سود و زیاں کی پھیر میں پڑ گئیں اور اس کی مقبولیت، ہر دلعزیزی، ہمہ گیری اور ملکی و قومی خدمات مصلحتِ وقت اور سیاستِ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ اب بھی وقت نہیں گیا ہے موجودہ حکومت چاہے تو پچھلی غلطیوں کی تلافی کر سکتی ہے۔

اگر واقعی عوام کی بھاری اکثریت اردو کی مخالف ہے اور سچ مچ اس کا خطرہ ہے کہ اردو کو ثانوی زبان قرار دینے سے جن سنگھ فائدہ اٹھائے گی اور حکومت کا سیکولر کیریکٹر اور اشتراکی مطمح نظر خطرے میں پڑ جائے گا تو کم از کم قانون کے ذریعہ یہ تو تسلیم ہی کر لینا چاہیے کہ تمام عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں اردو میں درخواستیں لی جائیں گی، ان کے جوابات اردو ہی میں دئے جائیں گے اور ابتدائی سے اعلیٰ منزل تک ہر سطح پر اردو میں تعلیم کا انتظام ہوگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو کی ترقی کے لئے محض اس قدر کافی نہیں ہے کہ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو ان کی تخلیقات پر انعامات اور ترجموں پر معقول معاوضے دئے جائیں، مگر ان کی ضرورت اور اہمیت کو نظر انداز یا کم کرنا بھی درست نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو سب سے زیادہ نقصان فرقہ پرستی سے پہنچا ہے، چاہے وہ ہندو فرقہ پرستی ہو یا مسلم فرقہ پرستی اور سیاسی جماعتوں میں اس کی سب سے بڑی دشمن جن سنگھ ہے۔

اردو کو اس کا جائز مقام یا حق دلانے کے لئے انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہوتا، اجتماعی کوششوں کا وقت نکل گیا، میں ذاتی طور پر احتجاجی جلسوں، مظاہروں، دھرنا دینے اور پارلیمنٹ چلو جیسے نعروں میں یقین نہیں رکھتا۔

(عبداللطیف اعظمی جامعہ ملیہ دہلی)



اردو کا سیکولر کردار

رفعت سروش

زبانیں آسمان سے نہیں اترتیں۔ زبانیں تحت الثریٰ سے برآمد نہیں ہوتیں۔ زبانیں جیتی جاگتی زندگی کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں اور زندہ معاشرے کے گہوارہ میں پروان چڑھتی ہیں اور جب وہ اپنے خدوخال نکالنے لگتی ہیں تو ان کی انفرادیت کا اظہار ہونا شروع ہوتا ہے۔ اور ادب کے شگوفے کھلنے لگتے ہیں۔ ادبی تخلیقات کسی بھی زبان کی دیرپا زندگی اور توانائی کی ضامن ہوتی ہے زندہ زبانوں کا ادب ایسا عظیم الشان درخت ہوتا ہے۔ جس کی جڑیں تاریخ کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ اور جس کے برگ و بار حال کی عظمت کی گواہی اور شاندار مستقبل کی بشارت دیتے ہیں۔

اردو زبان دنیا کی اہم زبانوں میں سے ایک ہے۔ جس نے ہندوستانی معاشرے کے گہوارہ میں آنکھ کھولی۔ یہیں پروان چڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت بن گئی۔ اس کا ماضی پرعظمت، حال تابناک، اور مستقبل؟ مستقبل شاندار ہونا چاہیے، مگر اس پر تشکیک کے بادل سایہ فگن ہیں۔ کم از کم جدید ہندوستان میں۔

وہ گہوارہ جس میں اردو زبان پروان چڑھی، تاریخ کا زریں دور ہے اور کم و بیش چھ سات سو سال پیشتر یہ زبان ادبی اظہار کا ذریعہ بن گئی تھی اور امیر خسرو نے فارسی کے ساتھ اس کی پیوند کاری کر کے اسے ایک نئے مقام پر کھڑا کر دیا تھا۔

زمال مسکیں مکن تغافل ⁂ درائے نیناں بنائے بتیاں

مگر ضبط تحریر میں آنے سے پہلے اس زبان کو تر، حالات نے جنم دیا وہ مختلف قوموں اور تہذیبوں کا میل ملاپ تھا۔ ہندوستان کے قدیم باشندے اور عرب ترک، افغانی جب آپس میں ملنے لگے فوج میں، بازاروں میں، محفلوں میں، تو پہلے تو یہ احساس ہوا کہ ؏

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

نیلن کب تک۔ انسان انسان کے لئے بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ یہ کشش سماجی رشتے استوار کرتی ہے اور اس کشش نے اظہار و بیان کا نیا اسلوب اختیار کیا ملے جلے الفاظ پر مشتمل زبان کی صورت میں۔ وقت اور معاشرہ کی ضرورت کے تحت یہ زبان وجود میں آئی اور دبے پاؤں دلوں میں گھر کرتی چلی گئی جس کا نام اردو قرار پایا۔ چوں کہ اس کے خمیر میں ہی مختلف قوموں اور تہذیبوں کا میل ملاپ تھا اس لئے رنگا رنگی اس کا حسن بن گئی۔ مختلف مذاہب کو ماننے والے مختلف عقائد رکھنے والے اور اپنی اپنی روایات پر ناز کرنے والے اس زبان کے ذریعے ایک دوسرے کے قریب آئے اور اس طرح اس زبان کا سیکولر کردار واضح ہونا شروع ہوا کیونکہ اس کا دامن دل سب کے لئے وا تھا اور اس کی نظر میں سب برابر اور محترم تھے غالباً یہی احساس سیکولرزم کی اساس ہے۔

سیاسی اور سماجی طور پر منقلب اور منتشر ہندوستانی معاشرے میں درویشوں کی خانقاہیں روحانی سکون اور ذہن و دل کو آسودگی کا ماحول فراہم کرتی تھیں کیونکہ ان فراخ دل اور وسیع المشرب بزرگوں کے دربار میں ہر مذہب، ہر عقیدے اور ہر طبقے کے لوگ آتے تھے اور کسب فیض کرتے تھے اور انسانیت کی اعلا قدروں کے ساتھ اس نوزائیدہ زبان کی شیرینی اور معصومیت بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ اردو زبان رابطے کی زبان بنی: بلکہ اس کے سیکولر خد و خال بھی نمایاں ہونے لگے اور غیر محسوس طور پر ادب کی نشو و نما ہونے لگی۔

یورپی قوموں کی آمد کے ساتھ ہندوستانی سماج کی رنگا رنگی میں اور تنوع آیا، کیونکہ یورپ سے آنے والے اپنے ساتھ اپنا مخصوص تمدن اور مذہبی روایات بھی ساتھ لائے اور اپنے خیالات کے فروغ کے خاطر اور عوام تک پہنچنے کے لئے انھیں عوامی زبان کی ضرورت پڑی اور ظاہر ہے کہ رابطے کی زبان اردو تھی۔ مغربی زبانوں کے الفاظ کی نمائش سے اردو میں اور بانکپن آگیا اور ملک کے طول و عرض میں اس زبان کا سکہ چلنے لگا اور وہ وقت آگیا کہ ہندوستان میں رائج تمام مذاہب کا لٹریچر اردو میں وافر مقدار میں دستیاب تھا۔

مختلف مذاہب کی کتاب

صرف اسلام ہی نہیں، مسیحی، آریہ سماجی، جین سب مذاہب کے متعلق بنیادی معلومات کی ضروری کتابیں اردو میں تالیف کی گئیں۔ تفصیل میں جانے کا موقعہ نہیں مگر اجمالی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ راماین، مہا بھارت گیتا، انجیل، قرآن، احادیث گرو گرنتھ صاحب اور دیگر مقدس کتابوں کے تراجم سے اردو کا دامن مالا مال ہے اور ان کی تعلیمات کو عام کرنے میں اردو زبان نے اہم کردار ادا کیا ہے اور ہمارے مقتدر اہل قلم نے ان کی تفسیریں اور نکات بیان کرنے میں ناقابلِ فراموش کام کیا ہے اور اردو کے سیکولر کردار کو عظمت اور پائیداری بخشی ہے اور یہ حقیقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ اردو مذہبی زبان نہیں بنی مگر ہر مذہب کے ماننے والوں کی مشترکہ زبان کے طور پر کشمیر سے کنیا کماری تک اور آسام سے بلوچستان تک ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی اور ایک مشترکہ ثقافتی ورثہ بن گئی جس میں عوام کے مسائل، آرزوئیں، تمنائیں خواب اور خوابوں کی تعبیریں، غم، خوشیاں، ولولے عزائم



ڈاکٹر اقبال اور ان کے ناقدین

ہو گئے، سب پھر قوس قزح کے رنگوں کی طرح جھلملانے لگے اور چند سو سال میں ایسا رچاؤ پیدا ہو گیا کہ اردو ادب و شعر کو دنیا کی کلاسیکل زبانوں کے ادب پاروں کے مقابل نہایت اعتماد سے رکھا جا سکتا ہے۔ جن ادیبوں اور ادب پاروں پر ہم آج بھی فخر سے اپنا سر اونچا کرتے ہیں ان میں اگر دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم ہے تو دوسری طرف میر حسن کی مثنوی سحر البیان۔ اگر فسانۂ عجائب کے خالق رجب علی بیگ سرور ہیں تو فسانۂ آزاد کے تخلیق کار رتن ناتھ سرشار عوام کے دلوں میں حب قومی جگانے والے ولولہ انگیز شعرا میں درگا سہائے سرور، نوبت رائے نظر پنڈت برج نرائن چکبست۔ دوار کا ناتھ افق اور ترلوک چند محروم کا نام مولانا الطاف حسین حالی، محمد حنیف آزاد اسمٰعیل میرٹھی، اقبال اور جوش کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ آغا حشر کاشمیری اور منشی نرائن پرساد بیتاب کے ڈرامے اردو ادب کی اہم میراث ہیں۔

افسانہ نگاروں کی کہکشاں میں پریم چند سجاد حیدر یلدرم مرزا حید رحسن رسوا، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، پریم ناتھ در، شوکت تھانوی، اور کنہیا لال کپور جیسے اہم نام ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔

مولوی عبدالحق اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے ادبی اور تعمیری کاموں کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ مولوی مہیش پرشاد اور مولانا امتیاز علی عرشی غالبیات کی دنیا کے ناقابلِ فراموش نام ہیں۔

غزل کے گیسو سنوارنے میں حسرت موہانی، جگر مرادآبادی کے ساتھ رگھوپتی سہائے، فراق گورکھپوری اور لبھو رام جوش ملسیانی کو تاریخ ادب ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اور وہ اہل علم و ادب جن کا قلم آزادی سے پہلے جوان ہو چکا تھا اور آج بھی گل افشانی کر رہے ہیں ان میں آنند نرائن ملا، غلام ربانی تاباں، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، مالک رام، آل احمد سرور، گیان چند جین، خورشید الاسلام، جگن ناتھ آزاد علی جواد زیدی، کرتار سنگھ دگل، سردار جعفری، کنور مہندر سنگھ بیدی، کیفی اعظمی، ریوتی سرن شرما، محمد حسن، م۔ م راجندر اور کوثر چاند پوری اپنی اپنی تابناکی سے اردو ادب کے ہفت رنگ افق کو روشن کئے ہوئے ہیں۔

موجود ادیب

اور پھر یہیں وہ لوگ جو آزادی کے وقت قلم پکڑنا سیکھ رہے تھے یا اڑان کے لئے پر تول رہے تھے اور آج اردو ادب و شعر کی سیکولر روایت کو برقرار رکھنے میں معروف ہیں ان میں قابلِ ذکر ہیں رام لال، قاضی عبدالستار، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، علم چند نیر، خلیق انجم، جوگندر پال، غیاث احمد گدی، بلراج مینرا، انور عظیم،



آل احمد سرور

بلراج کومل، شہریار، سریندر پرکاش، اقبال مجید، کمار پاشی، محمد علوی، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، ظفر اوگانوی، راج نرائن راج، مخمور سعیدی، آزاد گلاٹی، اور ندا فاضلی۔

(اس سلسلے میں سیکڑوں نام لئے جا سکتے ہیں مگر ہمیں یہاں فہرست سازی مقصود نہیں ہے)۔

لمحہ فکریہ

مگر لمحہ فکریہ یہ ہے کہ اردو کے روایتی سیکولر کردار کی نمائندہ یہ آخری نسل ہے (خدا کرے غلط ہو) گذشتہ پچیس تیس سال میں جس نسل نے جنم لیا ہے اور جسے بجا طور پر نوجوان نسل کہا جاتا ہے وہ کم از کم اردو کی تعلیم کے معاملے میں مشترکہ تمدن اور قابلِ فخر سیکولر روایات کی توسیع کرنے میں ناکام رہی ہے۔ آزادی کے بعد ہمارے تعلیمی نظام میں جہاں اور انقلاب آتے وہاں ایک انقلاب عظیم یہ آیا کہ بہت سے اسکولوں سے اردو کو خارج کر دیا گیا۔ اس کی بڑی مثال یو۔ پی کے اسکول ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کی مادری زبان اردو تھی وہ بھی اپنے بچوں کو اپنی زبان میں تعلیم دلانے سے محروم رہے۔ اربابِ اقتدار کو اس غلطی کا احساس ہوا تو مگر بہت دیر بعد۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

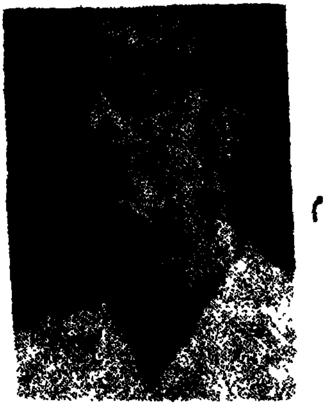
طالب علموں کی ایک نسل اردو سے قطعاً محروم ہو گئی اور پھر چونکہ تلاشِ معاش میں اردو کسی صورت معاون ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے اس کی طرف سے توجہ ہٹتی چلی گئی اور یہ زبان اعلا تعلیم گاہوں سے نکل کر چھوٹے چھوٹے مکتبوں میں محصور ہو گئی اور اس کے پڑھنے والے صرف ایک طبقے کے لوگ رہ گئے۔ غریب مسلمانوں کے بچے غریب ہیں میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آزادی کے بعد ہمارے نظامِ تعلیم کا معیار بلند ہونا شروع ہوا تو پبلک اسکول تیزی سے کھلنے لگے۔ جہاں معیارِ تعلیم بلند ہو یا نہ ہو مگر اخراجات کا معیار بہت بلند ہے۔ اب صاحبِ استطاعت لوگ تو اپنے بچوں کو پبلک اسکولوں میں پڑھانے لگے کیوں کہ وہ بلند معیارِ زندگی کی دلیل ہے اور سرکاری اسکول رہ گئے محض غریب بچوں کے لئے۔ اسکولوں نے امیر غریب کے درمیان خلیج کو بڑھانے میں نمایاں کارنامہ سرانجام دیا۔ اور یہ بات شاید کسی وقت اہلِ اقتدار کی سمجھ میں آجائے کہ یہ فاصلہ سوشلزم اور سیکولرزم کے لئے کراری چوٹ ثابت ہوا ہے اور اس سے اتحاد کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ گزشتہ بیس پچیس سال سے ان اردو ادیبوں کے بچے اردو نہیں پڑھتے جن کی اقتصادی حالت اچھی ہے اور جو اپنے بچوں کو اعلا درجے کے پبلک اسکولوں میں پڑھانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اب یہ ادیب زادے اپنے والدین کی ادبی میراث کو نہ سنبھالنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہ اس روایت کی توسیع کر سکتے ہیں۔ میں نام گنا کر اہلِ ذوق کا ذائقہ خراب نہیں کر سکتا۔ مگر واقعہ یہ ہے

د اس فہرست میں اردو کے صفِ اوّل کے ادیبوں اور شاعروں کے نام شامل ہیں جن کی کتابوں کو ان کے اپنے بچے نہیں پڑھتے — پڑھنے کے اہل ہی نہیں۔

تو اس صورت میں جب اردو کی تعلیم محدود ہو کر رہ گئی ہو۔ اور وہ بھی ایک طبقے کے مخصوص لوگوں تک — تو کیا کل کو اس زبان میں جو ادیب، شاعر اور نقاد پیدا ہوں گے ان کی صفوں میں وہ تنوع اور رنگا رنگی آ سکتی ہے جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے!! — کیا وہ اردو کے اس سیکولر کردار کی نمائندگی کر سکیں گے جس کے لئے اردو آج تک ممتاز رہی ہے؟ — شاید نہیں۔ اور ممکن ہے کل اردو محض ایک مذہبی اقلیت کی زبان کی صورت میں باقی رہ جائے۔ کیونکہ آج کل جو طلباء اسکولوں اور کالجوں میں اردو پڑھ رہے ہیں ان میں بھاری اکثریت اقلیتی طبقے کی ہے۔ شاید ۹۵ اور ۵ کا تناسب ہو اور بعض علاقوں میں ممکن ہے یہ بھی نہ ہو۔ میرے اس خیال کی تصدیق ہو جائے گی اگر بیس پچیس سال کی عمر کے طلباء کا جائزہ لیا جائے اور تحقیق کی جائے کہ ان میں اردو کتنے لوگ پڑھ رہے ہیں اور وہ کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس وقت شاید میرا یہ گمان یقین میں بدل جائے کہ کل کا اردو معاشرہ کوئی مالک رام، کوئی آنند نرائن ملا، کوئی گوپی چند نارنگ، کوئی گیان چند جین، کوئی کرشن چندر پیدا کرنے کے اہل نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس طبقے کے بچے اب اردو نہیں پڑھ رہے ہیں۔ جہاں یہ نام رکھے جاتے ہیں ایسے مستقبل میں کیا ہوگا اردو سیکولر کردار کا؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مستقبل میں اردو وطن دوستی اور اتحاد و یکجہتی سے کنارہ کر لے گی — نہیں — بالکل نہیں مگر اس میں یک رخی ضرور آ جائیگی۔ کیونکہ اس منظر نامے میں ہم یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ اردو ادیبوں کی کہکشاں میں ہر مذہب و ملت کے ستارے جگمگا رہے ہیں۔ ہاں ماضی کا واسطہ ضرور دیا جائے گا اور ان ناموں کی دہائی دی جائے گی جو تاریخ کی زینت بن چلے ہیں۔



مالک رام

دیگر مظاہر

اردو کے سیکولر کردار کے دیگر مظاہر کا حال بھی امید افزا نہیں۔ کل ہر مذہب کا لٹریچر اردو میں چھپتا تھا کیونکہ پڑھا جاتا تھا۔ آج اور مذاہب کی کتابیں اردو میں چھپنا تو دور کی بات ہے، اس مذہبی اقلیت کی بنیادی معلومات کی کتابیں (جیسے روزہ نماز کی ترکیبیں) بھی غیر اردو زبان میں چھپ رہی ہے جس سے بچوں کو اردو پڑھانے کا چلن ابھی باقی ہے۔ یعنی اردو پڑھنے والے آہستہ آہستہ کم ہو رہے ہیں اور زبان کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے اور اس طرح یہ ہزار سالہ عظیم ورثہ تعصب اور تنگ نظری کی نذر ہوا جا رہا ہے۔ کیا ہمارا نظام تعلیم اس کا کوئی حل نہیں تلاش کر سکتا؟ میرے بچپن میں جبکہ ہم غیر ملکی سامراج کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے۔ اسکولی تعلیم نظام ایسا تھا کہ طلباء کو اردو اور ہندی دونوں زبانیں لازمی طور پر پڑھنی پڑتی تھیں۔ اگر زبان اول اردو ہے تو زبان دیگر ہندی پڑھتے اور اگر زبان اول ہندی ہے تو دیگر زبان کے طور پر اردو پڑھتے — کیا ہم آزاد ہندوستان میں

غلامی کے دور کی اس مستحسن روایت کو نہیں اپنا سکتے؟ کیا ہم اتحاد اور یک جہتی کے نعرے لگاتے ہوئے آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی روایات اور تہذیبی اقدار سے یونہی دور ہوتے چلے جائیں گے؟؟

خوش فہمی

ہم اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ اردو فروغ پا رہی ہے، کیونکہ ہر ریاست میں اردو اکیڈمیاں قائم کی جارہی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اردو پروگرام بڑھ رہے ہیں۔ غزل اور قوالی کی محفلیں بڑے اہتمام سے سجائی جارہی ہیں۔ مانا کہ اس گرم بازاری اور ہنگامہ آرائی سے اردو کا نام روشن ہوتا ہے۔ مگر یہ سب چراغ کی بھڑکتی ہوئی لو کے مترادف ہے — اکیڈمیوں کے سامنے آج کا منظر نامہ ہے۔ بوڑھے اور معذور ادیبوں کو امداد۔ بزرگ

ایک عرصہ ممنوعہ رہنے کے بعد اب ریڈیو پیشہ ور ادھیڑ عمر کے ادیبوں اور شاعروں کو انعامات و اعزازات مطبوعہ کتابوں پر انعامات — مگر مستقبل کی فکر کسے ہے؟ یہ جو آج ادب کے آفتاب و مہتاب جگمگا رہے ہیں ان کے غروب ہونے کے بعد نئے ستارے بھی ہیں مستقبل کے دامن میں یہ انعام واکرام کی بارش کرنے والی یہ اردو اکیڈمیاں اگر کچھ انعامات صرف ان نوجوانوں ادیبوں اور شاعروں کے لئے مخصوص کریں جن کا سنہ پیدائش ۵۰ یا اس کے بعد ہو۔ اور ان میں بھی ایک خاص تناسب غیر مسلم نوجوان ادیبوں کا رکھا جائے تو اندازہ ہو کہ کتنے مستحق میدان میں آتے ہیں۔ گذشتہ سالوں میں غیر مسلم اردو ادیبوں نے بڑی ٹھاٹ دار کانفرنسیں کیں، لیکن ایک لمحہ کے لئے نہ سوچا کہ اس انبوہ کثیر میں صرف بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے ادیب آئے۔ ان کی صفوں میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کا وجود تقریباً ناپید ہے۔ پھر کل کون آگے آئے گا، ان کے ہاتھ سے مشعل لے کر اگلی منزل سر کرنے اور اردو کے سیکولر کردار کے اس پہلو کی تجسیم کرنے۔

اردو پروگرام بڑھ رہے ہیں مگر ان پروگراموں کو چلانے والے جن مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں وہ واقعی ایک مسئلہ ہے۔ اردو ڈراموں میں کام کرنے والے ایسے فنکاروں کی تعداد ناقابل ذکر ہے جو اردو زبان اردو رسم الخط میں پڑھ سکتے ہوں لہٰذا تلفظ کی غلطیاں لازمی ہیں۔ ریڈیائی تقریروں کے لئے ادبی موضوعات کے علاوہ دیگر علوم پر تقریریں کرنے کے لئے اردو داں بڑی مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں کیونکہ اب جو لوگ سائنس، معاشیات، اقتصادیات اور دیگر شعبوں کی طرف جاتے ہیں ہمارا تعلیمی نظام انہیں اردو پڑھنے کے مواقع فراہم نہیں کرتا۔ ریڈیو پر مقصدی پروگرام پیش کرنے کے لئے ادیبوں اور شاعروں کی نہیں، مضامین کے ماہرین کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے غیر اردو داں حضرات سے کام چلانا پڑتا ہے



گلوک چند محروم ۔ ایک یادگار تصویر

نتیجہ ظاہر ہے۔

یہی حال غزل گانے والوں کا ہے۔ نوجوان نسل کے غیر مسلم فنکار بڑے اشتیاق سے غزل گاتے ہیں مگر اردو رسم الخط سے ناواقفیت کے باعث نہ وہ الفاظ کو صحیح ادا کر پاتے ہیں نہ ان کے گانے میں معانی کی تہیں ابھر کر آ سکتی ہیں۔ غزل سپاٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔

غرض جس پہلو پر نظر ڈالیے محسوس ہوتا ہے کہ اردو اپنا وقار کھو رہی ہے، اس کی گرفت ڈھیلی ہو رہی ہے۔ اس کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ اس کی شاخوں پر نئے برگ و بار نہیں آ رہے ہیں اور یہ ہمہ جہت زبان سکڑتی سمٹتی جا رہی ہے۔ ہمارے ناقص تعلیمی نظام نے اگر اپنا جائزہ نہیں لیا اور بر وقت انقلابی رویہ نہیں اپنایا اور تنگ نظر سیاست نے اگر اپنی روش نہیں بدلی تو اپنے تمام ترمحاسن اور عظیم روایات کے باوجود اردو محض ایک مذہبی اقلیت کی زبان ہو کر رہ جائے گی۔ اور ممکن ہے آگے چل کر ہندوستان میں یہ بے مقام زبان عوام سے اس طرح کٹ جائے کہ مستقبل کے ہندوستان کی رنگا رنگ تصویر پیش کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس کے شعلہ باز نغمے اور بہار آفریں ترانے ماضی کے ہونٹوں پر جم کر رہ جائیں اور اس کے عظیم کتب خانے عجائب خانوں میں تبدیل ہو جائیں۔ مگر وہ دن جمہوری ہندوستان کا تاریک دن ہوگا۔ جب سیکولرزم کا ایک سرچشمہ سوکھ جائے گا۔

لیکن امید کی ایک کرن باقی ہے۔ ابھی یہ زبان سانس لے رہی ہے اور اس کی بقائے دوام کے لئے تازہ اور نئے خون کی ضرورت ہے۔ ان عوامل کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے جو اردو کے سیکولر کردار کے ضامن ہیں۔ اپنی غلطیوں کا ازالہ اور اپنے اعمال کا احتساب کرنے کی ضرورت ہے اور پھر اردو زبان خود ہندوستان کے جمہوری سیکولر اور صحت مند معاشرے کی بقا کے لئے بھی تو ضروری ہے۔



اردو ناول

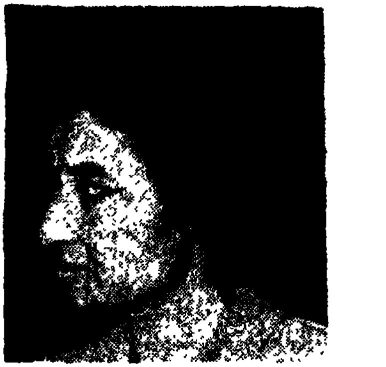
۴۷ سے آج تک

• دیوندر اسر

ناول کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے مارکیٹ میں ہر قسم کے غیر معیاری اور نیم معیاری ناولوں کی بھرمار ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ناول ایسے ہیں جنہیں ادب کے دائرے میں شامل کرنا ادب کی نئی تعبیر کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے مارکیٹ میں جنسی تلذذ، تشدد، قتل و غارت گری اور مار دھاڑ سے بھرپور نیم ادبی فلمی اور جاسوسی ناولوں کی بہتات ہے۔ ان حالات میں کسی معیاری ناول کی اشاعت جو ادبی بھی ہو اور قابلِ مطالعہ بھی ایک "خوشگوار حادثہ" ہی سمجھا جانا چاہیے۔

اردو کے بیشتر ناول نگار بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان میں سے بھی کچھ ایسے ہیں جو ناول کو ایک ادبی صنف کے طور پر کم اس کے کمرشل پہلو کے لیے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ ناول نگاری ان کے لیے ادبی مہم نہیں، تجارتی تجویز ہے اور ناول نگاری ایک تبدیلی ہے جس کا انجام صحت مند کم، مہلک زیادہ ثابت ہوا۔ ناول نگار اور ناول دونوں کے لیے۔ ایسے ناولوں کو پڑھ کر اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ناول چند افسانوں کو مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے یا کسی افسانے کو طول دے دیا گیا ہے۔ افسانے کو طویل کر دیا تو ناولٹ بن گیا۔ افسانوں کو ایک مرکزی کردار کے ذریعہ جوڑ کر پھیلا دیا تو ناول تخلیق ہو گیا۔

اردو میں جدید ناول کی نشوونما بھی نئے افسانے کی طرح روایت اور تجربے کی باہمی آمیزش (اور آویزش) میں ہوئی۔ (یہاں جدید اور "نیا" ہم عصر کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں)



قرۃ العین حیدر

اردو کے نئے افسانے کی پرورش مغربی ادب کی تحریکوں کے گہوارے میں ہوئی۔ مغرب کی فنی تحریکوں کا مجموعی اثر ہمارے ادب پر تو پڑا ہی، لیکن کچھ ادیبوں کا اثر ہمارے ادیبوں نے انفرادی طور پر قبول کیا۔ افسانے کے مقابلے میں ناول میں جدید ذہن اور جدید ادبی تحریکوں کی عکاسی بہت کم ملتی ہے۔ تکنیک کے نئے نئے تجربے بھی شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ ناول نگاروں نے افسانے کے شعبے میں جس تخلیقی صلاحیت اور انفرادی اپچ کا ثبوت دیا۔ اس کا دھندلا سا عکس ہی ان کے ناولوں میں ملتا ہے۔ اس کا ایک باعث شاید یہ ہے کہ افسانے کا کینوس محدود ہونے کے باعث ادیب مختلف افسانوں میں موضوع اور ہیئت کے نئے نئے تجربے کر سکتے ہیں اور ناکامی کی صورت میں خطرہ بھی زیادہ نہیں۔ لیکن چند مثالوں کو چھوڑ کر جب بھی انہوں نے ناول کی تخلیق کی انہوں نے روایتی طرز کو ہی ترجیح دی۔ جس کے باعث نئی زمین کی تلاش کے بجائے "فارمولا" کے محفوظ اصول پر عمل کیا گیا۔ اس لیے ناول کے شعبے میں جتنے اہم تجربے مغرب میں ہوئے ہیں ان کی ہلکی سی جھلک بھی ہمارے ناولوں میں نہیں۔ سوائے شعور کے بہاؤ کی تکنیک کے، لیکن یہ تکنیک بھی اب قبل از جدید ہو کر روایت میں شامل ہو چکی ہے۔ مغرب میں نت نئی تحریکیں ابھریں۔ اینگری ینگ مین، بیٹس، وجود پرستی، لغویت کا ادب یا ایلن راب گرے کے تجریدی ناول۔ اس معنی میں اردو کا ہم عصر ناول جدید نہیں۔

سوال یہ نہیں کہ ہمارے ناول نگار مغربی ادب کی جدید تحریکوں سے متاثر کیوں نہیں یا انہیں اپنے ادب میں پیش کیوں نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ جس ذہنی سفر کو مغربی ادیبوں نے طے کیا ہے اس تک ہماری رسائی کیوں نہیں جبکہ تہذیبی اور سماج کے نشوونما کے فرق کے باوجود "جدید ذہن" "ہمہ گیر نفسیاتی پیٹرن" کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس معنی میں یہ ہمارے دور کا اجتماعی شعور بن چکا ہے۔ ہمارے ناول نگار جدید ذہن کے اثر کو مشرقی انداز فکر، منفرد شخصیت اور مزاج اور ذاتی اپچ میں سمو کر "جدید ہندوستانی ناول" کی تخلیق کرنے میں اکثر کیوں ناکام ہوئے۔ مثال کے طور پر وقت کے تصور کو ہی لیجئے۔ یہ تصور قرۃ العین حیدر اور احمد علی کے ناولوں تک ہی کیوں محدود ہے جب کہ مغرب میں مارسل پروست، ورجنیا وولف اور جیمس جوائس جیسے باشعور ادیبوں پر گساں جیسے فلسفی اور آئین اسٹائن جیسے سائنس دانوں نے مختلف پہلوؤں سے غور و فکر کرنے کے بعد انسان تصور کو کائنات کے اسرار و رموز سے روشناس کرایا ہے۔ وقت کا تصور ہندوستانی فلسفے میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا دائرہ حیات و موت کے دائرے سے بھی پرے آفاقی شعور COSMIC CONSCIOUSNESS تک جا پہنچتا ہے جس کی جانب موجودہ دور میں اروند گھوش نے اپنے نظریہ فوق الشعور میں اشارہ کیا ہے اور جس کی جانب مغرب کے ماہرین نفسیات، فلسفی اور سائنس داں دھیرے دھیرے بڑھ رہے ہیں ہندوستان کا INTEGRATED نفس کا نظریہ تحلیل نفسی پر حاوی ہو رہا ہے۔ مشرق و مغرب کی ذہنی حدیں مٹ رہی ہیں۔ لیکن جیسے ہمارے ہاں خبر ہی نہیں پہنچی نہ مغرب کی نہ مشرق کی۔ اس لیے جدید اردو ناول فکری سطح پر کافی پسماندہ ہے اور یہ پسماندگی

بھی ایک روایت بن چکی ہے۔

اردو ناول کی تاریخ ویسے بھی زیادہ پرانی نہیں مولوی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا محمد ہادی رسوا، اور عبدالحلیم شرر کے ناول جدید ناول کا پیش خیمہ ہیں۔ گزشتہ بیس برس کے اردو ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان ناولوں کو دہرانے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ ہم عصر ناول نگار انفرادی نفسیات اور سماجی عوامل سے واقف ہونے کے باوجود بھی ایک بھی ایسا کردار تخلیق نہیں کر سکے۔ جو امراؤ جان ادا یا خوجی کی طرح لافانی کردار بن جائے۔ اسی طرح پریم چند کے گئودان کے ہیرو ہوری کے بعد اردو ناول میں ایسا نمائندہ کردار تخلیق نہیں ہوا۔ جو اپنے دور کے حالات اور سماجی زندگی کا سمبل بن سکے۔

پریم چند نے اردو ناول کو ہوری، جیسے بھرپور کردار سے ہی روشناس نہیں کرایا بلکہ ناول کو نام نہاد تاریخی رومانیت پرستی سے بھی آزاد کیا لیکن اصلاحی جذبے کی فراوانی کے باعث پریم چند بھی اپنی ناولوں کے فنی پہلوؤں کی مکمل نشوونما نہیں کر سکے اور یہ کمی آج بھی ان ناولوں میں نظر آتی ہے جو پریم چند کی روایت کو لے کر آگے بڑھے ہیں۔ صالحہ عابد حسین کے قریب قریب تمام ناول نہ صرف آدرش، حقیقت پسندی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے اسلوب بیان میں بھی روایتی طرز کے حامل ہیں۔ راہ عمل ہو یا یادوں کے چراغ اسی روایت میں پرورش پاتے ہیں۔ پریم چند کی ناولوں پر ٹالسٹائی کا اثر غالب تھا۔ جبکہ یورپ کے جدید ناول نگاروں نے ٹالسٹائی کے ہم عصر دوستوفسکی سے اثر قبول کیا۔ دو ہم عصر ادیبوں سے الگ الگ اثر لینے والے ادیب اس باعث "روایت پرست" اور "جدید" کے دائروں میں بٹ جاتے ہیں۔

اردو میں نئے ناول کا آغاز صحیح معنی میں ترقی پسند تحریک سے ہوا جس کی نشوونما آزادی کے بعد ہوئی۔ اور بحیثیت ایک ادبی صنف کے تسلیم اور مقبول ہوا۔ نیا ناول دیہی زندگی کے بجائے شہری زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے۔ شہری زندگی بھی وہ پریم چند کے دور کی شہری زندگی سے بہت آگے نکل چکی ہے۔



امراؤ جان ادا کے خالق مرزا محمد ہادی رسوا

پریم چند کے دور کی شہری زندگی قصبے کی زندگی کی سی وسعت تھی۔ بلونت سنگھ، جمیلہ ہاشمی، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے کچھ ناول گاؤں کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان کا انداز فکر، کردار نگاری، اسلوب بیان، ذہنی فضا اردو ناول میں نئے دور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن پریم چند کے ناولوں کی آدرش حقیقت نگاری اور انسانیت اپنی اوریجنل فارم میں بھی برقرار رہی۔ لیکن یہ روایت کرشن چندر کی ناولوں میں مارکسیٹ کے زیر اثر سماجی حقیقت نگاری اور طبقاتی شعور کی صورت میں نمو پذیر ہوئی آدرش اور حقیقت کے سنگم کی روایت میں نئے ناول نے رومانیت کو بھی شامل کر دیا اور مقصدیت پر فن کا پردہ ڈال دیا۔

حقیقت پرستی کی روایت نئے ناول میں پریم چند کی ناولوں کے علاوہ مغرب کی حقیقت پرستی کے راستے سے بھی شامل ہوئی۔ مغرب کی حقیقت پرستی (زیادہ تر فطرت نگاری کی شکل



بلونت سنگھ — رومانی نقطۂ نظر

میں اس کا سب سے گہرا اثر عزیز احمد نے قبول کیا۔ پریم چند کی حقیقت نگاری میں آدرش اور اخلاقی اقدار کی تکمیل کی خواہش شامل تھی۔ لیکن عزیز احمد کے ناولوں میں آدرش کی تکمیل کے بجائے نفسیاتی فطرت نگاری کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ اس کا باعث فرانسیسی فطرت نگار ادیبوں سے عزیز احمد کا متاثر ہونا ہے "ہوس" "گریز" "آگ" "مرمر اور خون" "ایسی بلندی اور ایسی پستی"، اس نفسیاتی صداقت کو پیش کرتے ہیں عزیز احمد فرائڈ کے نظریہ جنس سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ اور وہ جنس کا ذہنی اور جسمانی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

ہم عصر ناول میں آدرش، حقیقت، رومانیت، فن کا جمالیاتی احساس، طبقاتی شعور اور جنس و لاشعور کے عناصر باہم گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ بیشتر ناول حقیقت اور رومان کے امتزاج سے جنم لیتے ہیں۔ کرشن چندر کے ناول اس کا ثبوت ہیں۔ آزادی سے قبل شائع شدہ کرشن چندر کا ناول "شکست" اور اوپندر ناتھ اشک کا "ستاروں کا کھیل" اسی امتزاج کو پیش کرتے ہیں "ستاروں کے کھیل" نو عمر رومانیت اور "شکست" نو عمر رومانی افسردگی کی اچھی مثالیں ہیں۔ یہ امر کافی دلچسپ ہے کہ "شکست" "ستاروں کے کھیل" اور عصمت چغتائی کا "ٹیڑھی لکیر" ترقی پسند ناول نہیں جبکہ تینوں ناول نگار ترقی پسند تحریک سے منسلک رہے ہیں "ٹیڑھی لکیر" جنسی کجرویوں اور ہم جنسی رشتوں پر مبنی ہے جسے مسلم سماج کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

بلونت سنگھ کے ناول "رات، چاند اور چور" پر حقیقت کے بجائے رومانیت کا عنصر زیادہ غالب ہے یہ ناول حقیقت کو رومانی نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے اس کے برعکس راجندر سنگھ بیدی کے ناول "ایک چادر میلی سی" پر رومان کے بجائے حقیقت حاوی ہے۔ ناول کے بعض حصوں میں مبالغہ آمیزی کا احساس ضرور ہوتا ہے اور اس کا انجام دانستہ طور پر "ڈرامائی" بنایا گیا ہے اس کے باوجود کردار نگاری اور جذباتی کشمکش کی ترجمانی کے باعث یہ ناول حقیقت سے زیادہ حقیقی ہے۔ بیدی کے فن کی جڑیں — ہندوستانی تہذیب اور معاشرے میں کافی گہری ہیں، وہ انسانی جذبات اور تیز و تند ذہنی کیفیات کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کرنے میں ماہر ہیں۔ اور یہ بات "ایک چادر میلی سی" کے مطالعے سے بخوبی عیاں ہو جاتی ہے "ایک چادر میلی سی"، جذبات کی ہیجان انگیز کیفیت اور داخلی کشمکش کی ہلکے اور گہرے رنگوں میں تصویر کشی کرنے میں کامیاب ہے۔ بیدی اپنے اردگرد کی زندگی میں غصے، جھلاہٹ، غم، دکھ درد، اور نفرت اور قربانی اور پیار کو ایک INSIDER کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ان کے فن میں فلسفۂ حیات اور انسانی نفسیات، کردار اور پلاٹ کے تانے بانے میں بن کر سامنے آتے ہیں "ایک چادر میلی سی" بیدی نے انسانی کردار کی پیچ در پیچ شخصیت، جذبات، اور زندگی کے جذبات اقدار کی شکست و ریخت اور لاشعور کی قوت کو زندہ کردار نگاری کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ یہ ناول زندگی کا مرقع ہے۔ بیدی کی فنی مہارت اور فنی احتیاط، ویژن کی گہرائی تخلیقی خلوص اس ناول کو نہ صرف کامیاب ہی بناتے ہیں۔ بلکہ اہم ادبی دستاویز

بھی بنا دیتے ہیں۔ روزمرہ کے معمولی واقعات اور احساسات کو فن کی بلندی تک لے جانا اور ان میں انسانی دکھ درد کی منہ بولتی تصویریں پیش کرنا بیدی کے فن کا کمال ہے۔ یہی احساس احمد علی کے ناول "دلی کی ایک شام" پڑھ کر ہوتا ہے۔ جو انگریزی میں تو آزادی سے قبل شائع ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا اردو ترجمہ آزادی کے بعد شائع ہوا ہے۔ ترجمہ خود مصنف نے نہیں کیا لیکن اس میں اوریجنل ناول کا سا تاثر موجود ہے۔

شوکت صدیقی نے ناول کو ایک سنجیدہ طرز فن کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بیدی کے ساتھ شوکت صدیقی کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ بیدی کی طرح ہی شوکت صدیقی سماجی شعور رکھتے ہیں اور زندگی کی کردار نگاری کے قائل ہیں۔ خدا کی بستی، اکھڑے ہوئے لوگوں کے گھٹنے ٹوٹے زندگی کو اور کرداروں کے غم و الم کو نہایت چابک دستی سے پیش کرتا ہے۔ ان کا دوسرا ناول کوکا بیلی بھی ایک کامیاب ناول ہے۔

یہی فنی شعور خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" میں موجود ہے۔ خدیجہ مستور نے حیات کو ایک مکمل اکائی کے روپ میں دیکھا ہے اور پھر اس کے مختلف حصوں پر نظر ڈالی ہے اور غیر ضروری جزئیات کو چھوڑ کر ان مختلف حصوں کو ایک فنی اکائی میں منظم کر دیا ہے۔ یہی باعث ہے کہ "آنگن" افسانوں کا مجموعہ نہیں ناول ہے۔ "آنگن" انسان کے نازک ترین رشتوں کو تہذیبی اور سماجی پس منظر میں متحرک طور پر پیش کرنے میں کامیاب ثابت ہوا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار عالیہ اور بھی عام کرداروں کی طرح سپاٹ نہیں اور وہ پورے ناول پر حاوی ہیں۔

جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاش بہاراں" کا بڑا مپر چار ہوا۔ "تلاش بہاراں" ناول کی تکنیک کا بھرم قائم رکھتا ہے۔ جس میں ایک کردار کے شعور کے ذریعے واقعات کو ایک مربوط ڈھانچے میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول کا ہیرو ہیرو بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اینٹی ہیرو ہے بلکہ اس لیے کہ وہ نمو پانے سے قاصر ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا دوسرا ناول "داغ فراق" بھی اس طرز کی نمائندگی کرتا ہے۔



رضیہ سجاد ظہیر

خواتین افسانہ نگاروں کا ذکر چل پڑا۔ تو واجدہ تبسم کے "شہر ممنوع" اور رضیہ سجاد ظہیر کے "سمن" اور "اللہ میگھ دے"، اور رضیہ فصیح احمد کے "آبلہ پا" کا ذکر بھی ضروری ہے ان کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسلم معاشرہ کے ٹائپ ناول ہیں۔ لیکن رضیہ سجاد ظہیر کے ناول کسی حد تک مختلف ہیں اور ان کا سماجی شعور عصمت چغتائی کے ناول "معصومہ" سے زیادہ قریب ہے۔

اردو میں خالص رومانی نقطہ نظر سے بھی ناول لکھے گئے ہیں جنکی ادبی اہمیت مسلم نہیں۔ لیکن انہیں وقتی طور پر ادبی ناول کا درجہ مل گیا ہے۔ اے حمید کے ناول کرشن چندر کے رومانی نقطہ نظر سے متاثر ہیں لیکن انہیں سماجی پروٹسٹ اور طبقاتی شعور کی کمی ہے۔ الفاظ کی جادوگری ہے۔ حقیقت کی تلخی نہیں رومانی ناولوں کی اپنی الگ روایت ہے اور یہ روایت اتنی مستحکم ہے کہ غلام عباس اور اشفاق احمد جیسے کہنہ مشق اور باشعور افسانہ

نگار بھی جب ناول کی طرف راغب ہوئے تو انہوں نے رومانیت کی روایت کو ہی سینے سے لگایا۔ غلام عباس کا ناول "محبت روتی ہے" اور اشفاق احمد کے ناول "رومان بہار" زہرا لاحسن خاص رومانی ہے۔

اردو ادب میں مارکسیت اور فرائڈین نفسیات کا اثر قریب قریب ایک ہی دور میں ہوا۔ اس لیے سماجی اور جنسی آزادی کی تحریک ناولوں میں ساتھ ساتھ رہی۔ ناول نگاروں نے سیاسی جبر اور سماجی پسماندگی معاشی عدم مساوات اور جنسی گھٹن، اور کجروی کے خلاف آواز اٹھائی۔ جمہوریت، سماجی انصاف اور مساوات اور آزادی کی اقدار کی اشاعت ہوئی۔ سیاسی، سماجی اور طبقاتی مسائل کے ساتھ ساتھ ہمارے ناول نگاروں نے جنس کو بھی حقیقت پسند نظریے سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس ذہنی پس منظر کے باعث ناول میں جنسی سماجی اور نفسیاتی حقیقت نگاری اور بین الاقوامی نقطۂ نظر کو اہمیت ملی۔

جن ناول نگاروں نے طبقاتی کشمکش جنسی ناآسودگی اور پروٹسٹ پر زور دیا ان میں کرشن چندر کا نام پیش پیش ہے کرشن چندر کے بیشتر ناول ان ہی عناصر سے تربیت پاتے ہیں۔ ناول نگاروں میں سے سب سے زیادہ ناول کرشن چندر نے تحریر کیے ہیں "آسمان روشن ہے"، "ایک عورت ہزار دیوانے"، "ایک وائلن سمندر کے کنارے"، "چاندی کا گھاؤ"، "دل کی وادیاں سو گئیں"، "غدار"، "ایک گدھا نیفا میں"، "گدھے کی سرگزشت"، وغیرہ ان ناولوں میں رومان اور حقیقت، حسن اور انقلاب طبقاتی کشمکش۔ اور جنسی جذبہ سب ایک دوسرے میں خلط ملط نظر آتے ہیں۔ یہ ناول جذبات کو تو چھو لیتے ہیں۔ لیکن انسانی ذہن اور زندگی کا گہرا اور پیچیدہ شعور عطا نہیں کرتے۔ کرشن چندر ہنگامی حالات کو فنی شکل دینے میں جلدبازی سے کام لیتے ہیں۔" جب کھیت جاگے" کے دیہی نظام میں کسانوں کی جدو جہد سے "باون پتے" کی رومان پرور فلمی فضا تک کرشن چندر کے فن میں ایک ٹھہراؤ کی کیفیت تو ہے۔ گدھے کی سرگزشت، موجودہ سیاسی حالات پر ایک تیکھا طنز ہے۔ کرشن چندر کے ناولوں کے کردار ٹائپ کردار بنتے جا رہے ہیں۔

سماجی جبریت اور ٹائپ کرداروں کی روایت اردو ناول میں کافی زور پکڑ چکی ہے۔ مہندر ناتھ کے ناول "آدمی اور سکے"، "رات اندھیری ہے"، "ارمانوں کی سیج"، "سورج ریت اور گناہ" اور خواجہ احمد عباس کے ناول "اندھیرا اور اجالا"، "اور دل چار راہیں" میں بھی ٹائپ کردار اور سماج کا میکانکی تجزیہ اور فارمولا پر مبنی پلاٹ ملتے ہیں۔ ان ناولوں کے کردار سیاہ اور سفید میں بٹے ہوئے ہیں۔ انسانیت پرستی کی قدر تو موجود ہے لیکن موجودہ دور میں اقدار کے بحران کی عکاسی بالکل نہیں۔ مہندر ناتھ کے ناول تو زبان و بیان سے بے رخی برتتے نظر آتے ہیں۔

اقدار کے بحران اور انسانیت پرستی کی موت کی خبر آزادی کے فوراً بعد کی تخلیق راما نند ساگر کے ناول۔ "اور انسان مرگیا" میں کا دیباچہ خواجہ احمد عباس نے تحریر کیا۔ فرقہ وارانہ وحشت کے اس ہنگامی دور میں راما نند ساگر کا جذباتی صدمہ، ایک فطری ردِ عمل تھا۔ لیکن بحث کا موضوع ناول نہیں رہا ناول کا دیباچہ بن گیا اور ترقی پسند حلقوں میں کافی گرما گرمی رہی۔

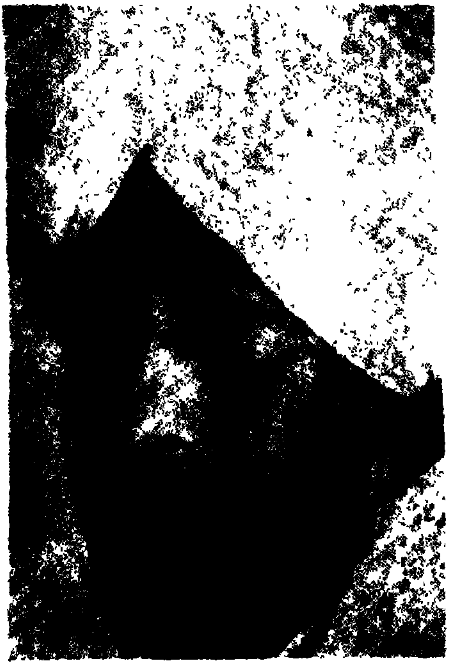
آزادی کے بعد ادیبوں نے ایک نئی دنیا میں آنکھ کھولی۔ ان کے سامنے انسان اور سماجی قوتوں کے ایسے رخ آئے جو ابھی تک ان کی نظر سے پوشیدہ رہے۔ انسان کی شکست کو انہوں نے گہرے طور پر محسوس کیا۔ آزادی کے جشن میں خون خرابے کی وارداتیں اور پھر ازالہ سحر، ادیب ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ اس پس منظر میں "اور انسان مرگیا" کی تخلیق ہوئی۔ دوسرا اہم ناول تھا۔ قدرت اللہ کا "یا خدا"، دونوں ناولوں کی ذہنی ساخت بالکل مختلف ہے۔ "یا خدا" ناول نگار کی ذہنی بلوغت کا نہیں۔ تنگ نظر ذہنیت کا ثبوت دیتا ہے جہاں اور انسان مر گیا" انسانیت کا نوحہ ہے "یا خدا" میں ان عناصر کی اشاعت کی گئی ہے جو اس نوحے کا باعث بنے ہیں۔

سوال ہندوستانی تہذیب اور سیاسی ارتقا کے شعور کا ہے۔ ہندوستانی تواریخ کے اہم موڑوں کی نشاندہی کرنے والے دو اہم ناول ہیں۔ عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں"، اور قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا"۔

"اداس نسلیں" ۱۹۴۷ء - ۱۹۱۳ء تک کے اہم سیاسی ادوار کو محیط کیے ہوئے ہے۔ لیکن ذہنی طور پر یہ ناول ہندوستانی تواریخ کے پورے پس منظر تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ زندگی کس طرح واقعات اور کرداروں کے ذریعے فن کی شکل میں ڈھلتی ہے "اداس نسلیں" اس کی کامیاب مثال ہے۔ نفسیاتی عوامل اور تہذیبی پس منظر میں انسانی جذبات اور احساسات، محبتیں، نفرتیں، دکھ درد، حسد اور ایثار، فرض اور خودغرضی، خواب اور خواہش ان سب کے تانے بانے سے انسان کے ذہن کی پستی اور بلندی کی جاندار صورتیں اس ناول میں بکھری ہوئی ہیں جس میں ہمارے دور کے پیچیدہ ذہن کی فنکارانہ عکاسی ملتی ہے۔ "اداس نسلیں" کو آزادی کے بعد کے ناولوں میں ایک خاص اور اہم مقام حاصل ہے۔

"میرے بھی صنم خانے" اور "سفینۂ غم دل" سے "آگ کا دریا" تک قرۃ العین حیدر کے فن کا ارتقا دراصل ان کے ذہن کے ارتقا کی غمازی کرتا ہے۔ اتنے قلیل عرصے میں انہوں نے حیات وکائنات اور انسانی تہذیب کا جو شعور حاصل کیا ہے اردو ادب میں اس کی مثال، شاید ہی کسی دوسرے ادیب کے فن میں ملے گی۔ قرۃ العین حیدر برگساں کے نظریہ وقت اور ورجینیا وولف کے طرزِ فن شعور کے بہاؤ سے متاثر ضرور ہیں لیکن اس تکنیک کا استعمال انہوں نے اپنے ناولوں میں ایک اوریجنل ادیب کی حیثیت سے کیا ہے۔

ڈھائی ہزار سال قبل کی ہندوستانی تہذیب کے دور سے آزادی کے حصول تک کا وسیع کینوس "آگ کا دریا" میں پھیلا ہوا ہے۔ جس پر گوتم، ہری شنکر، چمپا اور کمال ہندوستانی روح کی زندہ تصویریں بن کر بار بار روپ بدل کر ابھرتے ہیں۔ تہذیبی تواریخ کے مختلف موڑ مجرد فلسفہ یا واقعاتی تاریخ کے ذریعہ نہیں بلکہ



راجندر سنگھ بیدی

تاثرات جذبات اور یادوں کے ذریعہ قارئین تک منتقل ہوتے ہیں۔ ناول میں بہتے شعور کا بہاؤ کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے جو انسان کے ذہن کی فکری اور جذباتی گہرائی اور تسلسل کو پیش کرنے کا کامیاب ذریعہ ہے۔ پوری نسل کے تہذیبی عمل اجتماعی لاشعور کے پروردہ ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ناول کو اس کی مروجہ فنی اور فکری سطح سے بلند کر کے ایک اہم فنی صنف بنا دیا ہے۔ پرزور بیانیہ قوت، فطرتِ مناظر کی تصویر کشی۔ جذبات اور احساسات کی ترجمانی۔ ڈرامائی تاثر، کردار نگاری کی جودت، قوتِ مشاہدہ، تجربہ اور تخیل کی پختہ کاری اور تاریخی شعور "آگ کا دریا" کو اس دور کا اہم ترین ناول بنا دیتے ہیں۔ قرۃ العین





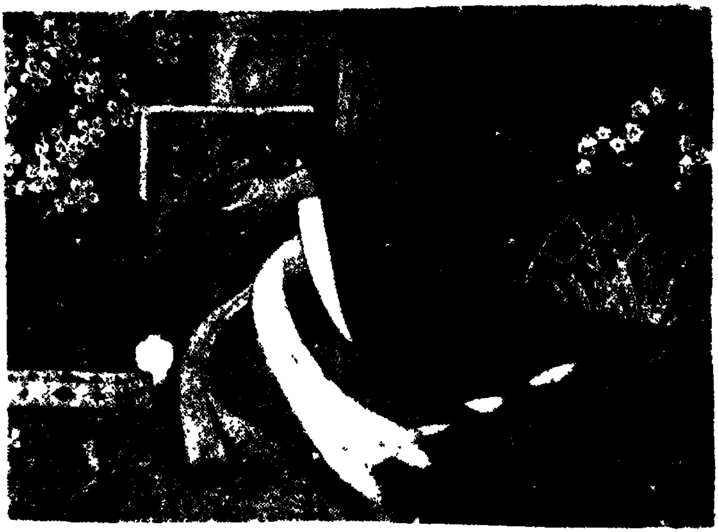
ممتاز مفتی

اُردو ناول میں موضوع مواد، تکنیک اور ہیئت میں نئے اندازِ فکر اور تجربے کی ضرورت ہے

حیدر کے حالیہ ناول، "چائے کے باغ"، اور "آخرِ شب کے ہم سفر" بھی ان کے فنی اور ذہنی ارتقا کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔

اجتماعی لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوبنے کی یہ کوشش ناول نگاری کے لیے لازمی ہے۔ فرائیڈ کے نظریہ جنس اور لاشعور سے زیادہ گہرا اور ہمہ گیر نظریہ کارل ژونگ کا اجتماعی لاشعور کا ہے "علی پور کا ایلی" میں ممتاز مفتی نے اس طرف پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول میں ممتاز مفتی انسان کے لاشعوری محرکات پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اس کی جنسیت پر کم نفسیاتی جبریت کا کسی حد تک شکار ہوتے ہوئے بھی "علی پور کا ایلی" عمیق کردار نگاری کا ایک اہم نمونہ ہے۔

اردو ناول میں موضوع، مواد، تکنیک اور ہیئت میں نئے اندازِ فکر اور تجربے کی ضرورت ہے۔ کتنے ہی مسائل ہیں جن کی جانب ہمارے ادیبوں کی توجہ ضروری ہے۔ تنہائی، تہذیب کا خلفشار، خواہشِ مرگ، انسانی زندگی کے تباہ ہونے کا خطرہ، اقدار کا بحران، اجنبیت اور جلاوطنی، مبہم اور غیر مبہم خوف، تنظیمی ارتقا، فرد کی شخصیت کے فنا کا عمل، ذات کی تلاش اور کرائسس، خود علیحدگی، عدمِ یقین، تکنیک اور ذہنی تذبذب، انسانی، اخلاقی اور علمی زندگی میں انقلاب رونما ہو رہے ہیں۔ کیا ہمارے ناول نگار اس ہر لحظہ بدلتی زندگی کی کامیاب حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو منفرد حیثیت سے پیش کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ اس کا جواب مستقبل کے ناول ہی دے سکتے ہیں۔ اور اس جواب پر ہی "جدید ناول" کی تخلیق کا دار و مدار ہے۔ ●●



اُردو ادب میں مثنوی کی اہمیت

تہمینہ مجیب

اردو ادب میں شعر گوئی خاص اہمیت رکھتی ہے ہر ادب کی ابتدا ازیادہ تر نظم یا شعر سے ہوئی ہے ہماری زبان اردو کی بھی ابتدا شعر ہی سے ہوئی ہے اور ادب کی اسی صنف نے سب سے پہلے ترقی کی ہے۔ اردو شاعری میں مختلف اصناف سخن آتے ہیں جس میں مثنوی کا درجہ بہت اہم اور کارآمد مانا گیا ہے۔ مثنوی کے لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابتدا کب سے ہوئی مگر تحقیقات سے اس بات کا اندازہ ہوا ہے کہ جتنے ابتدائی کلام اساتذہ ملے ہیں سب میں مثنوی کا بڑا حصہ شامل رہا ہے۔

جس طرح اردو شاعری میں فارسی تقلید شامل رہی ہے بلکہ اردو شاعری فارسی کی ہواؤں سے پروان چڑھی ہے۔ اور اس کے مختلف اصناف سخن فارسی کے ہی کا مِنت ہیں۔ اسی طرح مثنوی بھی اہل ایران کا عطیہ ہے جو اردو نے حاصل کیا ہے۔ ایران میں مثنوی کی ابتدا ہوئی اور ایرانیوں کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ وہ عرب کے مقابلے میں خود مثنوی کے موجد ہیں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ عرب میں کوئی اس قسم کے واقعات کا ذکر نہ تھا جیسے کہ عموماً مثنوی میں پائے جاتے ہیں اہل فارس و

ایران نے شاہنامہ، خسرو نامہ وغیرہ مثنوی لکھی ہیں اور شاہنامہ کو تو اہل عرب "قرآن العجم" کہتے ہیں اسی طرح۔۔ مثنوی معنوی کو "ہست قرآن در زبان پہلوی" کہتے ہیں اہل ایران نے اس صنف کو بہت ترقی دی۔ جس میں فردوسی جامی، فیضی کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے اور دیگر اصناف کی طرح مثنوی بھی فارسی زبان سے اردو زبان میں لی گئی

اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوتی ہے۔ اس لیے مثنوی کی ابتدا بھی دکن ہی میں ہوئی سب سے پہلے۔ فرمانروائے گولکنڈہ قطب شاہ نے ایک نفسیہ مثنوی لکھی تھی۔ اس کے بعد ملا وجہی، مولانا مشرقی، بحری رستم وغیرہ نے مثنویاں لکھیں جس میں خاور خانان، حضرت علیؓ کی شان میں لکھی گئی اور بہت مقبول ہوئی۔ مگر یہ مثنویاں باکمال نہ تھیں۔ نشاطی کی جو قطب شاہی زمانہ کا مشہور و معروف شاعر تھا اس کی مثنوی "بن پھول" نامی بہت مقبول ہوئی اس لیے کہ اس نے پہلی مرتبہ منظر کشی کو شامل سخن کیا تھا۔ اس کے بعد متعدد مثنویاں لکھی گئیں مگر زیادہ تر مذہبی تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی شاعری میں مذہب کا رنگ بڑی حد تک پایا جاتا ہے۔ ہر صنف کی ابتدا مذہب سے ہوئی ہے۔ لہٰذا ابتدائی مثنویاں بھی زیادہ مذہبی پہلو لیے ہوئی تھیں۔ نعتیہ پیغمبروں کے متعلق اور اماموں کی تعریف میں یہ مثنویاں لکھی جاتی تھیں، مگر جیسے جیسے زمانہ ترقی کی طرف رجوع ہوتا گیا اور علم و فنون کا زور بڑھتا گیا معیار شاعری بھی کروٹ بدلتا رہا۔ اور حسن و عشق کے لیے قرار پا گئی۔ اور زیادہ تر مثنویاں۔ عشق و حسن کی داستانوں سے پُر ہیں۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا عالمگیر کے زمانے سے ہوتی ہے اور حاتم شاہ آبرو نے پہلی مثنوی لکھی مگر ایسی کہ جس کو مثنوی کہنا بھی بڑی ہمت کا کام ہے۔ اس کے بعد مثنوی برابر ترقی کرتی گئی۔ مگر اس سے پہلے کہ آگے کچھ اور کہا جائے یہ بات بہت ضروری ہے کہ معلوم ہو جائے کہ مثنوی ہے کیا اور کیوں ضروری صنف سخن قرار پائی ہے۔

مثنوی ایک مسلسل نظم ہے۔ جس کو دو جز والی چیز بھی کہتے ہیں اس میں مصرعہ باہم متفق ہوتے ہیں ہر مصرعہ میں قافیہ ہوتا ہے۔ اور ایسے شعر ہوتے ہیں جو باہم کڑی در کڑی کی طرح ملے ہوں۔ ربط کلام خاص چیز ہے۔ اور اس کے بغیر مثنوی اچھی نہیں کہی جا سکتی۔ اس کے اشعار اس طرح کے ہوں کہ ایک دوسرے پر چسپاں ہوتے چلے جائیں۔ دراصل یہ وہ صنف ہے جس میں کسی قصہ خواہ وہ اخلاقی ہو۔ خواہ فرضی۔ خواہ معاشرتی اور خواہ تمدنی کا بیان ہوتا ہے اور قصہ بیان کرنے کے لیے تسلسل کی سخت ضرورت ہوتی ہے غزل و قصیدہ کی طرح مختلف مضمون پر قیاس آرائی بالکل نہیں ہوتی۔ ایک مضمون ہوتا ہے ایک بیان۔ اس صنف میں سب سے زیادہ وسعت ہوتی ہے۔ اس کے اشعار کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔ غزل و قصیدہ۔ مرثیہ۔ مسدس ترجیع بند اور ترکیب بند سب سے زیادہ اس کا میدان وسیع ہوتا ہے اور ایک بحر میں مضمون ادا ہوتا ہے۔ مثنوی کے لیے سات بحریں چھانٹ لی گئی ہیں اور زیادہ تر ان ہی بحروں میں مثنویاں لکھی گئی ہیں اور بہت مقبول ہوئی ہیں دراصل یہ صنف اردو ادب میں ڈرامہ کی کمی کو پورا کرتی ہے گو یہ ضرور ہے کہ ڈرامہ اس سے کہیں اونچی چیز ہے اس میں نہ اتنا بلند پلاٹ ہوتا ہے اور نہ عمل۔ جس طرح کا ایک ڈرامہ میں ہونا چاہیے مگر اسلامی ادب میں ڈرامہ کا فقدان ہے اور ایسے میں مثنوی اس کمی کا کافی حد تک ازالہ کرتی ہے مثنوی دراصل منظوم ڈرامہ ہوتا ہے مگر وہ اعلٰے مذاق جو ڈرامے میں پائی جاتی ہے اس میں مفقود ہوتی ہے مگر اس امر سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ڈرامہ کی فقدانی کا بہت حد تک علاج کیا ہے۔ مثنوی بھی چار طرح کی ہوتی ہے۔ رزمیہ۔ بزمیہ۔ حکیمانہ۔ صوفیانہ۔ دراصل یہ تقسیم اہل ایران کی ہے۔ ایران میں رزمیہ۔ بزمیہ مثنویاں بہت پائی جاتی ہیں جس میں شاہنامہ، خسرو نامہ وغیرہ آجاتا ہے

اور سعدی کی بوستان حکیمانہ مثنوی کے لیے بہت کافی ہے اور صوفیانہ مثنوی میں مولانا روم کا کلام ہے۔ اردو شاعری میں بھی یہی تقسیم ہے۔ مگر جہاں تک بزمیہ مثنوی کا ذکر ہے وہ تو بہت پائی جاتی ہیں۔ مگر رزمیہ مثنوی برائے نام نہ ملیں گی۔ یوں تو انیس و دبیر کے کارنامے رزمیہ ہیں مگر ان میں اضافی جذبات کا زیادہ گہرا اثر ہے اس لیے اس کو مثنوی ہرگز نہیں کہا جا سکتا اور اسی طرح حکیمانہ و صوفیانہ مثنویاں بالکل مختلف ہیں۔ اس لیے ہمارے شعرا نے اخلاق و تصوف کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا حسن و عشق شاعری کا عام میدان تھا۔ اس لیے جو کچھ کہا وہ حسن و عشق میں محدود ہو گیا اور بہت خوب کہا بہر حال مثنوی اردو زیادہ تر بزمیہ ہیں اور اس میں اتنا عروج و کمال حاصل ہوا کہ وہ فارسی کے ٹکر کی ہو گئیں۔

مثنوی میں پانچ چیزیں بہت ضروری جز ہیں مثنوی چونکہ قصہ گوئی کا اہم پارٹ ادا کرتی ہے اس لیے اس کے لیے ضروری ہے کہ فطرت نگاری اور واقعیت نگاری کی پوری طرح حامل ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے حسن ترتیب کریکٹر کی یکسانیت واقعہ نگاری اور نصیحت آمیز خاتمہ یہ پانچ چیزیں مثنوی کے لیے بہت اہم ہیں۔ یہ ایک مسلسل اور لمبی نظم ہوتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ نفس مضمون کو چھوڑ کر دور جا پڑتے ہیں اور اپنی وسعت کی وجہ سے آخیر تک آتے آتے لوگوں کے دماغوں سے نکل جاتا ہے کہ آیا قصہ کیا تھا لہٰذا ضروری ہے کہ جن اخلاقیات کا شروع میں ذکر ہو ان کو آخیر میں پھر سے دہرا دیا جائے اور خاتمہ نصیحت آمیز ہو۔ تاکہ لوگ نہ صرف حسن و عشق کی داستان سے محظوظ ہوں بلکہ کچھ اخلاقیات بھی حاصل کریں۔ حالانکہ شعرا اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں اور بجائے اخلاقی ہونے کے یہ چیز لوگوں کے لیے مخرب اخلاق بن جاتی ہے۔ اس کے شروع میں اکثر حمد اور نعت کے چند اشعار کہے جاتے ہیں اور اس کے



شبلی نعمانی

بعد قصہ شروع ہوتا ہے۔ مثنوی لکھنے والوں کے لیے یہ ضروری امر ہے کہ وہ لوگوں کے اپنے زمانہ کی معاشرت کے صحیح ترجمان ہوں یا پھر جس زمانہ کا قصہ لکھا جائے اس کا صحیح اور سچا نقشہ کھینچا جائے۔ مثنوی میں شاعر کو مصور بننا پڑتا ہے۔ اور ایک کامیاب مثنوی اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک اس کی صحیح ہو بہو تصویر پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے نہ آ جائے مثنوی کا کمال اسی میں ہے کہ وہ انسانی فطرت ہی کا نہیں بلکہ اس ماحول کا ان جزئیات کی صحیح عکاسی کرے جس کے متعلق لکھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ سادگی۔ تاثیر زبان کی صفائی۔ طرز ادا کی ندرت۔ روزمرہ کی عام بول چال ترکیب الفاظ بہت ضروری ہیں اردو شاعری میں

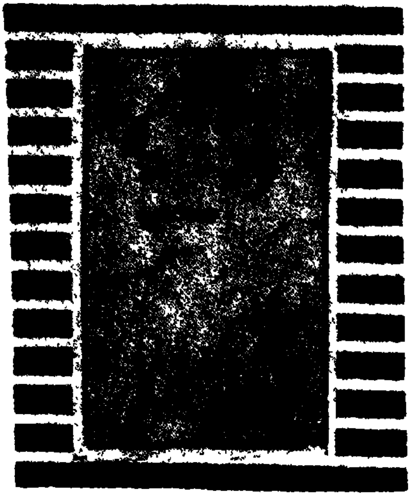
مثنوی نگاروں میں میر تقی میر، خواجہ اثر، میر حسن، نسیم، قلق، داغ کی مثنویاں مشہور ہیں۔

میر تقی میر سب سے پہلے مثنوی نگار کہے جاتے ہیں گو ان سے پہلے مثنویاں لکھی گئیں مگر کوئی اس قابل نہ تھیں کہ جو ان کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتیں۔ انہوں نے بہت سی مثنویاں لکھیں جن میں دریائے عشق مشہور ہے۔ دراصل میر عزلت پسند شاعر تھے۔ ان کی خوددار طبیعت اور زمانے نے ان کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ سودا کی طرح درباری یا شاعر یا خوش مذاق شاعر بن جاتے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں داخلی کیفیات کا جس قدر خوبی سے بیان ہے خارجی کیفیات اسی قدر عنقا ہیں۔ ان کی اپنی زندگی حزن و یاس کا مرقع تھی۔ عاشق مزاج تھے اور رنج و رنج اس لیے ان کو اپنی بدنصیبی سے کب فرصت تھی کہ وہ دنیا سے دوچار ہوتے۔ اور اس لیے وہ غزل گوئی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور غزل میں کوئی ان کا ہم پلہ نہیں۔ داخلی کیفیات صرف غزل کے لیے موزوں ہے اور درد و اثر جس قدر میر صاحب کے یہاں مل سکتا ہے وہ کسی کے یہاں نہیں۔ اصلیت میں کسی وجہ سے اثر پیدا ہوتا ہے اور میر صاحب کو یہ حاصل تھا۔ لہٰذا وہ غزل میں ضرور ایک بے مثال شاعر ہیں مگر مثنوی کا جہاں تک تعلق ہے اس میں وہ بات نہیں حاصل ہے۔ گو انہوں نے مثنویات بہت سی لکھیں۔ اور بہت مقبول بھی ہوئیں مگر مکمل نہ تھیں۔ خارجی پہلو ان کے بس سے باہر تھا اور مثنوی کے لیے داخلی و خارجی کیفیات دونوں کی ضرورت ہوتی ہے بہرحال میر کی مثنویاں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے بھی تو گھر کی حالت کتے۔ بلی وغیرہ کا لکھا ہے۔ اسی لیے وہ بہتر رہیں۔

اس کے بعد مصحفی نے میر کی "دریائے عشق" کو بحر الفت کے دوسرے قالب میں ڈھالا۔ قدما کے دور میں صرف میر حسن ایسے تھے جنہوں نے دیگر اساتذہ کی کمی کو پورا کیا ہے۔ میر حسن دہلی میں پیدا ہوئے اور ایسے ہیجان انگریز زمانہ میں کہ جب ہندوستان کی حالت گر رہی تھی سودا، مصحفی، درد، میر تقی میر وغیرہ شعرا سلف نہ تھے بلکہ ان کے لیے بولتی چالتی تصویریں تھیں۔ انکو شروع ہی سے شعر و سخن سے لگاؤ تھا۔ اور بڑھ کر یہ لگاؤ بہت ادب میں اپنے نام کا ڈنکا بجایا۔ ان کی مثنوی "سحر البیان" وہ مکمل مثنوی ہے جس کی مد مقابل کوئی مثنوی اس سے پہلے نہ تھی نہ آج ہے۔ اس میں قصہ بدر منیر اور بے نظیر کا ہے اور اس قدر خوبی سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے آج بھی عش عش کرتے ہیں۔ اس کو لکھے ہوئے تیرہ سو برس گزرنے کو آئے مگر آج بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آجکل ہی لکھی گئی ہے یہ ان کی زبان کی خوبی ہے اس مثنوی میں میر حسن نے تمام ڈرامہ کے لوازمات کو پورا کیا ہے اور مثنوی کی تمام خوبیاں بیان کی ہیں یہ ایک عشقیہ افسانہ ہے جس میں جزئیات نہایت خوبی سے بیان کیے گئے ہیں۔ میر حسن بہت خوش مذاق اور فصیح البیان شاعر تھے۔ انہوں نے کبھی ہزل گوئی نہ کی میر حسن کا کمال یہ ہے اور جو ہر جگہ نمایاں ہے انہوں نے سینکڑوں مختلف چیزوں کا نقشہ کھینچا ہے اور مختلف مناظر کا سماں کھینچا ہے لیکن کسی موقعہ پر فطری انداز سے نہیں ہٹے بلکہ ہر جگہ فطرت کی تصویر کھینچ کر رکھدی گویا میر حسن کو شاعرانہ مصوری میں کمال حاصل تھا۔ میر حسن کی اصلی خصوصیت فطرت نگاری اور واقعہ نگاری ہے اور بقول مولانا حالی میر حسن نے قصہ نگاری کے تمام فرائض پورے پورے ادا کر دیئے ہیں سلطنت کی شان و شوکت۔ تخت گاہ کی چہل پہل لاولدی کی ۔ ناامیدی دنیا سے بیزاری۔ شہزادہ کی پیدائش کا بیان جوتشیوں کا بیان چھٹی کی تقریب۔ ناچ رنگ باغوں کا اور محفلوں کا سماں، حمام میں نہانے کی کیفیت آرائش شاہانہ لباس جواہرات۔ زیورات غرض جو کچھ مثنوی میں

ا کیا اس کی ہو۔ ہو تصویر کھینچ رہی ہے اور آخری
اسلامی حکومت میں جو حالت سلاطین امراء کے
ماہر موقعہ پر گزرتی تھی ہو۔ جو معاملات پیش آتے
ان کا صحیح چربہ اتارا ہے۔ اس سے خارجی و داخلی
یات نہایت خوبی سے نظر کی ہے۔ جذبات حیات
فرت۔ نہایت موثر طریقہ پر کیا گیا ہے۔ فطرتی مناظر
سو۔ اس طرح کھینچی کہ تصویر انہوں کے سامنے پھر جاتی ہے
صل سے زیادہ موثر ہیں۔ اس زمانے کے رسم و رواج
س دور کی اخلاقی، تمدنی حالت کا اندازہ اس مثنوی
ذریعہ اس صحت اور خوبی کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس
انہ کی کسی بہتر سے بہتر تاریخ سے بھی نہیں ہو سکتا
یل کی فطری روش کے اعتبار سے بھی سحر البیان کا درجہ
ہت بلند ہے۔

نہوں نے عورتوں کا بیان ان کی زبان میں جس
بی سے لکھا ہے وہ ان کا ہی کمال ہے بہرحال میر حسن
زبان، طرز بیان، ماحول کی صحیح ترجمانی فطرت کی
ستیاں، تسلسل کلام، ربط کلام، بندش کا سلجھاؤ
طالب و معانی کے لحاظ سے، غرض ہر طرح سے یہ
مثنوی بہترین ہے۔ اور اس کے بعد جتنی مثنوی لکھی گئیں
ن کے ہم پلہ نہ ہو سکیں خود میر حسن کی دو مثنویاں "رموز
لعارفین" اور "گلزار ارم" اس پایہ کی مثنویاں نہیں ہیں
س کے بعد جرأت نے دو مثنویاں لکھی ہیں جو قابل
ذکر نہیں۔ اس کے بعد قابل ذکر مثنوی ہے لکھنوی
اسکول کے نسیم کی گلزار نسیم۔ اس کے لیے یہ کہا جاتا ہے
کہ "سحر البیان" کے مقابلہ کے لیے لکھی گئی۔ یہ خیال بالکل
غلط ہے کیونکہ ان دونوں میں سوائے اس کے دونوں
مثنویاں ہیں اور کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہے دونوں
کی راہیں الگ ہیں۔ طرز الگ طرز بیان جدا قصہ جدا اور
سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک لکھنو اسکول کا شاہکار
ہے تو دوسرا دہلی اسکول کا بہرحال اس میں شک نہیں کہ



میر حسن

میر حسن کے بعد نسیم کی مثنوی ہی مکمل مثنوی کہی جاسکتی
ہے گلزار نسیم اور سحر البیان کا مقابلہ نہیں مگر یہ ضرور ہے
کہ دونوں بہترین مثنویاں ہیں اور تمام مثنویوں میں
افضل۔ میر حسن کا بیان بے حد سادہ اور روزمرہ میں
ہے۔ تشبیہات کا استعمال بہت کم برعکس اس کے نسیم
کے بیان اور تکلفات کے دریا بہے ہیں۔ اور ان کی مثنوی
برجستگی، بلندی الفاظ، نزاکت خیال اور تشبیہات
کے طومار سے بھرپور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مثنوی
گلزار نسیم ایک مکمل مثنوی ہے جس میں منظر نگاری
واقعہ نگاری بڑی حد تک ہیں اور انسانی جذبات کی صحیح
تصویر کھینچی ہے مگر تصنع، تکلف اور عبارت آرائی سے
بہت کام لیا گیا۔ اور اس میں نسیم صاحب کی غلطی نہیں
بلکہ ان کے ماحول اور معاشرت کی غلطی ہے یہ وہ زمانہ
تھا جب تصنع اور تکلفات لکھنؤ کا پیشہ ہو گئے تھے
اور حسین سے زیادہ لوازم جن کی تعریف ہوتی تھی خوشحالی

کار فرما تھی ایسے میں انسان سوز و گداز کہاں سے لائے بادشاہ غنی تھے روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ظاہر ہے کہ ایسے وقت آورد سے کام لے کر تاثر پیدا کیا جاتا ہو گا اور یہی آورد و تصنع ادب میں شامل ہو گیا ایسے میں شعر تو شعر نثر بھی مقفیٰ مسجع ہوتی ہے۔ لہٰذا حضرت نسیم کب اس سے بری ہو سکتے تھے۔ اور ان کے کلام میں یہ چیز بخوبی پائی جاتی ہے۔ ان کی مثنوی کی زبان اپنے وقت کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ بہرحال یہ کمال ضرور تھا کہ مثنوی جیسی صبر گزار چیز میں جس میں قصہ بیان کیا جاتا تھا اس میں صنائع بدائع اور تشبیہات کا استعمال اس قدر صحیح طریقہ سے کیا گیا کہ کانوں پر گراں نہیں گزرتا۔ میر حسن کی مثنوی من گھڑت قصہ ہے اور شاعری کی اپنی پیداوار اور گلزار نسیم کا قصہ ایک وہ قصہ ہے جو پہلے سے موجود تھا اس کو نسیم صاحب نے اپنی زبان میں ڈھالا اور اس خوبی سے کہ وہ نصاب تعلیم میں اور ادب میں ایک خاص اہم چیز بن کر رہ گیا۔

انہوں نے صحیح جزئیات کی صحیح تصویریں کھینچی ہیں۔ مناظر نگاری میں انہوں نے بھی کمال کر دکھایا ہے بلندی الفاظ کے ساتھ مؤثر اور مقبول عام ہے اس کے علاوہ یہ سحر البیان کے برعکس ایجاز اور اختصار کے لیے بہت مشہور ہے۔ سحر البیان کا اطناب اور گلزار نسیم کا ایجاز و اختصار اپنی اپنی جگہ بہت خوب ہے۔ دونوں اپنی جگہ پر عیب بھی ہیں اور فن بھی۔

گلزار نسیم کا جو رنگ ہے وہ اپنی سوسائٹی کا آئینہ دار ہے اس زمانے میں اسی تکلفات کا زور تھا اور اپنی سوسائٹی کا رنگ مد نظر رکھ کر مثنوی لکھنا کمال ہے اور نسیم صاحب نے اس کو بخوبی پورا کیا ہے انہوں نے رنج خوشی۔ مسرت۔ غصہ محبت جس چیز کی تصویر کھینچی ہے بالکل صحیح ہے مگر طرز بیان کچھ ایسا ہے کہ عوام اس میں الجھ جاتے ہیں مگر گہری نظر ڈالنے والے ان کی خوبیوں کو ستائش کی نظروں سے دیکھیں گے بہرحال انہوں نے جو سمجھانا چاہا وہ اپنی جگہ پر بہت خوبی سے بتایا ہے۔ ایک جنگل کا سین اس طرح بیان کیا ہے جہاں اکیلا پن بہت ہے۔

اک جنگل میں جا پڑا جہاں گرد
صحرائے عدم کی تھا جہاں گرد

جنس لطیف کی شیریں حرکات:۔

منہ پھیر کے ایک مسکرائی
آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی

تجاہل عارفانہ :۔

پوچھا ارے کچھ تجھے خبر ہے۔ گلچیں میرا کونسا بشر ہے

جوشِ غضب کی تصویر عورتوں کی زبان سے:۔

یہ سن ہوا شعلہ وہ بھبھوکا بولی کہ تجھے لگا دوں لوکا

بہرحال گلزار نسیم باوجود لفظی رعایتوں کے واقعہ نگاری۔ منظر کشی جذبات نگاری کا ایک دلکش مرقع ہے اور لکھنؤ اپنے اس شاہکار پر ہمیشہ ناز کریگا۔ گلزار نسیم اور سحر البیان دونوں کامیاب مثنویاں ہیں دونوں مختلف ہیں یہ کہنا غلط ہے کہ مقابلہ کے لیے لکھی گئی شروع سے اخیر تک کوئی انداز ایک دوسرے سے مماثلت نہیں کرتا۔ ورنہ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ نسیم صاحب نے جس طرح اپنی قوت نظم سے ایک اتنا بڑا شاہکار تیار کیا میر حسن کا رنگ کہیں سے اڑا لیتے۔

ان دو مثنویوں کے برابر تو کوئی مثنوی نہیں مگر اس کے بعد شوق کی زہر عشق بہت مشہور رہوئی جس میں سوز گداز کے ساتھ خارجی کیفیات بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ داغ۔ حالی وغیرہ نے مثنویاں لکھیں مگر کامیاب نہیں ہیں۔ اور سب سے اخیر میں حضرتِ صفی صاحب کی مثنوی 'تنظیم الحیات' کا بیان ضروری ہے جو حال ہی میں لکھی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مثنوی بہت اچھی ہے مگر یہ کہنا غلط نہیں کہ حضرتِ صفی صاحب ایک عمدہ

شاعر ہیں مگر ایک اچھے مثنوی نگار نہیں۔

مثنوی میں چونکہ دراصل قصہ کا بیان ہوتا ہے اور کافی فوق الفطرت فوق العادت باتوں کا ذکر، اس لیے وہ آج کل زیادہ پسند نہیں کی جا سکتیں کیونکہ زمانہ جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے مبالغہ آمیزی کا دیو پری کے قصوں سے گریز کرتا جاتا ہے اور ان کی ہنسی اڑاتا ہے مگر یہ امر مسلم ہے کہ ہر سوسائٹی میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جبکہ اس کی فطرت ان ہی توہمات جنات پری کے قصوں پر سختی سے اعتقاد رکھتی ہے یہاں ہی نہیں دیگر ممالک میں بھی ہیں۔ شکسپیر بڑا بھاری انگریزی شاعر ہے بلکہ مثنوی نگار، اس کی تصانیف مڈسمر نائٹ ڈریم میکبتھ ہملٹ میں ان ہی فوق الفطرت باتوں کا ذکر ہے لہٰذا ہم اس میں مثنوی کو خطاوار نہیں بنا سکتے یہ زمانہ کا تقاضا تھا۔ اور شاعر اپنے ماحول کے اثر سے بچ نہیں سکتا ماحول کا اثر ہر شاعر، ہر ادیب اور ہر انسان پر پڑتا ہے اور شاعری دراصل ماحول کا آئینہ دار ہوتی ہے اور مثنوی کا نفس مضمون ایسے حصوں کے لیے مقرر ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ کہیں پر مبالغہ آمیزی سے درجہ اعتدال سے نکل کر گراں سی لگنے لگتی ہے مگر شعر وہ شعر ہی نہیں جس میں مبالغہ کی چاشنی نہ ہو۔ اور ہر ایک مثنوی نہیں لکھ سکتا۔ جس طرح ہانڈی لگانے والا دیگ اچھی نہیں لگا سکتا اسی طرح غزل گو عمدہ مثنوی نہیں لکھ سکتا۔

اس لیے میر تقی میر کے مقابلہ میں میر حسن، نسیم قلق شوق وغیرہ زیادہ مشہور مثنوی نگار ہوئے۔

مثنوی ایک زمانہ میں ڈرامہ کی کمی کو پورا کرتی تھی۔ اور آج بھی اس کمی کو پورا کرتی۔ اگر ڈرامہ نگار نہ پیدا ہو گئے ہوتے بہرحال یہ ایک بڑا فن ہے جو ہر ایک کے دسترس سے باہر، اور اس کا کمال یہی ہے کہ شاعر اچھی طرح مشاہدہ انسانی اور ہر ایک جزئیات سے واقف ہو۔ اپنے ماحول



انگریزی مصنف شکسپیر

و رسم و رواج کی اچھی تصویر کھینچ سکتا ہو۔ شاعر کو محاکات سے کام لینا پڑتا ہے جب وہ ایک مصور ہو جاتا ہے۔ اسی وقت وہ اچھی مثنوی لکھ سکتا ہے۔

گو اب مثنوی کا رواج اتنا نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ یہ کارآمد صنف ہے اور ہر ادب میں پائی جاتی ہے اردو میں اگر میر حسن کو اس کا بادشاہ کہا جاتا ہے تو فارسی میں فردوسی سنسکرت میں والمیکی، مہا بھارت بھی ایک مثنوی ہے۔ انگریزی میں شکسپیر اور نہ جانے کتنے شاعر۔ اس صنف کی سب سے زیادہ خوبی یہ ہے کہ اس کا خاتمہ تعجب آمیز ہو اور سلجھا ہوا تاکہ عوام محض ایک قصہ سمجھ کر نہ پڑھیں بلکہ سبق حاصل کریں اردو میں مثنوی کی کمی نہیں۔ سحر البیان، گلزار نسیم کی سی بڑی بڑی مثنویوں سے لے کر کتا نامہ، بلی نامہ، سفر نامہ برسات کی، ہجو وغیرہ تک مثنوی پر لکھی جا چکی ہیں اور اس کی اہمیت سے کوئی منکر نہیں ہے۔ ••



اردو زبان کی کہاوتیں

ل۔م۔ اکبرآبادی

کہاوت یا مثل اصل میں زندگی کے کسی پہلو سے متعلق بے شمار انسانوں کے صدیوں کے تجربے کا نچوڑ یا دوسرے لفظوں میں انسانی عقل اور تجربے کا جوہر ہے۔ لغت کی کتابوں میں مثل یا کہاوت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

"کم سے کم لفظوں اور دل میں بیٹھ... جانے والے انداز میں کہی ہوئی معنی خیز، پرمغز اور سبق آموز بات جو مسلسل طور پر عام زبانوں پر جاری ہو۔ یا ایک چھوٹا سا فقرہ یا جملہ عام طور پر مشاہدے یا تجربے میں آئی ہوئی بات کی ایسی حقیقت، صداقت کو استعارے میں بتاتا ہو۔ جو عام لوگوں کے علم میں ہو۔ مختصراً ایک حکیمانہ قول کو مثل یا کہاوت کہا جائے گا۔"

عربی سے ضرب المثل نے شعر کو تلوار کی کاٹ سے زیادہ اثردار کہا ہے۔

"درمقالے کہ گنده سے سنایہ بہ عدد
صد بہ شمشیر ندارد شریعہ ضرب المثل"

بعض نے کہاوت کو عوام کا "فلسفہ" بھی کہا ہے۔ مگر یہ تعریف نہ تو جامع ہے اور نہ پوری طرح صحیح۔ کہاوت کے تھوڑے سے شبدوں میں جو بدصاف سوئی ہوتی ہے مثل کے مختصر لفظوں میں جو حکمت بند ہوتی ہے عام طور پر وہ انسانی زندگی کی کسی نہ کسی حقیقت کا بیان ہوتی ہے عام اور خاص، تمام لوگوں کی زندگی کی صداقت کا بیان انسانی نسلیں جب ایک بات کا ایک ہی نتیجہ نکلتا دیکھتی رہتی ہیں۔ تو کسی وقت کسی ایک آدمی کے منہ سے چند ایسے ڈھلے ڈھلائے لفظ نکل جاتے

ہیں جو پورے سماج میں مقبول ہو کر زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔

کہاوت کی صورت یا تو تجربہ و عقل کی بنا پر ایک بیان واقعہ کی شکل میں ہو گی۔ یا پھر اس میں کسی ایسی بات کی طرف استعارہ ہوگا۔ جو کہاوت کے لفظوں میں تو ظاہر ہوتا ہو مگر اس کا مجازی مفہوم سمجھ میں فوراً آجائے۔

یا پھر اس کے اندر آدمی کے چال چلن اور طور طریق پر طنز یا کوئی مفید مشورہ ہوگا۔

لغت کی کتابوں میں کہاوت کی تعریف و تصریح کے باوجود یہ ذرا دشوار بات ہے۔ کہ کس جملے یا فقرے کو کہاوت مانا جائے اور کس کو نہیں۔ اس لئے کہ ہماری زبان میں... ایسے جملے بہت ہیں جو ضرب المثل کا کام دیتے ہیں۔ لیکن لغت کی کتابیں ان کو مثل کی تعریف میں نہیں رکھتیں۔ بلکہ انھیں کنایہ کہتی ہیں۔ کنایہ محاورے سے بھی الگ مانا جاتا ہے۔ مگر شاید ایسی حد بندی کر دینا کچھ مفید بھی نہ ہو۔

کسی ضرب المثل کا وجود میں آنا کسی کہاوت کا بن جانا دو ذریعوں سے ہوتا ہے۔ ایک عوام کے ذریعے سے اور دوسرے پڑھے لکھے طبقے کے ذریعے سے عوام جن کہاوتوں کو بناتے ہیں۔ وہ سوچ بچار کا نتیجہ نہیں ہوتیں۔ بلکہ اضطراری طور پر وجود میں آتی ہیں۔ اور ان میں وہ تمام عقل کی بات بیان ہوتی ہے۔ جس کا انسان کو بار بار تجربہ ہو چکا ہے عوام کے پاس غور و فکر کے لئے نہ تو وقت ہوتا ہے اور نہ انھیں عقل و خرد کی روشنی ملتی ہے کہ وہ زندگی کی گتھیوں اور انسانی بتیاؤں کی حقیقت پر غور کر کے نتیجے نکال سکیں۔ عوام کی بنائی ہوئی کہاوتیں عام زبانوں پر چڑھ کر نسلوں میں منتقل ہوتی اور اہل قلم کی کتابوں میں جگہ پا کر مستند بنتی ہیں۔ اور علماء و حکماء کے ذریعے سے جو مثلیں وجود میں آتی ہیں وہ زندگی کے مسئلوں پر فکر و تامل کا نتیجہ ہوتی اور پہلے ان کی تحریر... تصانیف میں جگہ پاتی۔ پھر عوام میں مقبول ہو کر زبان زد ہو جاتی ہیں یعنی پہلی صورت میں زبان زد عام ہو کر کتابوں میں جگہ پاتی ہیں۔ اور دوسری صورت میں کتابوں میں سے عوام تک پہنچتی ہیں۔ عوام و خواص میں کہاوتوں کا یہ لین دین بالکل مساویانہ شکل میں ہوتا ہے۔ عام بول چال میں آنے والی کہاوتوں کو پڑھے لکھے قبول کر لیتے ہیں۔ اور کتابوں میں لکھے ہوئے ذہانت آمیز اقوال عوام میں پہنچ کر وزمرہ بن جاتے ہیں جو بات دونوں قسم کی کہاوتوں میں مشترک ہے۔ اسے آہستہ آہستہ قبول عام حاصل ہوتا ہے۔

کہاوت کے لئے اس کا قومی چلن لازمی ہے۔ لیکن خاص پیشوں اور خاص حلقوں میں جو کہاوتیں بن جاتی ہیں وہ قومی کہاوتیں ہی کہی جائیں گی۔

دنیا کی کوئی زبان یا بولی ایسی نہیں جس میں کہاوتیں نہ ہوں۔ اور مختلف قوموں کی کہاوتیں اپنے موضوع اور بناوٹ کے اعتبار سے اتنی ہی مختلف ہو سکتی ہیں جتنا اختلاف قوموں کے اندر ہو لیکن اس قومی و وطنی اختلاف کے باوجود جو زندگی کی حقیقتیں انسان میں مشترک ہیں۔ ان کے متعلق مزید قوم کے اختلاف کے فرق کے علاوہ ہر زبان میں ملتی ہیں۔ بعض... صورتوں میں تو لفظوں کی ترکیب بھی ایک سی ہوتی ہے یعنی ان میں فرق کے ساتھ مماثلت اور مماثلت کے باوجود فرق ہوتا ہے۔

کہاوت جتنے کم لفظوں میں بیان ہو گی وہ اتنی ہی زیادہ مقبول اور اتنی ہی زیادہ پُر اثر ہو گی۔ مثلاً

"کاریگر سے کام پیارا ہے"، "اتفاق میں برکت ہے"، "ایک کی دو دو"، "غرض باؤلی ہوتی ہے"، "مان کا پان بہت ہے"، "گھر گھوڑا نخاس مول"، "آدمی کا شیطان آدمی ہے"، "صبر کی دوا خدا کے ہات"، "لام چور نوالے حاضر"، "زبان شیریں ملک گیری" وغیرہ۔

اور یہ کہا گیا ہے کہ کہاوت عوام اور پڑھے لکھے، دونوں طبقوں میں بنتی ہے۔ ذیل کی چند مثالیں جاتی ہیں کہ ان کے بنانے والے پڑھے لکھے لوگ تھے۔

"قرض محبت کی قینچی ہے"

"کھان کی دوستی جی کا جنجال"
"پانی پیجئے چھان کر، پیر کیجئے جان کر"
"حق اونٹ پہاڑ"
"ٹھنڈا لوہا گرم لوہے کو کاٹتا ہے"
"خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا ہے"
"مددگار اور دشمن بار بار نہیں ملتے"
"احسان لیجئے جہاں کا نہ لیجئے شاہجہاں کا"
"ونٹ پہاڑ تلے آکر اپنے آپ کو پہچانتا ہے"
"ایک انار سو بیمار"
"ایک تھا دیوانہ اوپر سے آئی بہار"
"حمام میں سبھی ننگے"
"ایک شیر مارے اور سو گیدڑ کھائیں"
"بلاری کی گالی کس کی جو لڑکے دیکھے اس کی"

پڑھے لکھے طبقے میں بننے والی کہاوتوں میں کویوں کے دوہے اور چھند اور شاعروں کے شعر بھی مقبول ہو کر کہاوت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں جیسے:-

"اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"
"ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے"
"ہم کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"
"اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی"
"ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے"

ذیل کی چند کہاوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بنانے والے پڑھے لکھے لوگ نہیں۔ بلکہ عوام کا طبقہ ہے۔

"جتنے کی بڑھیا نہیں اتنا سر منڈائی"
"ملا بیچارا کیا کرے، اس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں"
"اندھیر نگری چوپٹ راجہ ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا"
"اوچھے کی پیت بالو کی بھیت"
"بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا"
"بنئے کی گون میں نو من کا دھوکا"

شاعر لکھنوی

درسِ صحت

چشمِ حیرت کے روبرو ہے جناب — ایک پیکر شگفتہ و شاداب
کیا توازن ہے قد و قامت کا — درس دیتا ہے ذوقِ صحت کا
چہرا گل رنگ ہے نظر بیدار — تندرستی کا اک حسیں شہکار
چاندنی کی طرح ہے پاک اور صاف — آئینے کی طرح بدن شفاف
رگ و پے سے عیاں نمو کا اثر — تازگی کا نکھار چہرے پر
صحت و عافیت سے بہرہ مند — زندگانی پہ ڈالتا ہے کمند
آپ اپنی جگہ ہے قابلِ داد — بازوؤں میں بھرا ہوا فولاد
لوگ صحت سے ہوں اگر محظوظ — جسم بیماریوں سے ہو محفوظ
اچھی صحت کی ہے اگر خواہش — صبح کو اٹھ کے کیجیے ورزش

زندگی اک عمل ہے چستی کا
لیجیے درس تن درستی کا

"بھاری پتھر چوما اور چھوڑ دیا"
"بھس کے مول ملیدہ"
"بھس میں چنگی ڈال جمالو الگ کھڑی"
"بیاہ نہیں کیا۔ پر براتیں تو دیکھی ہیں"

ان کہاوتوں کی بعض مثالیں یہ ہیں جو بعض خاص حلقوں اور پیشوں میں ہیں۔ مگر ان کا چلن قومی ہو جاتا ہے۔

"ایک پڑا سوئے دوسرا ہے جو کبھی دیکھے"
شراب خانے والوں کی بنائی ہوئی ہے۔
"مارتے کے پیچھے بھاگتے کے آگے"
فوج ہی میں بن سکتی ہے۔

"بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان"
عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔
"اپنا من چنگا، کٹھوتی میں گنگا"
الفاظ کہہ رہے کہ جھگڑیوں میں بنی ہوں۔
"بھلی گزری کچھ گزراں، کیا جھونپڑی کیا میداں"
مست قلندروں کے حلقے کی بات ہے۔
"پانچے سو بہ کا ہوئے"
سیناسی صوفیوں کے سوا کون بنا سکتا ہے۔
"موہا جانے لوہار جانے، دھونکنے والے کی بلا جانے"
اپنی بناوٹ سے ظاہر ہے۔
"حساب جو جو بخشش سو سو"
دوکاندار ہی کہہ سکتا ہے۔
"جو بوئے سو کاٹے" دیہات ہی میں بن سکتی ہے۔
"ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے" ایضاً
ایسی کہاوتیں جن کے مفہوم اور مطلب کی مناسبت سے تشبیہیں پیدا کی گئی ہیں، یعنی جو مفہوم استعارے کا ہے وہی لفظوں سے بھی نکلتا ہے۔
"کیا پدی کیا پدی کا شوربہ"
"بھیڑ کی لات گھونٹو تک"
"ندی میں رہنا مگر مچھ سے بیر"
"اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی"
"ہانڈی کو ہانڈی کھا رہی، بیوی کو باندی کھا رہی"
انسانی زندگی کی عالمگیر حقیقتیں جن کے مفہوم کی... کہاوتیں تقریباً ہر زبان میں ملیں گی۔
"الٹی گنگا بھی کہیں بہی ہے"
"اندھا کیا چاہے دو آنکھیں"
"اوس چاٹے پیاس نہیں بجھتی"
"ایک میان میں دو تلواریں نہیں سماتی ہیں"
"مونہہ سے نکلی ہزار میں پڑی"
"بلی گرتی ہے تو پنجوں کے بل"

"ایک پنتھ دو کاج"
"تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی ہے"
"سیر کی ہانڈی سوا سیر میٹھا اور اُبلی"
"سیر کو سوا سیر ہر جگہ موجود ہے"
"قاضی کے مرنے سے شہر سونا نہیں ہو جاتا"
"قاضی نیائے نہیں کرے گا تو آنے دے گا"
"گود کا کھلایا گود میں نہیں رہتا"
"گونگے کا گڑ کھٹا نہ میٹھا"
"لاٹھی مارے پانی نہیں پھٹتا"
"نکلے دانت پھر اندر نہیں جاتے"
"آدمی اناج کا کیڑا ہے"
"آدمی جانے بسے سونا جانے کسے"
"کاٹے بائڑ نام تلوار کا، لڑے فوج نام سردار کا"
"بوندیاں بوندیاں تالاب بھر جاتا ہے"
ہر قوم اور ملک میں کچھ کہاوتیں ایسی ہوتی ہیں جو قوم و ملک ہی کے لئے مخصوص ہوتی ہیں اور ان کے ہم معنیٰ کسی دوسری زبان میں نہیں مل سکتیں۔
"ابھی دلّی دور ہے"
"بھوکا بنگالی بھات ہی بھات پکارے"
"ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور"
"الٹے بانس بریلی کو"
"پٹھان کا پوت، گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت"
"دونوں دین سے گئے پانڈے، حلوا ملا نہ مانڈے"
"تیلی کے بیل کو گھر ہی پچاس کوس"
"جس نے بیٹی دی اس نے کیا اٹھا رکھا"
"جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا"
"بھولے باہمن گائے کھائی اب کھائے تو رام دہائی"
"بھینس کے آگے بین بجائے بھینس کھڑی پگرائے"
"بیوی وار سے باندی کھائے گھر کی بلا گھر میں جائے"
"شیخوں کی شیخی پٹھانوں کی ٹر"

"تالی کی برات میں سب ٹھاکر"
"نئے نماز بخشوانے روزے گلے پڑے"
"فقیر کی جھولی میں کیا نہیں ہے"

زبان میں بعض ایسی کہاوتیں بھی ہوتی ہیں جو دیکھنے میں بے جوڑ اور غیر منطقی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر غور کرنے سے ان کی صحت اور عقل مندی ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایسی کہاوتوں کے بنانے والے شاید یہ الجھا ہوا انداز بیان جان کر اختیار کرتے ہیں تاکہ سمجھنے کے لئے لوگ خاص توجہ سے کام لیں۔ اپنی زبان میں ان چند مثالوں کو دیکھئے۔

"لاج کی آنکھ جہاز سے بھاری"
یعنی مشکل ہی سے اٹھتی ہے

"نہ میں دوں نہ دے خدا"
یعنی ایسا کنجوس جو خدا کا دینا بھی گوارا نہ کرتا ہو۔

"کالا منہ کریل کے دانت"
ساری ہی باتیں غلط اور بے ڈھنگی۔

"باتوں ہاتھی پائے، باتوں ہاتھی پاؤں"
باتوں پر خوش ہو کر بادشاہ نے ہاتھی انعام دے دیا اور باتوں پر ہی خفا ہو کر ہاتھی کے پاؤں سے روندوا دیا۔

"مانگائے ڈوبیں پتھر تریں"
جھوٹا سچا ٹھہرے، اور سچا جھوٹا ہو جائے۔

"شوق میں ذوق، دستوری میں لڑکا"
ایک کام کرنے جائیں دوسرا فائدہ ہو جائے۔

"قاضی کے موسل میں ناڑا"
جس کو عقل مند سمجھ لیا ہو اس کی بات سمجھ میں نہ آئے تب بھی عقل کی بات ہے۔

ہندوستانی زبان کی کہاوتوں کے مطالعے میں دو باتیں خاص طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک مقدر پرستی اور بھگوان کی اچھا پر راضی ہو جانا، اور دوسرے عورتوں کا طنز و تنقید۔ بے شمار کہاوتیں، کنائے اور محاورے ایسے ہیں جو عورتوں ہی کی زبان پر ہیں۔ اور زیادہ تر دوسری عورتوں کے رنگ ڈھنگ کی تنقید کرنے والے ہیں۔ یہ خصوصیت شاید ہماری زبان کے سوائے کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں کہ مردوں اور عورتوں کی بولی اور محاورے جدا جدا ہیں۔



"بوڑھی گھوڑی لال لگام"
"صورت چڑیلوں کی، مزاج پریوں کا"
"گھر چھوٹا سمدھیانا بڑا"
"جورو کا نام بہو بیگم رکھ لینے سے جو کیا ہے"
"گھر نہ بار میاں محلہ دار"
"آپ میاں منگتا باہر کھڑے درویش"
"کاجل کی کجلوٹی اور پھولوں کا سنگھار"
"اپنا پوت پرایا ڈھینگڑا"
"کان پیارے تو بالیاں، جورو پیاری تو سالیاں"
"کپڑا نہ کتا، ہستی ملیں البتہ"
"سوکھے ٹکڑوں پر کوّے اڑانا"
"کھائیں تو گھی سے نہیں جائیں جی سے"
"دائی سے پیٹ نہیں چھپتا ہے"

"ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے"

"ری بلی چوہے ہوں کان کٹائے"

"دیکھتے چوٹ کتو مڑے جینٹ"

"ڈاڑھی میں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا"

"بی بی کو منہ پیر کو، پہلے فقن فقیر کو"

کہاوتیں نئی آتی اور پرانی چھٹتی بھی رہتی ہیں۔ ان کی مقبولیت اور استعمال گھٹتا بڑھتا بھی ہے۔ لیکن پرانی کہاوتوں کا ٹکسال باہر ہو جانا اور نئی کہاوتیں بننا خاص حالات کے تقاضے ہی سے ہوتا ہے۔ کسی سماج میں جب کوئی بڑی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس وقت پرانی کہاوتیں بھلا دی جاتیں اور نئی بننے لگتی ہیں اور یہ صرف کہاوتوں کا ہی نہیں۔ لوک بھگتوں کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی زمانہ ایسا بھی آتا ہے جب نئی کہاوتیں نہیں تھیں اور پرانی بھلا دی جاتی ہیں۔ ہماری زبان کی جو کہاوتیں اب زبانوں پر نہیں ہیں۔ ان کی چند مثالیں یہ ہے۔

"تلوار ریٹ پڑی، نیچہ کام کرے گا"

"شہد سہاگا گھی، سری دھات کا جی"

"شیر شاہ کی ڈاڑھی بڑی کہ سلیم شاہ کی"

"شیر کھائے نہ کھائے مونہہ لال"

"صدرہ پیڑہ کے بھی احمق رہے"

"قاضی جی اپنا اگاڑ دھانکو پھر نصیحت کرنا"

"کالا منہ نیلے ہاتھ پاؤں"

"کچھ گوشت چھپکے کچھ گمان"

"ککڑی کے چور کی گردن نہیں ماری جاتی"

"کمائیں میاں خانخاناں اڑائیں میاں فہیم"

"گاڑھی بھر آشنائی جو بھرنا تا"

"جڑ سے بیر پتوں سے یاری"

"خدا سر پر دو سینگ دے تو وہ بھی سہے جائیں گے"

"سوکھے ساون روکھے بھادوں"

"اندھا ملا ٹوٹی مسجد"

"ایک ڈوبے تو جگ سمجھائے، یہاں تو جگ ہی ڈوبا جائے"

"بلی لڑتی ہے تو منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے"

"بہرے کے آگے گانا گونگے کے آگے گل، اندھے کے آگے ناچنا سارے لل بل"

ہماری زبان میں لوگ گیتوں کی ریسرچ پر دھیان دیا دیا جانے لگا ہے۔ کہاوتوں کی طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی ہے۔ بہت سی کہاوتیں ہیں۔ جن کے پیچھے کہانیاں ہیں۔ مگر بھولی جا رہی ہیں۔ لغت کی کتابیں بھی ایسی تمام مکاتبوں کو محفوظ نہیں کر سکی ہیں۔ بعض مثالیں یہ ہیں۔

"کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے"

ایک مسافر کی کمر سے ہزار روپے بندھے تھے اور بوجھ محسوس ہو رہا تھا پیچھے سے ایک گھوڑ سوار آیا پیدل مسافر نے اس سے کہا۔ کہ ذرا ہمارے روپے اٹھائے چلو۔ سوار نے انکار کر دیا۔ اور بڑھ گیا۔ پیدل نے دل میں سوچا کہ سوار اگر اٹھا لیتا اور چل دیتا تو میں کیا کر لیتا۔ سوار نے سوچا کہ بڑی حماقت کی کہ ملتی ہوئی رقم کو ٹھکرا دیا۔ سوار اگلی منزل پر رک گیا۔ یہاں تک کہ پیدل مسافر بھی پہنچ گیا اور جب پھر چلنے کو ہوئے تو سوار نے کہا لاؤ تمہارا بوجھ اٹھا لیں۔ اس وقت پیدل مسافر نے کہا کہ وقت گیا........

"یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے"

ایک دعوت میں اندھے حافظ جی لڑکے کو ساتھ لے کر پہنچے۔ پوچھا کھانا کیا ہے لڑکے نے بتایا کھیر ہے۔ حافظ جی نے کھیر کبھی کھائی نہ ہو گی۔ پوچھا کھیر کیسی ہوتی ہے۔ لڑکے نے کہا سفید۔ حافظ جی کو سفید رنگ کا اندازہ نہ تھا۔ پوچھا سفید کیسی۔ لڑکے نے کہا بگلا سی۔ حافظ صاحب نے پوچھا بگلا کیسا ہوتا ہے لڑکے نے ہتھیلی پر کہنی ٹیک نیچے سے چونچ بنا کر کہا۔ کہ ایسا۔ حافظ صاحب نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا تو بولے....

"ہم بھی ہیں پانچوں سواروں میں"

دلی سے چار سوار دکن کو جا رہے تھے راستے میں ایک کمہار بھی گدھے پر سوار ان کے پیچھے ہو لیا۔ اس زمانے میں سواروں کی بڑی عزت اور آدر ہوتا تھا۔ سرائے میں ٹکے تو کمہار سے لوگوں

نے پوچھا کہ یہ کہاں کے سوار ہیں۔ کمہار بولا ہم پانچوں سوار دلی کو جا رہے ہیں........"

"تب آب کرتے مرگئے سرہانے دھرا پانی"

لالہ صاحب ایران گئے فارسی زبان پسند آئی سیکھ آئے اور بیمار پڑ گئے پیاس لگی تو "آب بیار" یعنی فارسی میں پانی مانگا کوئی سمجھا نہیں اور لالہ صاحب چل بسے۔ اس پر سے یہ کہاوت وجود میں آئی........

"آ پڑوسن لڑیں!"

ایک بولی۔ لڑو! دوسری نے کہا لڑے میری پیزار۔ پہلی بولی جڑی آئی تو پیزار ڈالی۔ بس پھر کیا تھا۔ لڑائی ہو پڑی۔

"مجھے باپ کی بیٹی ہے تو نیچا کر لے"

کوئی خان صاحب ایک کوٹھے پر چڑھ گئے۔ اتفاق کی بات ریلیں ہو گئے۔ عورت بولی واہ خان صاحب۔ خان صاحب بچے نہ بولے........

"ہاتھ سے دال ہے ملا تو بھی ہے۔"

کسی پر لالہ جی کے روپے آتے تھے۔ تقاضا سخت ہوا تو وہ آدمی ایک اُلو پکڑ کر لایا اور ہاتھ پر بٹھا کر ادھر سے گزرا۔ لالہ جی نے پھر تقاضا کیا۔ بولا یہ بک جائے تو ادا کر دوں گا۔ لالہ نے پوچھا کیا ہے۔ بتایا یہ شاہین ہے، بہت قیمتی جانور ہے۔ پھر ادھر سے گزرے اور لالہ جی نے ٹوکا تو کہا کہ اس کی اتنی رقم لگ چکی ہے مگر یہ کم ہے۔ زیادہ دام کو بیچوں گا۔ اس وقت تمہارا حساب کر دوں گا۔ پھر ایک دن تقاضا ہوا تو جھلا کر بولے کہ لالہ جی تم نے تو ناک میں دم کر دیا۔ ایسا ہی ہے تو تم خرید لو۔ لالہ جی نے سوچا کہ اس میں بھی کچھ کما لیں گے۔ اس سے وہ الو خرید لیا اور اپنی رقم کاٹ کر باقی ادا کر دی۔ جب گھر لے کر پہنچے تو بیوی نے بتایا کہ شاہین نہیں اُلو ہے۔ لالہ جی بہت جھینپے اور اسے... دوکان پر ٹانگ دیا۔ اب جو کوئی آتا اور پوچھتا تو لالہ جی بتاتے کہ........

"آٹھ جلاہے نو حقہ، سپتر تھکم تھکا!"

جولاہوں کی برات میں آٹھ آدمی جمع تھے۔ اور حقہ پینے پلانے پر تکرار ہونے لگی گننے لگے تو اس جگہ آدمیوں کی تعداد سے ایک حقہ زیادہ تھا۔ مگر بحث ہوتی رہی ختم نہ ہوئی......

"بلی کی میاؤں کو کون پکڑے گا؟"

بلی کے ظلم و زیادتی سے تنگ آ کر چوہوں نے پنچایت جوڑی۔ ہر ایک نے اپنی بہادری اور مردانگی دکھانے کو ایک ایک کام اپنے ذمے لیا کہ بلی اور اس کے مظالم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ ایک بوڑھا چوہا چپ بیٹھا سب کی سن رہا تھا۔ کسی نے کہا ارے میاں تم بھی تو کچھ کہو۔ وہ بولا احمقوں کی مجلس میں کیا بات کی جائے۔ کوئی بلی کے کان پکڑے گا کوئی اس کی دم۔ پھر کسی نے یہ نہیں کہا کہ جب وہ میاؤں کرے گی تو اس میاؤں کو کون پکڑے گا۔ میاؤں کا لفظ سنتے ہی سارے چوہے بھاگ گئے۔

"تیلی خصم کیا پھر بھی سوکھی کھائی!"

ایک چٹوری عورت، آخر میں تیلی سے بیاہ کر کے سمجھی اب اسے تر نوالہ ملتا رہے گا۔ مگر جب اس کے ہاں بھی فاقے ہوئے تو بولی........

"شیخ نے کچھوے کو بھی دغا دی!"

ایک شیخ صاحب کو دریا اترنا تھا۔ کشتی کوئی تھی نہیں۔ ایک کچھوا بولا میں اتار دوں تو کیا دو گے۔ بولے ایک بکرا۔ کچھوے نے انھیں اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا۔ اور دوسرے کنارے پر اتار کے کہا۔ وعدہ وفا کیجئے۔ شیخ جی نے اپنی مرزئی اتاری اور ایک جوں ڈھونڈھ کر ناخن پر رکھی اور نذر دی گویا وعدہ پورا کر دیا......

"سوت نہ کپاس کولی سے لٹھم لٹھا!"

کسی صاحب کے گھر روئی رکھی تھی۔ دو آدمی کاتنے والے تھے جاتے جاتے ایک کولی سے بھاؤ تاؤ پوچھا۔ کمی بیشی پر جھگڑنے لگے۔ تو یہ کہاوت بن گئی۔

"قاضی کی مونچھ!"

قاضی جی کے یہاں مونچھ کی ضرورت پڑ گئی۔ بازار سے ملی نہیں۔ ایک صاحب جو اس وقت حاضر دربار تھے ان کے ہاں مونچھ تھی۔ اور انھوں نے منگوا دی۔ وہ مونچھ جو بشر

میں درج ہوگئی۔ دوسرے قاضی صاحب آگئے مکان با سفیدی ہونا تھی۔ اس کے لئے مونجھ درکار تھی۔ رجسٹر میں ان حضرت کا نام نکلا بس کر لیا گیا۔ اور مونجھ سفید سپلائی کرنے پر مجبور ہوگئے۔

"نوکر تو آپ کا ہوں۔ بینگنوں کا نہیں ہوں"

بادشاہ نے بینگن میں ساری دنیا کی خوبیاں گنا دیں۔ دوسرے موقع پر بادشاہ نے بینگن سے ناپسندیدگی ظاہر کی۔ تو وہی حضور سے اس کے عیب گنانے لگے بادشاہ نے حیرت سے کہا کہ اس روز تو تم نے بینگن کی تعریف کی تھی، آج اسی کی برائی کر رہے ہو۔ اس پر جواب دیا۔ . . . .

"تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، ابھی دیکھو اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے"

یہ دونوں کہاوتیں ایک حکایت سے نکلی ہیں شہزادے کے چار لنگوٹیا یار تھے۔ ایک مولوی صاحب کا لڑکا تھا دوسرا ایک سپاہی زادہ، تیسرا تیلی کا اور چوتھا بلوچ کا لڑکا تھا شہزادہ بادشاہ ہوا تو ان چاروں کو اس نے وزیر بنا دیا۔ ایک دوسرے بادشاہ نے چڑھائی کر دی۔ یہاں کیبنٹ بیٹھی۔ تو سپاہی نے کہا کہ فوراً فوجیں تیار ہوں اور سرحد پہ ہی مقابلہ کر کے دشمن کو پسپا کر دیا جائے۔ ملاجی کے صاحبزادے بولے کہ۔۔ فوج کشی ہوگی۔ بندگان خدا کا خون بہے گا۔ اس کی ذمہ داری بادشاہ کی گردن پر رہے گی سپاہی بولا۔ کہ دشمن آئے گا تو خون تو وہ بھی بہائے گا۔ ملا صاحب نے کہا کہ اس کا قبضہ ملک پہ ہو سکتا ہے مگر اخلاقی فتح تو ہماری ہوگی۔ بلوچ وزیر سے پوچھا تو بولا دیکھو تو اونٹ بیٹھتا کس کروٹ ہے اور تیلی وزیر کا مشورہ تھا کہ ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔

الفاظ کی طرح کہاوتیں بھی اپنے سماج کا آئینہ ہوتی ہیں۔ اور اس تاریخ و معاشرت کو ظاہر کرتی ہیں۔ جس دور میں وہ بنی تھیں ہندوستان میں سامنتی سماج (جو انگریز کے جانے کے ساتھ بالکل ہی ختم ہو گیا) کی یادگار ضرب الامثال بھی ترک ہو چکی ہیں۔

"کالا منہ نیلے ہاتھ پاؤں"

سامنت شاہی عہد میں کالا منہ کر کے اور نیلے ہاتھ پاؤں رنگ کر گدھے پر بٹھایا جاتا اور مجرم کو تشہیر کیا جاتا تھا۔

"پھر کون جئے کس کا راج"

اس بات کی دلیل ہے کہ سامنت شاہی میں کوئی راج مستقل یا دیرپا بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ "پیچ کی ہزار نعمت"

اس عہد کے افلاس کا ثبوت ہے کہ چاروں کے پیچ ہی نعمت سمجھی جاتی تھی "اپنے منہ کا نوالہ ہمارے پیٹ کا ادھار ہے"

سامنت شاہی میں وقار انسانیت باقی نہیں رہ گیا تھا اور عوام ایسی باتیں بلا تکلف کہہ سکتے تھے۔

"ایک منہ موتیوں سے بھرا جاتا ہے، سو منہ خاک سے بھی نہیں بھرے جاتے"

ہر زمانے میں خیال و فکر کا رجحان ترقی پسندانہ رہا ہے سامنت شاہی میں ایسا سوچنا بغاوت و غداری میں شمار ہونا چاہیئے۔ مگر سوچنے اور کہنے لکھنے مفقود نہ تھے۔

"چھب گٹھری میں اور صورت طباق میں"

اس کہاوت سے اس عہد کی معاشرت کے ساتھ یہ تصور بھی سامنے آتا ہے کہ لباس گٹھریوں میں رکھے جاتے تھے اور چھب لباس سے نکلتی تھی۔ حسن و صورت طباق یعنی غذا کے ہاتھ میں سمجھا جاتا تھا۔ یہ تصورات آج بھی اتنے ہی صحیح ہیں۔

مختصر یہ کہ اردو زبان کی کہاوتوں پر ریسرچ ہونا چاہیئے اور بحالات موجودہ انجمن ترقی اردو اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ وہ اپنے وجود کا ثبوت اسی قسم کے کام شروع کر کے دے سکتی ہے۔

●●



آریہ پتا اور بھارت ماں کی بیٹی

ہمارے اردو نمبر سے
فاروق ارگلی کی تحریر

میں اردو ہوں!

آریہ پتا اور بھارت ماتا کی بیٹی؟

بڑے بوڑھے کہتے ہیں رِشی منی سے دو ہزار سال پہلے میری ماں کی بارات ایران کی اور سے اتنی دھوم دھام کے ساتھ آئی تھی کہ چھوٹی موٹی پرلے کا سماں بندھ گیا تھا۔ ہندوکش کی پہاڑیوں سے لے کر اترا کھنڈ میدانوں تک باراتی پھیلے ہوئے تھے۔ ہمالیہ پر وواہ کا منڈپ تھا اگوانی کرنے والے تھے۔ دراویدی والے جنہیں گرو تھا کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ کھان پان، وستر سب میں الگاؤ۔ بیٹی تو بیاہ دی، پر میری ماں بڑا ہو کر سسرال جانے کو تیار نہ ہوئی۔ جھگڑا ہو گیا۔ بیچ پرمیشور کو کون مانے، تلوار اور بھالوں نے نرنے کیا۔ میرے بابا دادا گھر جمائی بنے۔ میری ماں اور میرے باپ میں پہلے تو کھینچا تانی رہی۔ بعد میں دُگدھ اور مدھو کے سمان دونوں ایک ہو گئے۔ شریر ہی نہیں آتمائیں بھی مل گئیں۔ گھر کے آنگن میں پریم کے پُشپ کھلے تو چہوں اور شانتی کا واتاورن ہوا۔ اَپون میں پکشی بھانت بھانت کی بولیاں بولتے۔ جھرنے کل کل سور میں ملن کے گان الاپتے۔ میری ماں اور باپ دونوں کی جاتی الگ۔ بولی الگ، کھان پان میں انتر۔ پر آتمائیں مانو ودھاتا نے ایک کر کے بھیجی تھیں۔ آتمائیں سب ایک سمان ہوتی ہیں چاہے آتما منش کی ہو یا دھرتی کی، برکشوں کی ہو یا پربتوں کی یا پھر پرماتما کی۔ ہر آتما پر پرماتما براجتے ہیں۔ دو آتماؤں کا ملن ہوا تو ان کے گھرشن یا ٹکراؤ سے جو کرن پر یہ سنگیت نکلا جو سنتان ہوئی اس کا نام کرن سنگار ہوا اس کومل اور انوپم بچی کا نام پراکرت رکھا گیا چونکہ اتینت سندر کنیا پراکرت۔ بھارت ماتا داری جاتی ہے۔ پتا پران نچھاور کرتے۔ خون پسینہ ایک کر کے پتری کو پالتے سنبھالتے سنوارتے۔ پیار کے پالنے میں کنیا کا لالن پالن ہونے لگا۔

پراکرتی یوون کی سیما میں پرویش کرنے لگی۔

کیا راجہ کیا پرجا کیا رشی کیا منی کیا دیوتا کیا دیویاں سب بھارت او ر آریہ راج کی پتری کے دیوانے تھے۔ جو مست ہرنی کے سمان اتر کے میدانوں میں کلیلیں بھرتی اٹھلاتی رہتی۔ گنگا جمنا کے پاون جلوں میں اسنان کرتی گندھارا سے برھابرت تک اس کے رس میں ڈوبے ہوئے گیتوں کی جھنکار گونجتی۔ سندھو کے آنچل سے لے کر بندھیاچل کے پا تھار تک اس کے شریر کی مادک سگندھ رچ جاتی کوئی اس چومکھی کامنی اور موہنی کو پراکرتی دیوی کہتا۔ کوئی اسے سنسکرتی کہہ کر سمبودھت کرتا۔ ہر ایک کو اس کے من چاہے روپ میں دکھائی دیتی۔ پریم اور پوجا میں انتر نہیں ہوتا۔ دیوتاؤں کی دلاری اس کنیا کے جوڑے میں ایک پریمی نے بھاؤ وِش میں آ "رِگ وید" کے پھول لگا دیئے (ہندوؤں کی پہلی کتاب رگ وید جو آج بھی الہامی کتاب کا درجہ رکھتی ہے) یہ اپہار بہت مولیہ دان تھا۔ پھولوں کی ایک ایک پنکھڑی میں دیوتاؤں کی پوترتا کے چتر تھے۔ پریمی اور پجاریوں نے ان پھولوں سے منتروں اور اچارلوں گیتوں اور کہاوتوں کی مالائیں پروئیں۔ مدھیہ دیشیہ، اودیچیہ پراچیہ بولیوں میں روپ سندری کا گُن گان کیا۔ پریم اور پوجا میں پرماتما کا ہی پربھاؤ ہوتا ہے۔ پریم سے ہی بھکتی اور شردھا کا دھرم جنم لیتا ہے۔ چومکھی کنیا، رتھات میں بھگتی اور شردھا کا کیندر بن گئی۔ ایشور تک پہنچنے کا سادھن بن گئی۔ راجاؤں کے نواسوں میں میری ہی چرچا تھی۔ وِدوانوں کے آشرموں میں میرا ہی روپ تھا۔ میں ہی میں تھی سروویاپی میں۔

☆ ☆

بدلتا سمے بدلتا روپ

میں بڑی چنچل اور نٹ کھٹ تھی۔ یگوں سے بھارت کے اپون میں اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ بھارت ماں کے آنچل کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔ رتوئیں مجھے مست کر دیتیں۔ اتنی مست

کہ کچھ سندرہ بدھ ورنہ تھی۔ پریمیوں کی کمی نہ تھی پر مجھے تو کچھ سہاتا ہی نہ تھا کس سے پیار کروں۔ چنچل تھی نا۔ رشی منی اپنی اور بلاتے میں ایک چھن کو ٹھہر جاتی۔ پنڈت گیانی سمجھاتے "اری سنسکیرتی ہماری باہنوں میں آجا۔ تجھ پر شودروں کی چھایا بھی پڑنے نہ دیں گے۔ تجھے سدیو گیان کے منڈپ میں چھپا کر رکھیں گے۔" میں ہنس دیتی۔ کہیں سگندھ کو بندی کے سمان رکھا جا سکتا ہے؟ میری ہنسی تکشلا سے لے کر سمست واتاورن میں گونج جاتی۔ ملیچھ میری جے جے کار کرنے لگتے تو سورن کرودھ سے جل جاتے۔ "دشمن" اور "گھرانا" کے شبد کہتے۔

پر میں تو چنچل تھی۔ میری نس نس میں پیار بھرا تھا۔ پیار بھرا ہردے چھاتی میں دھڑکتا تو میری مستی اور بڑھ جاتی، مجھے کہیں کل نہ آتا۔ کس نے سنے بیاکل تھی میں۔ کیا چاہتی تھی میں، اپنی ہی سندرتا نہ تھی۔ کبھی راجاؤں کے بھونوں کی پرکرما کرتی، کبھی یدھ کے میدانوں میں گرجن کرتی۔ کبھی دیوتاؤں کی پرتیما اور مہانتا میں براجتی۔ کبھی رشیوں کی کٹیاؤں کے درشن کرتی۔ پنڈت اور گیانی پیچھے پڑے تھے میرا اپہرن کر کے بندی بنانے کا جتن کرتے۔ پر میں تو چنچل تھی۔ سگندھ سے بنا تھا میرا شریر اور سگندھ کبھی بندی نہیں ہو سکتی۔ مندروں کے بند دواروں سے نکل کر جنتا جناردن میں چلی جاتی۔ ملیچھوں سے بھی پیار کی باتیں کرتی پنڈت گیانی جل کر مجھے اپ بھرنش کہنے لگے۔ (اپ بھرنش سنسکرت اور مقامی بولیوں کی بگڑی ہوئی شکل کو کہتے ہیں)

میں جلنے والوں کو اور چڑاتی۔ بن ٹھن کر اپنی ایک چنچل جاتی کی سہیلی شورسینی کے ساتھ کھیلتی، اٹھلاتی۔ شورسینی سانوری رنگت والی بڑی طرحدار سندری تھی۔ میں اس کے سنگ متھرا کے آنگن میں اٹھلاتی رہتی۔ ہمیں کسی وقت قرار نہ تھا۔ سگندھ کے شریر، پانی کے شریر، ہواؤں کے شریر بہت جلد آپس میں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔



اب پتہ نہ چلتا کہ شورسینی کون ہے اور سنسکرتی کون ہے۔ رنگ ایک، بانا ایک، روپ ایک، لبھانے کا ڈھنگ ایک، میری یوون مدرا چھلک رہی تھی۔ جدھر نکل جاتی نشہ پھیل جاتا۔ دو گھڑی ودیاپتی کی کٹیا میں رکتی (ودیاپتی اپ بھرنش زبان کا مشہور شاعر) اس سے پیار جتاتی وہ ہرجائی رے کہہ کر چھیڑتا، باہیں پسارتا اور میں اپنی سگندھ چھوڑ کر پشچم کی اور نکل جاتی۔ کبھی پورب کو کبھی اتر میں دھما چوکڑی مچاتی کبھی دکھن میں روپ رس کی مدرا سے لوگوں کو اُنمت کرتی۔ جدھر جاتی، نیا نام ملتا۔ کوئی شورسینی کہتا۔ کوئی سنسکیرتی، کوئی ماگدھی، کوئی اردھ (آدھی) ماگدھی، کوئی مہاراشٹری، کوئی پراچین اپ بھرنش، کہیں کیکئی اپ بھرنش تو کہیں پراچیہ، گوڑ اور ڈھکی یا ٹکلی اور منگھی کہلاتی، میری جوانی، میرا مست کر دینے والا یوون، کس کس کے دل پہ خنجر پات نہیں کیا، میں

نے۔ سمراٹ اشوک نے مجھے پیار جتایا۔ میرے روپ کی چھبی کو ناٹوں میں انکت کروایا۔ میں مدھو کی وانی بن کر سنسار میں گھوم چکی تھی۔ دو آبے کے ہرش وردھن نے مجھے باہنوں پاش میں لے کر پیار جتایا تھا۔ ہستنا پور کے راج محلوں اور جھونپڑوں میں میری ہی مالا جپنے والے رہتے تھے۔ راجپوتانے سے نالندہ تلک کہیں راج بھاشا، کہیں بندیلی، کہیں اودھی، کہیں مگھئی، کہیں پنجابی کے ناموں سے مجھے بلایا جاتا تھا۔ مَیں جو کبھی تروِنی تھی۔ سگندھ سے بنی اور سگندھ کو بندی نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

⁂ ⁂

ملیچھوں سے پیار :۔

سوامی تم ہی گرو گوسائیں ؛ اہمے جے سکھ سدا ایک
بوچھیا نرارر میںے چیلا کرن ودھی رہے ؛ ست گرو ہوئی
سا پوچھیا کہے!

میرے گیت دایو منڈل میں گونج رہے تھے۔ اکتارے کی جھنکاروں کے ساتھ میری مدھر بانی جب الاپتی :

بانہہ چھڑائے جات ہو جان کر نبل موئے
ہردے میں سے جاؤ گے تو مرد بدھونگی توئے

تو میرے پریمی سوم پربھ سوری، ودیا دھر، شارنگ دھر جیسے تیج واں تڑپ تڑپ اٹھتے ہیں اور ان کے کنٹھ سے میرے ہی روپ کی مہما کھر ہو اٹھتی تھی۔ پھر ہر ایک ہاہاکار مچ گئی، دھرتی ڈول گئی۔ پربت ہل گئے۔ بھونچال سا آ گیا پر۔ لما گئی مانو۔ بھارت ماں نے کہا جب تمہارے باوا دادا لوگ آئے تھے تب ایسی ہی پرلے آئی تھی۔

"ہمیر راسو" کا کوی چلا اٹھا :۔

ڈھولا مار یا ڈھلی ماں پھیو ملیچھ سر پر

(دہلی میں ڈھول بجا اور مسلمان ملیچھوں کے شر پر بے ہوش ہو گئے)

کبھی پنڈتوں سے پوچھتی دیو کا ہوئی گیسو، کبھی بھاٹوں سے پوچھتی، کبھی پیروں جو دھاؤں سے معلوم کرتی۔ ایک نیا نام سا، کانوں کو وچتر لگا۔ بدیسی۔ مسلمان ہم سب ملیچھ کہتے تھے جو طوفانوں کے سمان، بونڈر کے سمان پچھم کی اور سے آتے تھے اور بجر بن کر گرتے تھے وے شتر و۔

بھارت واسی بھاٹ اور کوی ملیچھوں کو للکارتے گھناؤنے شبدوں سے سمبودھت کرتے۔ پر مَیں تو سگندھ سے بنی تھی، جو کبھی تھی۔ ایسی سندری کہ جس کے روپ کی چھٹا سے مہادیوپ کے پرانگن میں اجیارا تھا۔ سنگیت کسی سے گھرنا نہیں کرتا، سب کے کانوں میں رس گھولتا ہے۔ سگندھ کسی کو نہیں پہچانتی۔ عرب سے آتے ہوئے آکرمن کاریوں کو دیکھا تو من کو بھائے۔ ماں کہتی تھی میرا اتہاس دہرایا جا رہا ہے۔ مانوں میرے ماں بھارتی کے سمان وہ عربی گھڑ سوار میرے بیاہنے کو آئے تھے۔ جیسے ایک بار پھر گھرشن ہونا تھا اور میرا اتھا میرے پریوار کے لوگوں کا کلھان یا ن جیون یا پن بدلنا تھا۔ ہونی کو کون ٹالے مسلمان ملیچھ مانس بھکشی تلوار کے دھنی پر ہردے کے ادار پریمی اور دور درشی، میرے روپ کا جادو انہیں پر بھاؤ کئے بنا نہ رہا۔ میری ماں کے آنچل کی ہوا نے دیوانہ بنایا۔ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

ہم ناجی بے تور دوار چھاٹری کے

چندر بردائی میرا پریمی میرے نام کی مالا جپنے والا البیلا کوی پرتھوی راج راسو میں "مت جہ کے چوہان" کہتے ہی رہ گیا (پرتھوی راج کے دربار کا خاص شاعر جس نے مسلمانوں کے مقابلے کے لئے ہندو راجپوتوں کو اپنے کلام کے ذریعہ بھڑکایا، اکسایا تھا۔ چندر بردائی کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے اولین شعراء میں سب سے نمایاں شاعر کہا جا سکتا ہے) پر وہی ہونا تھا جو ہوا۔ بدیسیوں نے ابہار میں شبدوں کے گہنے بولیوں کے رتن، ریتی رواجوں کے وستروں کے ابہار میرے پاون چرنوں کو ارپت کئے تو میں پھولی نہ سمائی۔ یہ نیا بانا بدل جب مَیں نکلی تو کیا دیسی کیا

پردیسی میرے روپ کی چھٹا دیکھ واہ وا کر اٹھے۔ جب پریم کا بندر ایک ہو تو کھرناپ یم میں بدل جاتی ہے۔ میں تو سکندہ تھی۔ سنگیت تھی جو ہر ایک کے ہونٹوں پر مکھرت ہوتا ہے راجاؤں کی دھاڑ میں سپاہیوں کی للکار میں۔ کسانوں کے گیتوں میں، کوئوں کی چھندوں میں، بڑے بوڑھوں کے محاوروں میں، بھگتوں کی بھگتی میں، پریمیوں کے پریم ناپ میں ہر جگہ میں ہی میں۔

لشکر :- میرا روپ نکھر آیا تھا۔ عربی بانات کا لبادہ بھارتی سونے کے کرن پھول چندن ہار پائل اور جھومرے بچی میں پہلے بجلی تھی۔ اب قیامت بن گئی تھی فارسی اور ترکی غازے اور سامان آرائش نے دو آتشہ کر دیا۔ چندن سا بدن اور نکھر آیا۔ شباب کی ملاحتیں اور بڑھ گئیں۔ میرے چاہنے والوں میں دیسی بدیسی سبھی تھے۔ دلی سے بنگال تک پنجاب سے قندھار اور غزنی سے لے کر عربوں کے ریگستانوں اور بلخ و بخارا کے باغات تک میری مہک پہنچی تھی۔ ہجوم عاشقاں تھا اور میں تھی۔ گورے کالے سانولے ہندو، مسلمان، آتش پرست مجوسی، شاہ و گدا، رشی، صوفی ایک لشکر تھا۔ میں اُردو تھی گویا لشکر۔

ایک آئینہ تھی میں۔ جس میں ہر لشکری کی صورت دکھائی دیتی تھی۔ پس مجھے ہی "اُردو" کہا جانے لگا۔ مسلمان آئے تو تھے شاید لوٹ مار کرنے، پر بھارت ماں کے سبز بنفشی آنچل کی خنک ہوا ایسی بھائی کہ یہیں کے ہو رہے۔ میرے حسن و جمال کی چمک نے دیوانہ بنا دیا تھا میں جو پراکرتی سنسکرتی اور شورشینی کے خطابات فراموش کر کے حسینۂ اردو بن گئی تھی۔ میرا رہن سہن بدلا۔ شاہوں نے مجھے اپنا وقار بنایا، عالموں نے مجھے گلے لگایا، صوفیاء نے مجھے ذریعہ تصوف بنایا۔ عاشقوں نے اپنے جذبے کی گرمی کو میرے الفاظ کا پیکر بنایا۔ مرد میدان لشکریوں



نے اپنے خون میں مجھ سے حدت پیدا کی۔ میرے ایک چاہنے والے نے دلی سے دکن تک لشکری زبان کو رواج دیا۔ ملک کافور مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ جس کی سعی مسلسل نے سر زمین دکن کی چٹیل اور سنگلاخ پہاڑوں سے قلی قطب شاہ سراج، وجہی، قطبی اور ولی جیسے سہرے نکال کر وقت کے ہاتھوں میرے آنچل میں ٹانک دیئے۔ میں کیا تھی، کیا بنتی جا رہی تھی، مجھے ہوش نہ تھا۔

میرا وجود پھوا ہوا کی طرح سمندر کے دائروں کی طرح آفتاب کی کرنوں کی طرح۔ پھیلتا جاتا تھا۔ خانقاہوں میں درباروں میں ہی نہیں عوام کی جھونپڑیوں میں ہر جگہ جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ تلسی داس، نانک، کبیر رس خان، میرا اور رحیم نے میری اوڑھنی ستاروں سے بھر دی تھی۔ کبھی پنجاب سے ایک مدھر بانی گونجتی:-

اک رب دے سب بندے

عوام جوق در جوق میری طرف دوڑ پڑتے۔ نانک کی مقدس آواز میں میری کھنک تھی۔ میں ذریعہ تھی "اک رب دے پیغام" اور عوام کے رابطے کی۔ کبیر جیسا سنت مجھے اپنی کٹیا میں مہکاتا:-

"جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ
میں باوری ڈوبن ڈری رہی کنارے بیٹھ

اور

ایکے سادھے سب سدھے اور سب سادھے سب جائے
جو گہی میوے مول کو پھولے پھلے اگائے

میرا پریم دیوانی کی پکار گونجتی :-

میں تو پریم دیوانی میرو درد نہ جانے نہ کوئے
گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے

درد کی ایک لہر دلوں میں پیار بھگتی اور سوز دروں پیدا کر رہی تھی، ایکتا کا ماحول، محبت محبت، پریم پریم اور شانتی۔ میں امن کی ٹھنڈی پھوار بن کر برصغیر کی فضاؤں پر برس رہی تھی۔ برج کی رنگین دھرتی میں کرشن کنہائی کی مہابن کر برسانے اور گوکل کے مندروں میں گونج رہی تھی۔ اس سے کوئی مجھے دیکھتا۔ اگر سندر تھی تو میں، اگر کومل تھی تو میں، جھنکار تھی تو میں، کھنک تھی تو میں، پیار تھی تو میں، ایکتا تھی تو میں۔ کبھی میوات میں کھڑی بولی کا چولا پہن کر۔ کبھی اترا کھنڈ میں کیسریا ساری باندھ شبدوں کی کردھنی پہن کر اتراتی تو کبھی راجپوتانے میں باگڑی لہنگا مٹکاتی اور پھر دلی کے گگن چمبی (فلک بوس) شاہی محلات میں جھانکتی۔ بادشاہوں کو رجھاتی اور عوام کی طرف بھاگ جاتی۔

دوشیزۂ فارسی کا رنگ روپ میری چھب سے ماند پڑ گیا تھا پر سمجھدار تھی۔ دامن میں صائبؔ، نظیریؔ، عرفیؔ خیامؔ، سعدیؔ، حافظؔ، جامیؔ، رومیؔ جیسے رتن چھپائے تھی۔ نوشیرواں اور آریہ مہر کے درباروں کی تربیت یافتہ تھی۔ نرم مزاج اتنی کہ باتوں سے پھول جھڑتے تھے۔ پھر شاہوں کے منہ لگی مگر مجھے دیکھ جان گئی کہ میں کیا ہوں میری سہیلی بن گئی۔ عربی، ترکی، عبرانی بھی میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا چکی تھی۔ میرا عاشق صادق امیر خسرو ولیوں کا ولی رندوں کا رند صورت سے فقیر، دل کا سلطان میں اسے بھا گئی وہ مجھے بھا گئی۔ ہائے! کتنا دلدار آدمی تھا۔ کیسا باغ و بہار میں ہمہ وقت اپنی فارسی سہیلی کے ساتھ اس کے جلو میں رہتی۔ خسرو مجھے زیادہ پیار کرتے تھے پر فارسی بیگم سے بھی اخلاقاً ہنس بول لیتے تھے۔ کیا کیا پہیلیاں بجھواتے تھے۔

ایک تھال موتی بھرا ٭ سب کے سر پہ اوندھا دھرا

میں خوب ہنستی پر ہنسی تھم جاتی جب شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء تشریف لاتے۔ میرے خسرو کے مرشد، ہائے انہیں جیسے بزرگوں کا تو دست شفقت ہے مجھ پر۔ یہ نہ کہئے گا کہ خود ستائی کرتی ہوں۔ دیوتاؤں نے رشیوں نے، منیوں نے، شہیدوں نے، انصاف پسندوں نے، مظلوموں نے، ولیوں نے، کس نے مجھ پر دست شفقت نہیں رکھا۔ شیخوں کے شیخ، خدا کے خاص مقرب بندے جب معرفت کی منزلیں طے کر کے قادر حقیقی سے واصل ہوتے ہیں۔ خسرو میری آواز میں بولے ؎

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چہوں دیس

برج رانی عرف ریختہ بیگم :-

میرا دامن اب وسیع تر ہو گیا تھا۔

میرا حسن اب اور نکھر چکا تھا۔ صوفیوں کی قوالیاں نانک کی بانیاں، کویوں کے دوہے اور چوپائیاں ہنس جواہر گرنتھ صاحب، پدماوت، بابا فرید کی کافیاں اور خسرو کا بھاشا اور فارسی بیگم سے والہانہ پیار۔ جیسے لاکھوں پھول میرے آنچل میں مہک رہے تھے۔ فارسی بیگم میری رفیق بنی رہی۔ اللہ کی بندی کو ایک طرح سے سوت ہو کر بھی مجھ سے ڈاہ نہیں رہی۔ ہائے میرے چاہنے والے دونوں کو میری وقعت کی زیادتی کے باوجود ایک نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ؎

مجکا نہ ہوس مانک و موتی
فقرا علیف، بس بولغو سید و پانی، روتی

٭ ٭

زرگر پسرے چو ماہ پارا ٭ کچھ گھڑیئے، سنواریئے پکارا
نقدِ دل من گرفت و بشکست ٭ پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

میں اب ریختہ بیگم کہی جانے لگی۔ کبھی فارسی بیگم

معصوم و پروقار چہرہ چڑھتی کبھی اس پر پیچ و تاب کھاتی میرا اصل روپ تو بدل گیا تھا۔ ہندی دوشیزہ، فارسی، اردو، ایرانی و عربی پیراہن سے آراستہ۔ کون پہچانے فارسی بیگم کون، برج رانی کون؟ ہندو نہ مسلمان دونوں کا تال میل۔ محبت اور یگانگت کا مجسمہ پیار اور پریت کی دیوی۔ نہ اِدھر کی نہ اُدھر کی، اِدھر میں ڈھلی ہوئی یعنی ریختہ بیگم۔

میں آگے بڑھتی گئی

"اکبر ساہ جی عام کھاس میں تکھت کے اوپر براجمان ہو رہے۔ دربار کھاس بھرنے لاگا ہے امرا آئے، کورنش بجائے جہار کر کے تاجیم کرے!"

پات ساہی، بادشاہی بنی۔ تاجیم، تعظیم بنی۔ کھاس خاص ہو گیا۔

یہ چاہنے والے غضب کے ہوتے ہیں۔ محبوب کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ اب میں کھڑی بولی بولنے والی اجڈ گنوارن نہ رہتی تھی۔ میرا روپ صیقل ہو گیا تھا۔ بناؤ سنگھار کر کے فارسی بیگم جیسا چوغہ پہنا تو درباروں میں رسائی ہوئی۔ چندر بھان برہمن نے مجھے جو رِدا اڑھائی تھی ؎

خدا جانے یہ کس چمن اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
پیا کے نام کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے
نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
پیا کے ناؤں عاشق قتل با عجب دیکھے ہوں
نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے، نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیاں میں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

اور میرے پیارے عاشق محمد افضل جھنجھانہ والے نے جو پریم بھرا تحفہ دیا تھا ؎



سلطان الشعرا حضرت خواجہ امیر خسرو دہلوی

پڑی ہے گل میں میرے پیم پھانسی
مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی

اور میرے دگر چاہنے والے کی دی ہوئی یہ سوغات! ہائے سید برکت اللہ پیمی (پریمی) ؎

گھر تج کے جا جنگل میں پری تب سمجھ پری
تن من میں پیم کی آگ بری تب سمجھ پری

اور پھر:-

پیا باج پیالہ پیا جائے نا!

وجہی میرا پیارا شاعر، سچی، میں نے اس سے بہت پیار کیا ہے۔ ہائے! اب ولی یاد آنے لگا ؎

آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

مگر اب زمانہ اور تھا۔

مادرِ ہندوستان ہندو مسلم تہذیبوں کے ٹکراؤ سے ایک نئی سرزمین بن چکی تھی۔ میں، ریختہ بیگم عوامی رابطے

مب سے بڑی زبان کے روپ میں جانی جا رہی تھی۔
حاتم، مبارک آبرو، جانِ جاناں، رفیع سودا، اور
عاشق صادق میر تقی میر، ریختے کا استاد سخن کا ناخدا۔
تہ آتش عشق جس کا دین و مذہب کیا تھا:

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترکِ اسلام کیا

مجھے سجانے سنوارنے اور تراشنے میں ساری عمر
ن کر دی۔

میران نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

ہ سودائی!
سودا
مجھ سے عشق کیا کرتا تھا، نٹ کھٹ بنا کرتا تھا۔ بڑا
پشت چاہنے والا تھا۔ مجھ میں شوخی، طنز اور نشتریت
ں۔ اب میرے پاس سب کچھ تھا۔ کیا نہیں تھا۔
و شباب کی رعنائیاں، تصوف و معرفت کی سر
اں، طنز و مزاح کی شوخیاں، غلو و ابہام کی قیامت
اں، عالمانہ بصیرتوں کی بلند خیالیاں، صوری
نوی دونوں طرح سے مرصّع۔ مگر اب بھی کسر تھی۔
ں سو کن فارسی کا لوہا تو تھا مگر برج کا اکھڑ پن اکھرتا
مگر یہ گنگا جمنی روپ ہی تھا، جو مجھے ہر اعلیٰ و ادنیٰ د
ں کو اپنا دیوانہ بنائے دے رہا تھا۔ خدائے سخن میرا
ن صادق جب اپنے حسنِ بیاں کے جادو جگا رہا تھا
یک لڑکا ننھا سا دیکھا تو بولا۔
"کوئی استاد کامل اسے مل گیا تو بڑا شاعر ہوگا ورنہ
بکے گا۔"
غالب۔ وہی غالب تھا! نام کا غالب، کلام سے
پر غالب، فارسی پر غالب، مجھ پر غالب، نثر پر غالب
غالب، رموزِ معرفت پر غالب، شوخیٔ عشق پر غالب
بچل فن پاروں سے جگمگا اٹھا۔ وہ فلسفیانہ بلند

آہنگی وہ شانِ تغزل، وہ شاعرانہ گھن گرج، میں یہ سب
پا کر اترانے لگی۔ قلعے میں بیگمات کی منہ لگی تھی تو بازاروں
میں پھیری والوں، مزدوروں، سپاہیوں، جواریوں، شرابیوں
اور بھکاریوں کی دلاری تھی۔

بالاخانوں میں موسیقی کے ترنم کی لہروں میں میں ہی
تھی اور صوفیاء کے روحانی محفلوں میں میں تھی۔ اب
مزید ہرجائی پن چھوڑ کر اسی پیار کے گہوارے میں رہنا
چاہتی تھی۔ کبھی دلی میں نظر آتی، کبھی لکھنؤ میں چمکتی اور
اندر سبھا میں ناچتی۔ بانکوں کی بولیوں اور گالیوں میں
جھومتی اینٹھتی، لکھنؤ میں نزاکت کا جادو جگاتی۔ جوبن
دکھاتی لوگوں کو رجھاتی اور لوگ باگ میرے پیچھے پیچھے
گھومتے۔

ہائے کیا نزاکت تھی، چمیلی کا ایک پھول کسی نے سر پہ
رکھ دیا تو کمر سو سو بل کھاتی۔
دلی میں آتی تو متانت کی بھاری جڑاؤ چادر سر پہ
ڈالے ہوتی، سنجیدہ ہونا پڑتا۔ بھاری بھرکم بننا پڑتا۔
بوئے گل، نالۂ دل، پاسِ وفا، شاہانہ وقار اور
عالمانہ شائستگی۔

ہائے وہ دلی کی گلیاں!
جہانِ رنگ و بو تھا۔
میری عین جوانی کے دن تھے۔

میری بھارتی ماں کی تاریخ ایک بار پھر دہرائی
جانے والی تھی۔ وہ چمن اجڑنے والا تھا جہاں میں محو
گلگشت رہتی تھی۔ جہاں ذوق، مومن، غالب جیسے باکمال
جمع تھے۔ جہاں کے ہندو لالہ لوگ بھی میری رفاقت
کا دم بھرتے تھے۔ ہندو دیویاں مجھے گلے لگاتی تھیں۔

✱ ✱

فرنگی آئے:۔ جیسے آریے آئے تھے جیسے عرب
کے غازی آئے تھے۔ بھارتی ماں کے آنچل میں چھپی دولتوں

کو پانے کے لئے بلادِ مشرق کی دلہن سرزمین ہند کی بانکی چھبی جنہیں کشاں کشاں کھینچ لائی تھی۔ ایشیائی تھے وہ یہیں کے ہو رہے۔ بلخ و بخارا، سمرقند و حجاز، غزنین اور غور کے باشندے ہندوستانی ہو گئے تھے۔ فرغانہ کا بابر اس سرزمین کو فردوس بر روئے زمین کہہ کر حب الوطنی کی داغ بیل ڈال گیا تھا، ہمایوں، شیر شاہ، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اورنگ زیب جانے کتنے بڑے بڑے تاجدار اسی خاک میں دائمی نیند سو چلے تھے۔ حجازی شہسوار تھے جو ہندی دہقان بن چکے تھے۔ ان کی نسلوں سے میرے چاہنے والے بچے ہندوستانی پیدا ہو چکے تھے۔ مجھے بھی تو ہندوستانی کہا جانے لگا تھا۔

اچانک طوفان آگیا۔

سفید فام قوم کا تسلط قائم ہو گیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں بے آبرو ہو گئی۔ اپنے گھر میں ہی جو ہر کرنا ہو گا۔ میں لٹ گئی۔ دلی مٹ رہی تھی۔ میرا گھر لٹ رہا تھا۔ میرا سہاگ مٹ رہا تھا۔ خون، خون۔ آگ، آگ، یہ لگتا تھا۔ اب دلی نہ رہے گی۔ دلی نہ رہے گی تو دلی والے کہاں! اردو کہاں؟ غدر یا جنگِ آزادی پھر وہی ہونی کی بات یاد آتی ہے۔ ہونی جسے فیصلۂ قدرت کہتے ہیں۔ انقلاب نہ ہوں تو دنیا یک رنگی کا شکار ہو جائے کائنات بڑھاپے کا شکار ہو جائے، زندگی جو ہر آن نئے قالب چاہتی ہے۔

فرنگی نہ آتے تو کچھ نہ ہوتا۔

فرنگی آ گئے تو بہت کچھ ہو گیا۔

ہند کی آزاد فضاؤں میں پلی بڑھی اور باحیا دوشیزہ سلامت، فصاحت اور شائستگی کا پیکر اردو ملک کو غلام ہوتا دیکھ رہی تھی۔

دشمن چالباز، دغاباز، بے حیا، خود غرض اور خلوص سے عاری تھا۔ یورپ کی سرزمین کا انسان نما جانور مگر واہ ری میری ماں کی آغوش! اور واہ ری میں، انگریزی



اورنگ زیب

جیسی آہنی زبان والے آہن گر، کلیں اور مشین بنانے والے صنعت کار، سیاست میں سب کچھ جائز تصور کرنے والے لٹیرے انگریز!

میری چاند سی ملیح صورت۔

میری شام اودھ جیسی گھنیری زلفیں۔

صبح بنارس جیسا میرا وجیہہ مکھڑا۔

فرنگی کو تابِ ضبط نہ رہی، دو قدم آگے بڑھا۔ میری جانب محبت کا ہاتھ بڑھا ہی دیا۔ میں شرما رہی تھی — لجا رہی تھی۔ اس کا اکھڑا لہجہ کانوں کو بار تھا اور اندازِ گفتار سماعت پر بھاری مگر مصلحت۔ میرا اپنا عاشق بے رنگ و بے جذبات انسان اظہارِ محبت کرنے لگا۔

"ویل انڈیا کا اردو لینگویج، بہت لولی ہے کمپنی بہادر اردو کو سرکاری لینگویج بنانا مانگتا۔"

فورٹ ولیم کالج میں میر چہیتے جمع تھے۔

اس وقت تو میں مارے شرم کے زمین میں گڑی جب

کسی دیدہ دلیر نے مجھے جانچا، میں خود کو مکمل خیال کرتی تھی مگر یہاں تو خامیاں باقی تھیں۔ دوشیزہ اردو کا دامن نثر سے خالی تھا۔ جو تھی وہ فارسی بیگم سے مستعار لی ہوئی تھی۔ بے عیب خدا کی ذات تھی، انگریز بوالہوس تھے۔ غرض کے بندے مجھے جدید نوک پلک سے سنوارنا ان کا پیار نہیں تھا وہ تو ان کی تجارتی غرض تھی۔ طوطا مینا، حاتم طائی گل صنوبر اور طلسم ہوشربا جیسی بھاری بھرکم لغو داستانیں میرے پلّو سے باندھ دیں۔ بڑا ناگوار گزرتا تھا شروع شروع، کہاں خلوں اور بارہ دریوں میں سبک خرامی کرنے والی عاشقوں کے دلوں سے محبت کے نغمے بنکر پھوٹ نکلنے والی نرم و نازک میں جو لطیف جذبات کی آئینہ دار تھی۔ لطافت جس کی گھٹی میں پڑی تھی وہی میں منشیوں کی عدالتی کارروائیوں، بنیوں کے حسابات اور بھاری وادق تاریخ و جغرافیہ کے چکر میں پھنس گئی۔

دنیا نہ دیکھو تو کائنات ننھی سی لگتی ہے۔

محلوں اور محفلوں کی جان رہی تب تک کچھ پتہ نہ تھا انگریزی میم کو دیکھا تو اس کی گٹ پٹ بری لگی تھی۔ مگر قریب سے دیکھا تو جانا کہ ہائے میں تو یونہی رہی۔ یہ لوہا کوٹنے والے گورے لوہار میرے دامن میں لفظوں، استعاروں اور تشبیہات کے ستارے تو نہیں ٹانک سکتے تھے مگر تھے تو عاشق ہی چاہے بوالہوس تھے۔ بڑی بڑی دیو ہیکر کلیں تحفے میں لائے تو پتہ چلا کہ یہ انگریزی میم کیوں مٹک مٹک کر چلتی ہے۔ مل کر اس سے سہیلیاپا جوڑ کر بیٹھی تب پتہ چلا کہ اس کے پاس تاریخ ہے، ہیئت ہے، علم ہندسہ ہے۔ فلسفہ ہے ٹیکنالوجی ہے علم الجراحت ہے علم الحیوان ہے۔ میں نے سیدھے سبھاؤ اپنی کم مائیگی کا اعتراف کر لیا۔

گوری میم جیسی نک چڑھی دکھائی دیتی ہے ویسی تھی نہیں۔

میں تو غلام تھی مگر گورے عاشقوں کی کمی نہ تھی — مشاعروں میں شریک ہوتے، شعر کہتے، کتابیں لکھتے لکھواتے عالموں کو نوازتے، تعلیم عام کر دی۔ میں ہی تھی ذریعہ تعلیم میں ہی تھی رابطے کی زبان۔

غلامی میں پنپتی رہی۔ خودرو بیل کی طرح میرے پاس علم و عمل کا خزانہ بڑھتا جا رہا تھا۔ انگریزی میم کی معیت میں اس کی دیکھا دیکھی میں بھی اپنے طور اطوار بدلنے لگی۔ میرا رنگ و روپ اس موقع پر کچھ ایسا تھا:۔

"پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام
کی بول چال کے ـــــ مطابق واسطے صاحبانِ
نو آموز کے تحریر کر چکا۔ اس داستان شیریں
کو کہ فی الحقیقت قصۂ خیریں سے شیریں تر ہے
اس رویئے سے نثر کروں کہ زبان دان عشق
عشق کریں اور یہ ہمچران رہتی دنیا تک
یادگار رہے۔" ـــ یا ـــ
"یہاں کی ہر بستی میں گہما گہم جا بجا ایک نئی طرح
کا عالم ہر شہر و قصبہ میں ستھری پاکیزہ پختہ متعدد
سرائیں مسافر کے واسطے ہر قسم کے اوڑھنے
بچھونے و اقسام کی غذائیں ـــ بڑے بڑے
دریاؤں میں کشتیاں نواڑے بیشمار شاہراہوں
کے ندی نالوں پر پل بے شمار۔"

یہ قافیہ پسندی میرے حسنِ ظاہر میں ایک کجی تھی۔ میں گویا طاؤس تھی جس کے پاؤں بدنما تھے۔ اکثر رنجیدہ رہتی تھی۔ مگر!

میرے عشاق مشاطگی فن کی ریاضت کیساتھ شب و روز میری نوک پلک سنوارنے میں مصروف تھے۔ چھاپے خانوں اور رسائل نے مجھے نئی زندگی عطا کرنی شروع کر دی تھی۔

میرا بوڑھا عاشق جو ہنوز جوان تھا۔ مجھے اپنے عودِ ہندی سے مہکا چکا تھا۔ پہچانا آپ نے وہی غالب جو زندگی بھر مجھ پر غالب رہا۔ آج بھی غالب ہے۔ ہمیشہ تا ابد غالب رہے گا۔

کس کس کا نام لوں۔

سرسید، شبلی، نذیر احمد، میر ناصر، مولوی سید احمد، راشد الخیری، حسن نظامی۔ ادھر اودھ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، ہادی رسوا، سجاد حسین جیسے کامل میری زلف دراز کے اسیر ہو چکے تھے۔ میں مالامال تھی۔ آتش و ناسخ۔ انیس و دبیر، پہلوان تھے۔ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہے۔ جو جیت جاتے میں اسی کی ٹھہروں مگر میں تو سب کی تھی۔ جو میرے قریب آنے کے لائق ہو۔ اس کی بھی اور جو نہ قریب آنے کے لائق ہو۔ اس کی بھی۔ ہر ایک کی محبوبہ چاہے وہ فرہنگ آصفیہ کا مؤلف ہو یا پھر نخاس کا گنڈیری والا یا گھر گھر خط بانٹنے والا لڑکیہ۔

میرا نیا روپ، نیا ادب :۔

میرے جوبن میں ترکیب و معانی کی دلکشی اب مادرِ ہند کے پیاروں نے مجھ میں بھر دی۔ صہبائے خیال کے نشے میں چور تھی۔ مگر وائے ہوس! اور پانے کی ہوس ابھی میرے لئے تنگنائے ادب بقدرِ ظرف نہ تھا۔ ابھی تو میرے بیان کے لئے اور وسعت درکار تھی اور گیرائی کی ضرورت تھی۔

میں اردو ہوں لشکر ـــ ایک سمندر جس کا شکم کبھی پُر نہ ہو۔

نئے اسالیب کی تلاش تھی مجھے، نیا اسلوب جسے کوئی خونِ جگر سے جنم دے! محمد حسین آزاد، آہ! یہی نکلا میرا محبوب قلمکار میرا مزاج بدل گیا۔ میری روش بدل گئی۔ انشاپردازی کی نئی لہر۔ ایک نیا فیشن، مگر میرے دوسرے چاہنے والے بگڑ گئے۔ یہ خبطی دوشیزہ اردو کو بدنما کر دیا۔ سرسید آڑے آئے، آزاد کی ہمت افزائی کی۔

نئی قدروں کے لئے میدان ہموار ہو رہا تھا۔
سرسید کا علی گڑھ کالج۔



سر سید احمد خاں

جہاں میں اور فرنگی میم اطمینان اور سکون سے رہ رہی تھیں۔ یہ گہوارۂ علوم، رومانی تحریک کا مرکز بنا۔ مخزن میرے شیدائی عبدالقادر چلا رہے تھے۔ علی گڑھ سے ایک ہوا چلتی اور مخزن کے ذریعہ مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتی۔ علی گڑھ کے میرے عاشق جذبِ صادق تھے۔ فرنگی میم کی معیت میں رہتے ہوئے رومانی، شہوانی نفسیانی، سوقیانہ جمالیات، سیاست، مذہب سب باتوں میں کھل کر اظہارِ رائے کرنے لگی تھی۔ سرسید میرا عاشق صادق تھا مگر دو محبوبائیں مباح سمجھتا تھا پہلے میں اس سے ناک چڑھاتی تھی۔ پر اب سوچتی ہوں کہ انگریزی میم سوکن بن کر نہ آتی تو میں کیا ہوتی!۔

حالی نے مسدس اور یادگارِ غالب حیات سعدی دیکر مجھے سوانح عمری اور پیغامیہ شاعری دی۔ نذیر احمد نے قرآن کریم کا ترجمہ قانون کی کتابیں اور بچوں، عورتوں

نے لئے اصلاحی موضوع کے علاوہ ایک اور چیز دی جو مجھ نگوڑی نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ "ناول" نذیر احمد نے یہ شے انگریزی میم سے مانگ کر مجھے دے دی تو ہر طرف واہ واہ ہو گئی۔

ذکاء اللہ!

ہائے میرا دلدادہ مگر کتنا خشک طبع، ریاضی، تاریخ سوانح، سیاست اور جانے کیا کیا تحفے لئے میرے جلو میں پھرتا تھا۔ پھر محسن الملک تھا۔ تہذیب الاخلاق کا مقالہ نگار، سرسید کا دستِ راست۔ مولوی چراغ علی، عبدالحلیم شررؔ کا بادشاہ، نذیر احمد نے مجھے خیالی اور نابختہ ناول دیئے تھے مگر شررؔ نے تاریخی موضوع کے مزے دار ناول پیش کئے۔ میری خوشیوں میں اضافہ کیا۔

میرے یہ جاں نثار، میرے متوالے

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

ابراہیم ذوقؔ جیسے عالم کا شاگرد، نواب مرزا داغ قلعۂ معلّٰی کا پروردہ، بیگماتی ٹکسالی بولی کا ماہر، روزِ اول سے ہی میرے نام لیواؤں میں سے تھا۔ تخلص داغ تھا۔ اور عاشقوں کے دل میں رہتا تھا اور میں خود اس کے دل میں رہتی تھی۔ امیر مینائی، یہ نام زبان پر آتے ہی دل و دماغ ایک عجیب سے بانکپن اور روحانیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ داغ کے رنگ کو آگے بڑھایا۔ مجھے پیار کی چاشنی سے ہمکنار کیا۔ ضامن علی جلال اسی دور میں ہوا۔ میرا یہ دوستدار صنائع، ندرت اور تراکیب کی بندش اس کا خاصہ تھیں اور عقدِ ثریا کا مصحفی میرا جاں نثار دوست و ارادت مند ؎

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

وطن میرا بھارت کی پیاری زمین ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی میرا دامن وطن پرستی اور بچوں کی شاعری سے خالی تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑے بڑے سبق۔

درگا سہائے، سورج نرائن مہر، نوبت رائے نظر، نظم طباطبائی ــــ کس کس کا ذکر نہ کروں، بلا لحاظ، مذہب و ملت بلا لحاظ فرقہ و عقیدہ میرے پرستاروں کے جذبِ صادق میں کبھی کمی نہ آئی

شاد عظیم آبادی جیسا شاعر بھی یاد آتا ہے جو پٹنے میں میرے پیار کی شمعیں جلائے رہا اور بھائی کا فور کے خون دل سوختہ کرتا رہا۔ "نغمۂ الہام" دے کر اس نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ ٹھیک ہے کہ ؎

تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

میں بھی شمع تھی خود جلتی تھی اور پروانے خود جل کر میری ضو فشانی میں اضافہ کرتے تھے۔

ایک اور عاشق ملے، پڑھے لکھے اور جج کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو کر بھی اتنے مشرقی کہ ڈر لگنے لگا، مگر قریب آئے تو ہنسا ہنسا کر رلایا ؎

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

اکبر الٰہ آبادی نے جب یہ بات کہی تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ حامدہ کا نام مجھے دے رہے ہیں۔

نہ میں ہندو نہ میں مسلم :۔

میں اردو ہوں نہ میں بھیلوں اور آریوں کی سنسکرتی ہوں نہ مسلمانوں کی عربی نہ ہندوؤں کی ہندی، میں تو بس اردو ہوں۔ میری زلف کی گھنیری چھاؤں نے ہر ایک کے لئے سکون و طمانیت بخشی ہے۔ ہر ایک کے لئے جو انسان رہا ہے میری محبت بھری آغوش وا رہی ہے۔ عیسائی آئے تو مجھے تعصب و نفرت کا زہر بھی پینا پڑا۔ فرنگی ذہنیت

نے لڑاؤ اور حکومت کرو کا اصول بنایا تو مناظروں اور مباحثوں نے جنم لیا۔

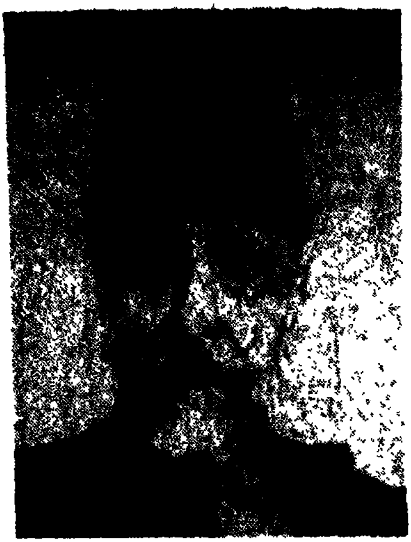
جس طرح تہذیبوں اور قوموں کا ٹکراؤ ہوتا ہے اسی طرح خیالات کی جنگ بھی ہمیشہ نئے نئے کارہائے نمایاں انجام دیتی ہے۔ ہر تہذیب میں تعمیر کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے فرقہ پرستی جنم لے چکی تھی۔ یہ لڑائی آج بھی موجود ہے اِس کی من پسند خوراک ہے۔ یکجہتی اور امن۔ عیسائی مسلم ہندو مسلم، شیعہ سنی، سنی وہابی ہر ایک کی زبان میں تھی ایک نیا موضوع پیدا ہوا، عیسائی پادری، عماد الدین نے اسلام کے خلاف لکھا تو حالی نے اس کا جواب لکھا۔

عیسائیوں نے اسلام کے خلاف کتابیں لکھیں تو مسلمان علماء کب پیچھے رہتے۔ میرا دامن بھر رہا تھا۔ پادری فنڈر پادری آتھم، رام چندر، مرزا غلام محمد قادیانی اور سوامی دیانند سب مختلف الخیال میرے سائے میں آئے، دیانند کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" چاہے جس کے خلاف ہو میرے دامن میں ایک بے پناہ ادبی و تحقیقی گوہر ہے۔

یہی نہیں، دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ میرے جاں نثاروں میں سرشار، شرر، محمد علی طیب، کشن پرشاد، عباس حسین ہوش، مرزا محمد سعید اور جانے کتنے لوگ تھے جو منظرِ عام پر نہیں آئے مگر میرا دل ان کے تئیں محبت سے لبریز ہے۔

جنگ اور میں :-

جب جب انسانی تہذیبیں آپس میں ٹکرائی ہیں اور کائنات خون کے آنسو روئی۔ میرا دامن لالہ زار ہوا ہے جیسے عطر کی شیشی مہر بند رہے تو اس کا حسن و قبح معلوم نہیں ہوتا مگر جب وہ ٹوٹتی ہے، ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے تو خوشبو چہار جانب پھیلتی ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی قومیں آمادۂ پیکار ہوئیں تو اس کا اثر بھی میری سرزمین پر ہونا لازمی



مولانا ابوالکلام آزاد

امر ہوا۔ اب تک دنیا کی بیشتر اقوام مادہ پرستی اور "سب یہیں ہے" کے نظریات سے متاثر ہو چکی تھیں۔ میری زمین پر مگر ایک اور اثر ہوا۔

انگریزوں کے تئیں بیزاری کا رجحان روز بروز ترقی پانے لگا۔ میری زمین بلادِ ترکیہ کے معاملے میں تحریکِ ترکِ موالات کا مرکز بنی۔ اشتراکیت کا اثر، ایک نیا خیال۔ اللہ اللہ کسان مزدور بھی ایک پرچم تلے آنے کو تیار ہو گئے۔

بیداری، آزادی کی کروٹ، لیجئے میرے دامن میں جیسے اب کمی تھی۔ میں سیاست کی چیز بنی۔ ہندوستانی قوم پرستی کی سب سے بڑی مبلغ میں تھی۔ مغربیت کی سب سے بڑی مخالفت کرنے کے لئے مجھے اکسایا گیا ورنہ زبان ان باتوں سے ماورا ہوتی ہے۔ لیجئے خطابت ایک نیا موضوع، مولانا محمود الحسن دیوبند والے اور فرنگی محل والے مولانا عبدالباری مجھے اس مجمع میں گھسیٹ لائے۔ ابوالکلام



مولانا
محمد علی جوہر

حسرت موہانی، ظفر علی اور محمد علی جیسے فرزندانِ ادب اور کشتگانِ اردو میرے چمن میں آبیاری کرنے آئے۔ کارل مارکس اور مغربیت کے خلاف عالمی تاثر دینے والے عالموں کے خیالات مجھ میں در آئے۔ جامعہ ملیہ قائم ہوا۔ میرا نیا گھر جہاں رہ کر مجھے سیاست کی رانی بننا تھا۔ ابو الکلام نے "الہلال" جاری کیا جس کے ذریعے مجھے ہیوگو والٹیر، الیگزینڈر ڈوموز، روسو، گوئٹے اور چیخوف کی شکلیں دیکھنے کا موقع ملا جو میرے نہیں مگر میرے اپنے ہی لگتے تھے۔

نیاز فتحپوری، سجاد انصاری، سلیمان ندوی، حبیب شیروانی کے قلم کی نیرنگیاں، عظمت اللہ اور اختر شیرانی حفیظ جالندھری ایک نئی روحانیت لے کر آئے، کانگریس والے مجھے گاؤں گاؤں اپنے جلو میں لئے پھرتے۔ میرے الفاظ جوابِ جادو بیانی میں ثانی نہ رکھتے تھے۔ روحِ بیداری پھونکنے کا منصب سنبھالے ہوئے تھے۔ مجھے از راہِ یکجہتی پھر سے ہندوستانی کہنے لگے، مجھے برج رانی والے قالب میں دیکھنے کے آرزومندوں نے ہلکا مگر قوتِ اثر میں اور شدید بنانے کی سعی کی۔ معارف، جامعہ، ہمایوں کارواں جیسے اخبارات جاری ہوئے۔ ادھر عثمانیہ دکن میں انگریزی، فرانسیسی کا سرمایہ میرے اندر بذریعہ تراجم منتقل کرنے کی کوششیں جاری تھیں تو جامعہ ملیہ مجھے تعلیم اور سیاست سے بہرہ ور کرنے میں لگا تھا۔

قومی دھارا اور میں

:— میرا دین و مذہب کچھ نہ تھا۔ میں ہولی، دیوالی، کرسمس، شیو کرشن، محمدؐ عیسیٰ، دیر، حرم سب کو دامن میں چھپائے ہوئے اتحادِ انسانی کی علمبردار بنی ہوئی۔ یہاں تک پہنچی تھی۔ تبلیغِ دین، تبلیغ بت پرستی، تبلیغِ تثلیث اور تبلیغ مادہ پرستی کے ساتھ خمخانۂ تصوف و معرفتِ الٰہی سب کچھ دامن میں سمیٹے رہی تھی۔ آزادی کی ہوا چلی تو مذہبی مباحث ختم ہوئے۔ سیاست میں یکجہتی اور ایک قومی نظریہ ابھر آیا مگر ہندو مسلم علیحدگی کے نظریات قائم رہے۔ کبھی ایمان مجھے روکے تھا کبھی کفر مجھے کھینچے تھا۔ خواجہ کمال الدین، مولانا ثناء اللہ، جماعتِ احمدیہ کے مولوی محمد علی اور ابو الکلام نے میرا دامن تھاما ہوا تھا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کو حکیم الامت ہونا تھا۔ دینِ اسلام کی اہمیت واضح کرنے کے لئے انہیں میری ضرورت تھی۔ قرآن کریم کی تعلیمات میرے ذریعہ عام ہونی تھیں۔ حال کو ماضی کے آئینے میں دیکھنے کے لئے میرے روئے زیبا کی ضرورت تھی۔ شبلی، ندوی، عبد الماجد دریا بادی، عبد الباری مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ابو الکلام جیسے میرے عظیم پرستاروں نے مجھے نیا طور، نیا وقار دینے کی کامیاب مساعی کیں۔ میں اسلام کی روح بن گئی۔ اس سرزمین میں عالمانہ متانت کی پیکر، اسلام کی رفعتوں کی علمبردار، اخلاق و فلسفہ کی روح رواں بنی مگر یہیں سے تغیر رونما ہوا میری اسلامی عظمت اور رفعت کا کچھ نے دوسرا مطلب لیا۔

میرا دامن اگرچہ سب کے لئے آج بھی وا ہے مگر مجھے مسلمانوں کی زبان سمجھا جانے لگا۔ میں کبھی کسی ایک کی

ہیں رہی۔ آج بھی یہ دعویٰ برقرار ہے چاہے میرے ...ہ فارسی بیگم کے یکساں پرستار اقبال نے اسلامی تخیل ...فلسفہ، خودی اور قلب مومن کی شدت سوز و دروں سے مجھے ...ہر چند علیحدگی پسند بنانے کی سعی کی ہو، چاہے مجھے تاریخ اسلام ...نے تانوں بانوں میں شدت سے جکڑ دیا گیا ہو، چاہے میں علوم شریعت کی سب سے بڑی مبلغ کیوں نہ بن گئی ہوں۔ ...زبان مگر زبان ہوتی ہے۔ شیخ حرم کی بھی وہی، اور رند خانہ ...خراب کی بھی وہی۔ ایک ہی طرح کے الفاظ ہوتے ہیں۔ سیرۃ النبی کی عبارت ہو کہ رامائن کا ترجمہ۔ عشق الٰہی ہو کہ عشق مجازی۔



علامہ انور صابری

غزل، نظم، مثنوی، مسدس، مخمس، مرثیہ، مستزاد، گیت اور آزاد نظم، یہ انگریزی میم نے دیا ہے۔ بے ردیف قافیے کی نظم مگر جذبات کی آئینہ دار، میرے نئے پرستار، میرے گرجوش، فیض احمد فیض، ن۔م راشد، میراں جی، مجاز احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین، ظہیر کاشمیری، مختار صدیقی، قتیل شفائی، مجید بھٹی، احمد فراز، فارغ بخاری جمیل ملک، جگن ناتھ آزاد، نریش کمار شاد، اختر الایمان، شاذ تمکنت، شاد عارفی، راجہ مہدی علی خاں، مخمور جالندھری مجید لاہوری، شور علیگ، وزیر آغا، مصطفیٰ زیدی، قیوم نظر، یوسف ظفر، قتیل شفائی، ابن انشاء، روش صدیقی انور صابری، بسمل سعیدی، مخمور سعیدی، کمار پاشی، سلام مچھلی شہری، کرشن موہن، مہیش چند نقش۔

اور اب کچھ اور نام:-

شکیل بدایونی، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری،

❊ ❊

میری نئی شاعری :- عشق کا تذکرہ

ہو اور شاعری کا خیال ذہن میں نہ آئے ناممکن! مگر اب وقت بدل چکا تھا عشق کے آداب بھی بیش و کم بدل چکے تھے۔ سائنس بڑھتی جا رہی تھی۔ سائنس جس کے بارے میں پہلے سنتی تھی تو سوچتی سودائیوں کی باتیں ہیں مگر ریڈیو بن گیا، ہوائی جہاز اڑنے لگے تھے۔ دخانی جہاز سطح بحر کو پایاب کر رہے تھے۔ نت نئی تبدیلیاں، طبائع میں تبدیلی مزاجوں میں تبدیلی طرز فکر اور طرز معیشت میں تغیر و تبدل قومیں اقتدار کی جدوجہد میں سائنس کے توسط سے آمادۂ پیکار تھیں، کائنات کے فاصلے قریب آتے جا رہے تھے۔

داغ، احسن، میر حسن، نسیم، شاد، اکبر اور اقبال یگانہ، چکبست، ظفر علی خاں، عزیز لکھنوی، صفی، اصغر حسرت، فانی، رگھوپتی فراق، جگر اور جوش، حفیظ، اختر شیرانی احسان دانش، نظم طباطبائی کے اشعار میرے دامن کو اس افرا تفری کے باوجود اتنا کچھ دے گئے کہ تاقیامت تہی دامنی کی شکایت نہ ہو۔ انگریزی میم اور قریب آ گئی۔ اب تو بہن کا سا رشتہ ہے۔ باوجودیکہ انگریز حکمراں نہیں رہا۔ میری



شکیل بدایونی

ساحر لدھیانوی، جمیل الدین عالی، تنویر نقوی، معین احسن جذبی، الطاف مشہدی، عبدالحمید عدم، ماہر القادری سردار جعفری، عروج زیدی، غلام ربانی تاباں، زہرہ نگاہ اختر الایمان، جاں نثار اختر، آنند نارائن ملاّ، مہندر سنگھ بیدی سحر، ساغر نظامی، ساحر ہوشیارپوری، محسن زیدی، صغیر احمد صوفی، امیر آغا، عالم فتحپوری، نشور واحدی، پیام فتحپوری، نذیر بنارسی، شعری بھوپالی، کیف بھوپالی، واجد سحری، ضیاء امروہوی، عزیز الہ آبادی، افسر جمشید، شاہد پرویز، جمیلہ بانو، درشن لال زلفی، غرضیکہ اتنی بڑی فہرست ہے کہ طولِ شبِ فراق سے بھی زیادہ طویل ثابت ہو۔ ان میں اس دور کے عاشقانِ اردو کے نام شامل نہیں ہیں۔ جب علاّمائیت زوروں پر تھی۔ جیسے سیماب سائل، کیفی، مخمور، وغیرہ۔ ان استادوں نے بھی کماں مایہ خدمات انجام دی ہیں۔ ہائے یہ لوگ! صاحب دل لوگ جن میں کوئی غزل گو ہے کوئی سب کچھ کہتا ہے، کوئی ترقی پسند ہے تو کوئی قدامت پسند (تنزل پسند کہنے کو جی نہیں چاہتا)۔

✗ ✗

میں اور طنز و مزاح :۔ گلابی اردو!

ملا رموزی، ہنستے ہنسانے گلنار ہو جاتی ہوں۔ اس مشینی دور میں تبسم کتنی گراں مایہ شے ہے مگر بہرحال عنقا نہیں ہے۔ میرے پاس سب کچھ ہے، فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، مشتاق یوسفی، محفوظ علی، سالک، چراغ حسن حسرت یعنی سند باد جہازی امتیاز علی تاج، چچا چھکن والے، غلام احمد فرقت، فکر تونسوی شفیق الرحمٰن جیسے کئی اور ہیں جو ہنسی ہنسی میں باتوں کی برچھیاں چلاتے ہیں لوگ زخمی ہوتے ہیں پھر ہنستے ہیں عجب انداز ہیں۔

میرے ناول میرے افسانے :۔

کوئی یہ سمجھے کہ میرے پاس ناول اور افسانے نہیں ہیں ہندی بہن، بنگالی بہن، ملیالم، تامل، اڑیا، پنجابی تو خیر کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ چاہوں تو انگریزی اور فرانسیسی اور رشین، اطالوی یا جو بھی سامنے آئے، آنکھ ملا کر بات کر سکتی ہوں۔ میرے پرستار پریم چند، یلدرم، سلطان حیدر جوش، نیاز فتحپوری، پنڈت سدرشن اور پھر علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر، ل احمد، خواجہ حسن نظامی، ایم اسلم، قیسی رامپوری، شاہد احمد، مسز عبدالقادر، فضل حق، بلقیس جہاں، عظیم بیگ چغتائی، حجاب امتیاز علی۔

اور پھر ایک اور بڑی کھیپ :۔

سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، کرشن چندر، بیدی، عصمت،

حیات اللہ، اختر رائے پوری، مظفر، صادق الخیری، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، اختر انصاری، سہیل عظیم آبادی، حسن عسکری، دیویندر ستیارتھی، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں، بلونت سنگھ، انور عظیم، جیلانی بانو، عفت موہانی، واجدہ تبسم، مہندر ناتھ، سلمیٰ صدیقی، ابراہیم جلیس، رام لال، کشمیری لال ذاکر، م۔م۔ راجندر، چمن لال کاوش، موہن یاور، حامدی کاشمیری، کرشن گوپال عابدی، رویندر سنگھ، سدرشن بالی، رتن سنگھ، عنوان احمد صدیقی، شاہد پرویز، عارف مارہروی، انیس مرزا، اختر عادل، روپ، ابن سعید، شکیل جمالی، زکی انور، ساتھی، قیاس علی سے لے کر اے۔ آر۔ خاتون، نادرہ خاتون، رضیہ بٹ، لطیف گل، ضیا عظیم آبادی، وحشی مارہروی، عادل رشید، گلشن نندا جیسے قلم کے دھنی میرے جاں نثار میرے دامن میں افسانوں اور ناولوں کے ذخیرے جمع کرتے آرہے ہیں یہ مذکورہ بالا چند نام ہیں۔ اصل فہرست اس قدر طویل ہے کہ ہمارے صفحات ناکافی ہوں۔

میرے نقاد اور محقق :-

فنکار فن کی تخلیق کرتا ہے۔ خونِ جگر سے کا تزئین فن کرتا ہے۔ ناقد حسن و قبح پر نظر رکھتا ہے، یہ فن سے بھی زیادہ ذمہ داری اور لیاقت کا کام ہے۔ نقاد ذاتیات اور سطحیت سے بالاتر ہوتا ہے۔ ہر اچھی زبان کے پاس تاریخ، فلسفہ، روحانیت، اخلاقیات جیسے ادبی موضوعات کی دنیا آباد ہوتی ہے مجھ میں یہ سب کچھ ہے، ہر ترقی پسند ادب میں نقاد اور محققین کو ایک خاص درجہ حاصل ہوتا ہے۔ میرے نگار خانے میں پورا گروہ ہے جس کی باریک بینی نے مجھے لطافت گہرائی اور شعور بخشا ہے۔ مجنوں گورکھپوری، صلاح الدین احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، مالک رام، علی سردار جعفری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، وزیر آغا



اثر لکھنوی

علی جواد زیدی، وقار عظیم، احسن فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، اسلوب انصاری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث، ڈاکٹر یوسف حسین، پروفیسر گیان چند، گوپی چند نارنگ، شارب ردولوی، نثار احمد فاروقی، ظ۔ انصاری، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، جیسے بیدار مغز ناقد و محقق میرے آرائش جمال میں مصروف تھے اور ہیں۔ مگر یہ بات بہت افسوسناک ہے کہ آج کا ناقد مکمل طور سے غیر جانبدار نہیں ہے جب کہ ہونا چاہئے۔ مجھے تو سب کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔

آپ نہ مانیں گے :-

میرے بہت سے پرستار بہت سی باتوں کی نفی کرتے ہیں اگرچہ وہ حقیقت ہوتی ہے۔ آپ مانیں تو بتاؤں کہ یہ جو قتل و غارت گری جرائم اور خوف کی لرزہ خیز داستانیں اور جاسوسی ادب لکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح میری خدمت کرتے ہیں۔ یہ بھی میرے

عشاق ہیں مگر نہ تو ظفر عمر نیلی چھتری والے کو کسی نے مانا اور نہ منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجموں کو سراہا اگرچہ عموی استعداد والے عوام تک میری حلاوت پہنچانے میں ان کا بھی تعاون ہے۔ یہی ماننا چاہیے اس دور میں جب شخصیت پسندی کے اصنام ٹوٹ چکے ہیں تو پھر ابن صفی اکرم الٰہ آبادی، سرور جالسی، عارف مارہروی، انجم عرشی، جمیل انجم، جیسے اچھے مصنفین کو تسلیم کرنا ہوگا۔ ان کی تخلیقات ادبی ملاؤں کی تخلیقات سے زیادہ عوامی ہیں۔ انہیں تو زبان کی ترویج اور بقا میں حصہ لینے والوں میں اگلی صف میں جگہ ملنی چاہیے۔

※ ※

میری صحافت :-

انگریز اپنے ساتھ چھاپہ خانے کا تحفہ لائے تھے۔ فرنگی تسلط کے ساتھ ہی اخبارات و رسائل وجود میں آگئے تھے۔ دلی اخبار، دبدبہ سکندری اودھ اخبار کے ساتھ ہی اس شعبے میں سرعت سے ترقی ہوئی۔

اب تو اس امر پر فخر کرتی ہوں کہ میری صحافت دنیا میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ جسے یقین نہ آئے تو اخبارات کی سرکاری فہرست اٹھا کر دیکھ لے۔ (دل میں کچھ چبھ کر ٹوٹ گیا ہے) اگرچہ میں اب راندۂ درگاہ ہوں مگر پھر بھی بلندی پہ ہوں۔ روزنامے، ہفت روزے، ماہنامے، ڈائجسٹ سہ ماہی، سالانہ ہر طرح کے اخبارات و رسائل جدید ترین طباعت سے آراستہ و پیراستہ دلہنوں کی طرح سجے سنورے جریدے، نظم و نثر، افسانوں، داستانوں، مضامین اور انشائیوں سے مرصع صحیفے میری پیشانی میں قبولیتِ عام کا نور بھر رہے ہیں۔ مقبول ترین عوامی جریدوں میں ھما، ہدیٰ، سبشتان، شمع، بیسویں صدی، روبی، آجکل ادبی جرائد میں شب خون، کتاب، صبا، گگن، واقعات۔ ہفت روزوں میں بلٹز، صدق جدید، اردو زبان حیات اور روزناموں میں ملاپ، پرتاپ، سیاست جدید آزاد ہند، انقلاب، آبشار، ہند سماچار، سویرا، یج اور اردو ٹائمز کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اس جگہ بچارے پرتاپ پر ہنسی آ رہی ہے۔ وہ میں ہی ہوں جس نے اسے قبولیت کے مدارج عطا کئے ہیں۔ ستم ظریف میری زبان میں بڑا کہتا ہے۔ ایسے بھی لوگ دیکھے تھے مجھے، جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دیں گے، کب سوچا تھا۔ یہ تو ہوئی ہندوستان کی کچھ صحافت،

اُدھر پاکستان میں جنگ، امروز، حریت، نوائے وقت جیسے روزنامے اور نقوش، نقش، سیپ، ہم قلم، ماہِ نو الشجاع، سیارہ ڈائجسٹ، اردو ڈائجسٹ، عالمی ڈائجسٹ جیسے اردو کے عظیم جرائد میری عزت میں چار چاند لگاتے ہیں۔ پاکستان! -

جسے میں نے تسلیم نہیں کیا ہے

میں نے تقسیم اور پاکستان کا ذکر جان کر چھوڑ دیا ہے کیونکہ میں اردو ہوں، برصغیر کے وسیع آنگن میں پلی بڑھی ہوں میں بٹ نہیں سکتی، ملک کے دس ٹکڑے کر دو مگر میں تقسیم نہیں ہو سکتی۔ ہواؤں اور خوشبو کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔

مگر اب بات نہیں بنتی :-

اب تک دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے کہ کوئی پاکستان بھی ہے جہاں روزِ اول سے بے چینی ہے بدامنی ہے جہاں کوئی اور حکومت کرتا ہے۔ میں تو اس قدر جانتی ہوں کہ آدمی آدمی پر حکومت کر سکتا ہے مگر زبان پر کوئی حکومت نہیں کر سکتا کیونکہ :

زبان نہ ہو تو احساسات گونگے ہو جائیں۔
خیالات مفلوج ہو جائیں۔
دلوں میں زنگ لگ جائے۔



لن دم توڑ دے۔
مذاہب لاچار ہو جائیں
عقائد کے چراغ گل ہو جائیں۔
سیاست لنگڑی ہو جائے۔
فلسفے خودکشی کر لیں۔

مگر پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ میری ماں، میرا وطن ارباب سیاست بانٹ چکے ہیں۔ میں اپنی بہت وسیع سے یہاں پناہ کر رہی ہوں جبکہ کب کا مجھے دیس نکالا مل چکا ہے۔ میرے عاشقوں کا چولہ بدل کر، میرے نام کے نعرے لگا کر میرے گندم نما جو فروش دوستوں اور علمبرداروں نے، میرے نام کی تجارت کرنے والے بیوپاریوں نے میرے لئے جو پاکستان بنایا تھا وہاں میرا کیسا استقبال ہوا تھا۔ میرے ساتھ وہاں کیسا برتاؤ ہو رہا ہے۔ یہ میں ہی جانتی ہوں۔ پنجابی مجھے نہیں مانتے، سندھی اور بلوچی مجھے نہیں مانتے جو عاشق ہیں وہ مہاجر ہیں خانماں برباد۔

اور یہ بات کہنے کی نہیں ہے

میں اردو ہوں، پراکرت، سنسکرت کی بیٹی ہوں۔ گنگا جمنا کے میدانوں میں میری پرورش ہوئی، رشیوں، منیوں صوفیوں، بادشاہوں، پنڈتوں اور عالموں نے مجھے گودیوں میں کھلایا۔ میری مانگ میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی سب نے لفظوں اور خیالوں کے ستاروں کی افشاں بھری ہے، میرا سہاگ امر ہے، میری عظمت مسلمہ ہے، میرا حسن سدا بہار ہے، میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر سمجھتی ہوں۔
زبان گنگ ہے اور حواس باختہ ہیں۔
دل میں آگ سی لگی ہے۔
کیسے کہوں، کہتی ہوں تو دوسرے ہنسیں گے۔
کیسے کہوں کہ اتنی عظمتوں والی حسینہ اردو کا سہاگ اجڑنے کو ہے۔ یہ رنگا رنگ گلستان اردو اب خزاں رسیدہ ہوا چاہتا ہے۔ نفرتوں اور فرقہ پرستی کی ڈائن طاقتور ہو چکی ہے وہ امن و محبت کی فضا کو اپنی آتشیں پھنکار سے بھسم کئے دے رہی ہے۔ میری عظمتوں اور تقدیس کے پرستار، میرے دامن پر سجدہ کرنے والے مجھے اپنے گھر کے آنگن میں بے لباس کئے دیتے ہیں۔ وفاداروں نے مصلحت کی ردائیں اوڑھ لی ہیں۔ میرے پجاری اپنی دیوی کی پاکیزگی اور تقدس کا سودا مفاد کے بازار میں کئے دیتے ہیں۔

ہاں!
میں برہنہ کھڑی ہوں۔
تعصب کے چوراہے پر، میرے سر سے تاروں بھری

دار صنی نوچی جا چکی ہے۔ میرے نور افشاں چہرے پر سیاہی پوت دی گئی ہے۔ پہچانا! پہچانا مجھے؟ کہ میں مٹی جا رہی ہوں۔ یگانگت مٹ رہی ہے، یکجہتی مٹ رہی ہے، شیرینی مٹ رہی ہے، محبت ختم ہو رہی ہے، روایتیں مٹ رہی ہیں، میرے دوستدار دشمن بن گئے، مسلمانوں کی زبان قرار دے دی گئی ہوں، پاکستان میں بھی لٹ رہی ہوں جس کے گھر والے اسے دھتکاریں تو غیر تو غیر ہے۔

یہ نہیں کہ کسی نے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی محافظ دستہ لیکر آیا، کسی نے بھوک ہڑتال کی، کسی نے چار لاکھ دستخطوں کے ساتھ عرضداشت کی مگر بے سود اردو کو مسلمانوں کے علاوہ کسی اور کی زبان سمجھنے والا ایک بھی رہنما اب تک نہ آیا۔ میری دکانیں سجاتے، کتابیں فروخت کرنے والے اخبار فروخت کر کے محل بنانے والے میری نظمیں، کہانیاں، غزلیں بیچکر دولت کے انبار لگانے والے تاجر، اردو کی ترقی کا دم بھرنے والی انجمنیں اور وہ وظیفہ خوار خادمان اردو و ادب، وہ ادب کے جھوٹے وارث، زبان کی قبر کے مجاور، وہ شہرت کے لئے میری قربانی کرنے والے ریاکار، ہر طرف میرے مٹانے کے درپے گروہ در گروہ نظر آتے ہیں۔

ہر راہنما، ہر صاحب اقتدار مجھ سے ہمدردی جتاتا ہے اردو کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہے مگر کچھ ہوتا نہیں۔ میرے کچھ پرستار وزیر اعظم کے پاس عرضداشت گزارنے گئے صاف فرمادیا: "میں کچھ نہیں کرسکتی"۔ (بمبئی میں کانفرس کے موقع پر اندرا جی کی تقریر) اب کون کرے۔ کچھ نہ ہوگا۔ ثانوی تعلیم کا درجہ بھی دیا جاتے گا۔ پھر بھی موجودہ بالغ نسل کے بعد جب نئی پود آئے گی تب مجھے کوئی نہیں پہچانے گا پھر میں ہمیشہ کیلئے لائبریریوں کے طاق نسیاں میں بند ہوجاؤں گی۔

عبرانی اور سنسکرت اور لاطینی کی طرح محدود نہیں ہوں میں لامحدود ہوں، بے کراں ہوں، میں زندہ رہوں گی برصغیر سے قیامت تک مجھے دور نہ کیا جا سکے گا صرف میرا حلیہ بگاڑنے کی سعی کی جائے گی۔ یہ کوشش آج بھی ہو رہی ہے۔ فلموں میں میری جلوہ فرمائی ہے مگر نام ہندی کا لکھا جاتا ہے۔ کوی اور لیکھک میرے الفاظ سے ہندی لکھتے ہیں۔ میرے استعارے، میری ترکیبیں، میری شوخی میری بلاغت سے اپنی ہندی کی عبارت کو چمکاتے ہیں۔ خود میرے اپنے میرے چہرے پر سیاہی پوتنا چاہتے ہیں۔ میری ایک چاہنے والی خاتون، بھلا سا نام ہے۔ ارے ہاں! عصمت، پچھلے دنوں خفقان جو اٹھا تو ہندی رسم الخط میں اردو لکھنے پڑھنے کی حماقت آمیز تجویز پیش کر بیٹھیں۔ شاید عصمت جانتی ہیں کہ مستقبل میں کیا ہونے کو ہے۔ کوئی مجھے انگریزی میں لکھنے کی صلاح دیتا ہے ارے احمقو! میرا تلفظ ہی تو میرا سرمایہ ہے۔ ش۔ق۔ کہاں سے لاؤ گے، حقیقت کو حکیکت بول کر کیسے لگو گے۔ ذرا ایمان سے بتانا؟

داستانِ غم طویل ہے۔

ہے کوئی جو میرے اجڑے ہوئے روپ میں ایک بار بہاریں بھر دے! ارے غالب کی صدیاں منانے والو! لاکھوں کی لاگت سے نام و نمود کے ذرائع تلاش کرتے والو! تحقیق اور تنقید میں آمادۂ پیکار مفکرو! دانش ورو! فاقہ کش ادیبو! شاعرو! تمہاری عظمتوں کی بلند عمارت ڈھے رہی ہے۔ تم اردو ادب کی شاخوں اور ٹہنیوں سے لپٹے ہوئے ہو اور درخت کی جڑ کٹی جا رہی ہے؟ سوچو! غور کرو ــــ کچھ کرو ــــ نہیں تو ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے اردو زبان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

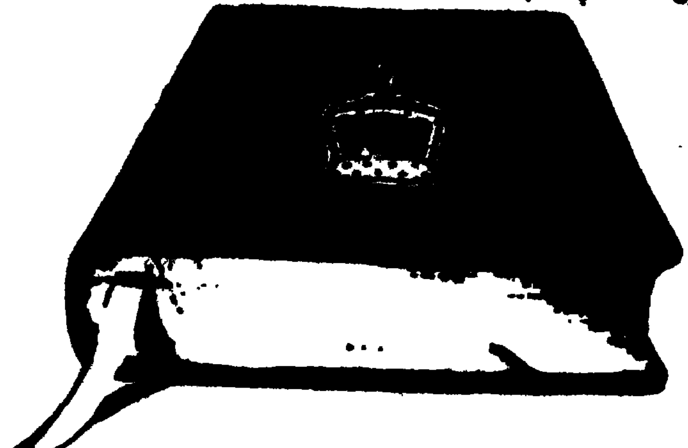
(ہما کے اردو نمبر ۱۹۷۲ء سے)

● ●

نہیں ہرگز نہیں :- میں اردو ہوں، میں

اور بادشاہ ہار گیا

عشق کے ہاتھوں سب کچھ ہارنے والے نے دل کی دنیا میں اپنا پرچم لہرا دیا۔ اس شکست کھانے والے فاتح کی یادیں، اس کے اپنے قلم سے ملاحظہ کیجیے



دوسرے لفظوں میں کوئی مصالحت، کوئی رعایت اور کوئی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس فیصلے سے آگاہ کرنے کے لیے خود وزیراعظم میرے پاس آیا۔ اسی اثنا میں [illegible] کی طرف سے، جو جوابات آئے تھے، ان کی نقل مجھے مل چکی تھی۔ سوال ہی کچھ ایسا تھا کہ سب کی طرف سے یکساں طور پر نفی میں جواب تھا۔ وزیراعظم نے بڑی شائستگی سے مجھے بتایا کہ کابینہ تجویز قبول کرنے سے قاصر ہے۔ اس نے مسترد کرنے کی وجوہ کا خلاصہ میرے سامنے رکھ دیا۔ جو غیر متوقع نہ تھیں۔

یعنی

بادشاہ کابینہ کی رائے کے بغیر کوئی بیان جاری نہیں کر سکتا تھا۔

بادشاہ کابینہ کی رائے کا پابند ہے، جو پہلے ہی دی جا چکی ہے۔

بادشاہ کا خطاب کرنا، رائے عامہ میں اضطراب پیدا کرنا اور عوام کو ان کے آئینی مشیروں سے بالا بالا ابھارتا ہے۔

میں نے جلدی جلدی اس خلاصے کو پڑھا۔ مجھے ان سے اطمینان نہ ہوا، لیکن بات صاف تھی کہ اب بات [illegible]

کی مرضی کے مطابق نہ تھی۔ چنانچہ میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ گویا اب وزیر اعظم جا سکتا تھا، لیکن وزیر اعظم نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پوچھا کہ آیا میں حکومت کو اپنے فیصلے سے مطلع کر سکتا تھا۔ میں نے کہا "مسٹر بالڈون! آپ کو جلد ہی جواب مل جائے گا۔"

اس نے میری طرف نظریں گاڑ کر دیکھتے ہُوئے کہا "جناب، آپ اپنی رائے پر نظر ثانی کریں۔ لوگ آپ کو بادشاہ کی حیثیت ہی سے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

میرا جواب تھا "مسٹر بالڈون! آپ کو جلد ہی فیصلے کا علم ہو جائے گا۔"

شاہ کے طرفدار

رات پڑنے تک میری قیام گاہ "جنگ" کا مرکز بن گئی۔ مجھے ہر طرف سے نصرت و حمایت کے پیغامات آنے لگے۔ فضا پہلے خلاف معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب موافق ہو گئی تھی۔ میری حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی۔ مجھے کہا جا رہا تھا کہ میں ڈٹا رہوں۔ میرے مشیر کہہ رہے تھے کہ مجھے جلد بازی نہیں کرنی چاہیئے۔ ان کے خیال میں عوام میرے ساتھ تھے۔ لیکن خطاب کرنے کی مہلت نہ ملنے کی وجہ سے اب عوامی رابطہ کٹ گیا تھا۔ اب کابینہ سے کھلم کھلا تصادم کا رستہ ہی رہ گیا تھا جسے میں اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سلطنت کے اتحاد کے لئے اب صرف دست برداری کا راستہ ہی باقی رہ گیا تھا اور اس غرض کے لئے میں وزیر اعظم سے مصالحت کرنا چاہتا تھا۔

رات کے کھانے میں مسٹر ونسٹن چرچل میرے مہمان تھے۔ میرے چند اور دوست بھی موجود تھے۔ مسٹر چرچل نے وزیر اعظم کے رویے کو ناپسند کیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مسٹر بالڈون کو اس بات کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ تخت سے دست برداری کا مسئلہ اسی وقت پیش کر دے، کیونکہ دلیس کی طلاق اور دوبارہ شادی کے مسئلے کا وقت ابھی دور تھا۔ ابھی وہ صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جب کہ مجھے اس صورتِ حال سے ابھی دوچار ہونا تھا۔ میں نے مجھے انتظار کرنے کو کہا۔ اس نے مزید کہا کہ شاہی عدالت کی روایت کو اس طرح پامال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں وزیر اعظم کو خط لکھنے اور ایک بیان جاری کرنے کا اعلان بھی کیا۔

مسٹر چرچل کے رُخصت ہو جانے کے بعد میں نے ٹھنڈے دل سے غور کیا۔ میں تاجِ برطانیہ کو تنازعات سے بالاتر رکھنا چاہتا تھا۔ میری تربیت ہی ایسی تھی۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں دلیس اس تصادم کی لپیٹ میں نہ آ جائے۔

ادھر میرے طرفداروں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اخبارات نے ان لوگوں کو شاہی جماعت کا نام دیا۔ کچھ دن تک اس جماعت کا بہت شور و غل رہا۔ برطانیہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ بادشاہ کی جماعت پیدا ہوئی ہو۔ ان کا کوئی رہنما نہیں تھا۔ لوگ از خود ہی مختلف گروہوں میں سڑکوں پر چکر لگا رہے تھے اور "بادشاہ سلامت" "زندہ باد" "بادشاہ کا ساتھ دو" اور "بادشاہ کو بالڈون سے بچاؤ" کے نعرے لگا رہے تھے۔ ان مظاہروں کا اثر آرچ بشپ آف کنٹربری پر بھی ہوا اور وہ بھی اپنی سابقہ رائے پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ نوجوان نسل کا اصرار تھا کہ آخر بادشاہ اپنی مرضی کی شادی کیوں نہ کرے۔ شاید یہ میری ان خدمات کا صلہ تھا، جو میں نے سلطنت برطانیہ کے لئے کی تھیں۔

اس تحریک سے وزیر اعظم پریشان ہو گیا۔ اگر میں نے دلچسپی لی ہوتی، تو اس تحریک کو زبردست تقویت مل سکتی تھی۔ میری اپیل پر مجھے اکثریت حاصل ہو سکتی تھی۔ لیکن کافی سوچ بچار کے بعد میں نے وزیر اعظم سے تصادم کی راہ اختیار نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا۔ ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتا اور یہ بہت بُرا ہوتا۔ سلطنتِ برطانیہ کو میری شادی، بہت مہنگی پڑتی

تاج برطانیہ کا سیاست سے بالاتر ہونے کا تصور ختم ہو جاتا اور جامعتی نظام کو کاری ضرب لگتی۔ ایسی حالت میں مجھے اور ولیس کو خوشی کہاں نصیب ہو سکتی تھی۔

چنانچہ سوچ سمجھ کر میں نے تخت سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں عزت و وقار سے رخصت ہوں گا، در تاج برطانیہ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ میں نے فرض اور محبت میں محبت کو اختیار کر لیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ میں نے شادی اس لئے کی کہ میں نے محبت کی راہ اختیار کی اور تخت سے دست بردار اس لئے ہوا کہ فرض ادا کروں۔ میں نے تاج کو ٹھکرایا نہیں، بلکہ میں نے اس کی اتنی تعظیم کی کہ اسے صحیح سالم چھوڑ دیا۔ میرے اس فیصلے کو میرے عزیز دوستوں نے عظیم قرار دیا اور میری عظمت کا اقرار کیا۔

دوسرے دن صبح میں نے وزیر اعظم کو آگاہ کر دیا کہ میں نے تخت سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس وقت تک مجھے اس سلسلے میں آئینی طریق کار کا کوئی علم نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ عوام حاکمیت کا سرچشمہ ہیں، اس لئے پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور ہو جانے سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا، لیکن میرے دوست والٹر نے مجھے قانونی موشگافیاں سمجھانی شروع کیں۔ اس نے بتایا کہ تخت سے دست بردار ہوتے ہی میں ایک عام شہری بن جاؤں گا اور انگلستان سے باہر ایک غیر ملکی اجنبی ہوں گا اور چونکہ ابھی طلاق کے مؤثر ہونے میں کئی ماہ باقی ہیں، اس لئے میں ولیس سے جدا رہنے پر مجبور ہوں۔ ظاہر ہے کہ جدائی کا یہ طویل عرصہ دونوں کے لئے عذاب ہوگا۔

اس نے مشورہ دیا کہ حکومت سے کہنا چاہئے کہ دست برداری کے قانون کی منظوری کے ساتھ ہی یہ قانون بھی منظور کیا جائے کہ طلاق ۶ ماہ کے بعد مؤثر ہونے کے بجائے فی الفور مؤثر ہوگی اور چونکہ میں کابینہ کی منشا



کے مطابق دست بردار ہو رہا ہوں، اس لئے کابینہ انسانیت کے نام پر میری یہ تجویز بھی منظور کر لے گی۔ اگر ایسا ہو جائے تو میں بلا تاخیر ولیس کے ساتھ شادی کر سکتا ہوں۔ میں نے شکریہ کے ساتھ یہ مشورہ قبول کر لیا۔ بادشاہت سے دست بردار ہونا بھی کتنا مشکل تھا! یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے زیورچ میں مناسب قیام گاہ کے لئے ہدایات جاری کر دیں تاکہ اگر قانون منظور نہ بھی ہو، تو بھی میں وہاں انتظار کر سکوں گا۔

دونوں مسودہ ہائے قانون کا حشر

مشیروں نے حکومت سے "دست برداری" اور "طلاق" کے مسودہ ہائے قانون کے بارے میں سلسلہ جنبانی شروع کر دی۔ شروع شروع میں بظاہر معاملہ بہت خوش آئند تھا۔ وزیر اعظم کے با اعتماد اور قریبی ساتھیوں نے بڑی اُمید دلائی اور میرے مشیر خوش خوش واپس آئے

میں نے بھی افسوس کے ساتھ قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے سمجھا کہ اب معاملہ اختتام کو پہنچنے والا ہے لیکن یہ خوش فہمی تھی۔

مسٹر چرچل نے وزیر اعظم کو اس کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے مراسلہ بھیج دیا۔ اس نے اخبارات کو ایک بیان بھی جاری کر دیا۔ اس میں اس نے لکھا کہ حکومت کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان کسی تصادم کا وجود نہیں۔ پارلیمنٹ کا نہ تو کوئی اجلاس طلب کیا گیا ہے اور نہ ہی اس سے مشورہ کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا بادشاہ صرف کابینہ کے مشورے پر تخت سے دست بردار ہو جائے؟ اس سے پہلے کبھی کسی کابینہ نے ایسا مشورہ نہیں دیا۔

فی الحقیقت بادشاہ نے ایک ایسی خواہش کا اظہار کیا ہے، جس پر عمل تقریباً پانچ ماہ کے بعد ممکن ہے اور بوجوہ شاید کبھی نہ ہو۔ چنانچہ اس مفروضہ پر بادشاہ کو دست برداری اور جلاوطنی پر مجبور کرنا برطانوی آئین سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ صرف پارلیمنٹ ہی کوئی فیصلہ کر سکتی ہے۔ اگر بادشاہ وزراء کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دے، تو انھیں لازماً مستعفی ہونا پڑے گا۔ وزراء کو بادشاہ پر زور دینے کا کوئی حق نہیں۔ انھیں اس بات کا بھی کوئی حق نہیں کہ وہ حزب مخالف سے اندر خانے یقین دہانی حاصل کریں، کہ وہ ایسی صورت میں بادشاہ کے ساتھ وزارت سازی میں تعاون نہیں کریں گے۔

اس وقت حالات خطرناک صورت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اگر کابینہ اور برطانوی قوم نے فراخ دلی کا ثبوت نہ دیا اور ایک محبوب اور لائق بادشاہ کے نجی اور سرکاری معاملات میں اس کی محبت اور فرض کے مابین فرق نہ کیا، تو معاملہ سنگین شکل اختیار کر سکتا ہے۔ کلیسا حسنِ سلوک کی تلقین کرتا ہے اور دعا کی قبولیت پر اعتماد کرتا ہے یہ وقت ہے کہ صبر و تحمل سے دعا کی بار آوری کی توقع کی جائے۔

مسٹر چرچل کی یہ اپیل، ممکن ہے۔ حالات کا پانسہ پلٹ دیتی، لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ میرے لئے واپس لوٹنا ممکن نہ تھا۔ اسی رات وزیر اعظم میرے پاس حاضر ہوا تاکہ دونوں مسودہ ہائے قانون پر تبادلۂ خیال کرے اس نے ذاتی طور پر حمایت کرنے کا یقین دلایا اور یہاں تک کہا کہ اگر کابینہ نے مخالفت کی تو میں مستعفی ہو جاؤں گا اس یقین دہانی پر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔

دونوں مسودہ ہائے قانون تیار کرلئے گئے، لیکن بحث و تمحیص کے بعد کابینہ نے سودا بازی سمجھ کر مسودہ طلاق کو مسترد کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح عوام سمجھیں گے کہ حکومت نے بادشاہ پر دباؤ ڈالا ہے اور یہ صورت منظور نہیں کی جا سکتی اگرچہ فنی طور پر یہ بات درست تھی، لیکن دباؤ تو بہرحال تھا۔ غیر مساوی شادی کی اجازت سے انکار، قوم سے خطاب کرنے کی اجازت سے انکار اور اب مسودۂ طلاق کی منظوری سے انکار اور ادھر بادشاہ کے وزیر کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ مجھے میری خواہش کے مطابق کام نہ کرنے دے۔ اختیارات فی الواقع اس کے پاس تھے۔ وہ حزب مخالف سے سودا بازی کر سکتا تھا۔ پارلیمنٹ کے ارکان کو اپنا حامی بنا سکتا تھا۔ وہ اخبارات پر اثر ڈال سکتا تھا۔ وہ مقبوضات سے اپنے ڈھب کی رائے بھی حاصل کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اپنی پارٹی پر اس کی گرفت اتنی تھی کہ میرے دوست بھی پارٹی کے رکن ہونے کی وجہ سے مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ اس صورتِ حال میں مجھے خاموش ہونا پڑا۔ ایک شہنشاہ پارلیمنٹ کے سامنے کتنا مجبور تھا۔

میں تو خاموش ہو گیا، لیکن میرا دوست مسٹر چرچل خاموش نہ ہوا۔ اس نے اصولی طور پر بادشاہ کو تخت سے دست برداری پر مجبور کرنے کو خلاف آئین قرار دیا۔

وہ پارلیمنٹ میں بے خوف و خطر داخل ہوا اور ابھی تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہی ہوا تھا کہ حزبِ اقتدار نے شور مچا دیا اور اُسے بولنے کی مہلت نہ دی۔ مجھے اس واقعہ پر افسوس ہوا، لیکن مجھے فخر ہے کہ انگریزوں میں سے کم از کم ایک شخص مسٹر چرچل نے تو بادشاہ کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی۔

ناکام سازش

تخت سے دست برداری کا معاملہ اب صرف رسمی رہ گیا تھا۔ وزیر اعظم اور میرے درمیان فیصلہ ہو چکا تھا اب صرف چند گھریلو معاملات کو طے کرنا اور اپنے بھائی جارج کو تخت سپرد کرنا باقی تھا۔ عین اس وقت ایک ناگہانی اُفتاد آ پڑی جسے میں سازش سے کم نام نہیں دے سکتا۔ اس کا مقصد مجھے اس ہستی سے الگ کرنا تھا جس کی خاطر میں نے تخت و تاج کو چھوڑا تھا۔ اس کی بہت سی تفصیلات ابھی تک پردۂ راز میں ہیں، لیکن اس میں میرے عزیز دوست اور بڑے بشپ کلاں حکومت بھی شامل تھے۔

سازش کی ناکامی کے بعد میرے دوست میکس بیور بروک نے انکشاف کیا کہ دوستی کے جذبے سے مجبور ہو کر اس نے اس کارروائی میں حصہ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سلطنتِ برطانیہ کا مفاد اسی بات میں تھا کہ میں تخت پر متمکن رہوں۔ وہ وزیر اعظم سے پرانی دشمنی کا حساب بھی چکانا چاہتا تھا۔ جب ہر قسم کی ترغیب و ترہیب ناکام ہو گئی، تو اس نے ولیس کو اس بات پر مائل کرنا چاہا کہ وہ شادی سے انکار کر دے یہ شادی ملتوی کرانے کی عارضی تدبیر تھی، تاکہ میں تخت سے دست بردار نہ ہوں اور وزیر اعظم بالڈون کا منصوبہ ناکام ہو کر سیاسی طور پر اس کی بدنامی ہو، اور جب میری بادشاہت مستحکم ہو جائے گی، تو پارلیمنٹ کو ہم خیال بنانا مشکل نہیں ہوگا۔

سازش اس رات بنائی گئی، جب ولیس انگلستان سے روانہ ہوئی۔ میرے عزیز دوست پیری براؤن لو، جارج ایلن اور والٹر مانکٹن نے سب سے پہلے ولیس سے رابطہ قائم کرنے کے لئے مجھ سے پوشیدہ ایک ٹیلی فونی تعلق پیدا کیا۔ براؤن لو میرا اور ولیس کا مشترکہ دوست تھا اور اسی کو میں نے ولیس کے ساتھ انگلستان سے فرانس بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لئے اتفاق سے یہ نادر موقع تھا۔ موٹر کار کے ذریعے اس طویل سفر کے دوران پیری براؤن لو نے ولیس کے ذہن میں یہ خیال ڈالا کہ وہ فی الحال شادی کا ارادہ منسوخ کر دے، تاکہ میں تخت پر قائم رہوں۔ چنانچہ ولیس نے حسبِ ذیل بیان جاری کر دیا۔

"میں کوئی ایسا فعل نہیں کرنا چاہتی، جس سے شاہِ برطانیہ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر موجودہ مسئلہ حل ہو سکتا ہو، تو میں ایسی تجویز سے دست کش ہونے کے لئے تیار ہوں، جس نے صورتِ حال کو ناخوشگوار بنا دیا ہے۔"

ولیس نے یہ بیان جاری کرنے سے پہلے مجھے ٹیلیفون پر پڑھ کر سنایا اور میں نے اس کی باریکیوں پر غور کئے بغیر منظوری دے دی۔ میرا خیال تھا کہ اس سے ولیس کی نیک نامی بحال ہو جائے گی، لیکن مجھے قطعاً خیال نہ آیا کہ وہ عہدِ محبت سے منحرف ہونے کی اجازت مانگ رہی تھی۔ دوسروں نے بھی اس سے یہی معنی نکالے۔

اس موقع پر سازش در سازش پیدا ہو گئی — سر ہورس ولسن کو بھی از خود ایسا ہی خیال سوجھا۔ اس نے ولیس کے وکیل کو، جس نے طلاق کا مقدمہ جیتا تھا، ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ کیا کیا باتیں ہوئیں، تفصیل سے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ اس نے مجھ سے ولیس سے ملاقات کرنے کی اجازت مانگی، جس سے میں نے انکار کر دیا۔ وکیل دوبارہ سر ہورس

ولسن سے ملا، جس نے اُسے ولیس کا مذکورہ بالا بیان دکھایا اور پوچھا کہ کیا اس سے ولیس کا انکار واضح نہیں ہوتا؟ وکیل نے جواب دیا کہ ہاں اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے۔ سر ولسن نے وزیراعظم سے مشورہ کیا جس نے وکیل کو طلب کر کے کہا کہ وہ ولیس کے پاس جائے اور اس کا صحیح منصوبہ معلوم کرے۔ وزیراعظم نے اپنا ہوائی جہاز پیش کیا اور تمام ضروری انتظامات کرا دیئے جارج ایلن نے مجھے اس صورتِ حال سے خبردار کر دیا۔ میں نے ولیس کو ٹیلی فون کے ذریعے وکیل سے ملنے اور اس کی کوئی بات سننے اور ماننے سے منع کر دیا۔ اُس نے کہا کہ نہ ملنا تو خلافِ مروّت ہے، تاہم میں آپ سے پوچھے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گی۔ مجھے کچھ اطمینان ہو گیا۔ لیکن مجھے اتنا پتہ نہ تھا کہ میری محبت میرے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے اور یہ کہ جس طوفان نے ہم دونوں کو لپیٹ میں لے لیا تھا، اس نے اُسے ڈرا دیا تھا۔

وقت گذرا جا رہا تھا۔ مجھے بہت سے معاملات نپٹانے تھے۔ خاندانی جائداد کا مسئلہ طے کرنا تھا اور خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے بہت سے امور انجام دینے تھے۔ چنانچہ کافی دنوں کے بعد میں اپنے خاندان کے افراد سے ملا۔ میں انہی کاموں میں مشغول تھا کہ اطلاع ملی کہ وزیراعظم مجھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ اب کون سی بات رہ گئی تھی۔ وہ پارلیمنٹ میں تقریر کرنے سے پہلے مجھ سے آخری ملاقات کرنے آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی تھک چکا تھا اور میری تخت سے دست برداری کا اس پر بھی گہرا اثر پڑا تھا۔ بہرحال ملاقات کے بعد وزیراعظم واپس چلا گیا۔

دوسرے دن جب میں اُٹھا تو میں سمجھتا تھا کہ طوفان گذر چکا ہے، لیکن نہیں ابھی پریشانی باقی تھی۔ وزیراعظم کے احکام کے مطابق ولیس کے وکیل نے بات کی اور ولیس نے اس کی موجودگی میں مجھے ٹیلی فون کیا کہ اگر میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا، تو وہ مجھے چھوڑنا چاہتی ہے اور یہ کہ اب وہ فرانس سے کسی اور ملک میں چلی جائے گی اس پر میں نے اسے بتایا کہ موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ دست برداری کے کاغذات مکمل ہو چکے ہیں۔ پارلیمنٹ میں اسی وقت اسی مسئلے پر بحث ہو رہی ہے اور تم جہاں چاہو، چلی جاؤ، میں تمہارا پیچھا کروں گا۔ میرے اس آہنی عزم کے سامنے ولیس کے وکیل نے شکست قبول کر لی۔ چنانچہ اس نے وزیراعظم کو اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیا کہ بادشاہ کے مصمم ارادے کے سامنے ولیس مجبور ہے، ورنہ وہ شادی ختم کرنے پر آمادہ تھی میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

وزیراعظم نے رسمی طور پر مجھ سے درخواست کی کہ میں اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کروں۔ میں نے جواب لکھوایا۔

"بادشاہ سلامت کو وزیراعظم کا مراسلہ ۹ دسمبر ۱۹۳۶ء جس میں کابینہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، موصول ہو گیا ہے۔ انھوں نے اس معاملے پر پھر غور کیا ہے اور افسوس کے ساتھ اپنے سابقہ فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

میری طرف سے معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے اپنی والدہ کو تمام حالات سے باخبر کیا۔ وہ اس فیصلے پر ناخوش تھی، لیکن اب جبکہ بات ختم ہو چکی تھی، اُسے افسوس تھا کہ اب شاید کافی مدت تک وہ مجھ سے نہیں مل سکے گی۔

مصیبت کا ایک لمحہ پھر آیا۔ ولیس کا ٹیلی فون پھر آیا اس نے کہا کہ تخت سے دست برداری کسی حال میں نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ پریشان تھی اور میں بھی سخت پریشان۔ اب جبکہ میں تخت سے دست بردار ہو رہا تھا میرے سامنے صرف خلا ہی خلا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ایسا صرف ایسی حالت میں ہو سکتا ہے کہ میں تمہارا خیال ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دوں۔ اس پر وہ سہم

گئی۔ ہمارے درمیان کا خلا ختم ہو گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ چاہتی تھی کہ میں اس کی خاطر تخت و تاج نہ چھوڑوں اُسے اپنی نسبت میرا خیال زیادہ تھا۔

کابینہ کی طرف سے پیغام آیا کہ میں دست برداری کی دستاویز پر دستخط کر دوں اور میرے تینوں بھائی اس پر بطور گواہ دستخط کریں۔ اور چونکہ دس دسمبر ۳۶ء کو جارج کو تخت نشین ہونا تھا، اس لئے میں نے اُسی دن لندن سے رُخصت ہو جانے کا فیصلہ کیا۔

خدا بادشاہ کو سلامت رکھے

دُوسرے وطن ... تا تخت کے

وقت تخت سے دست برداری کی دستاویز سرکاری طور پر مجھے پیش کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی شاہی پیغام کا مسوّدہ بھی تھا۔ دست برداری کی دستاویز کی سات نقلیں تھیں۔ میں نے اپنے بھائیوں کی موجودگی میں دستخط کرنے شروع کر دیئے۔ کمرے میں پُر وقار خاموشی تھی۔ جب میں دستخط کر چکا تو میں نے کُرسی خالی کر دی تینوں بھائیوں نے باری باری دستخط کئے۔ اس پر میرا دل بھر آیا اور میں تازہ ہوا کے لئے کمرے سے باہر نکل آیا۔

وزیرِ اعظم نے مجھے یہ پیغام بھی بھجوایا تھا کہ آیا میں چاہتا ہوں کہ پارلیمنٹ میں تقریر کے دوران وہ کوئی میری حسبِ مرضی بات کرے۔ اس پیغام پر مجھے حیرت بھی ہوئی اور مسرّت بھی۔ میں نے دو باتیں لکھوا دیں ایک اپنے بھائی کے بارے میں کہ بادشاہ کے تعلقات اپنے بھائی سے بہت خوشگوار رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ پوری سلطنت اس کی حامی رہے گی۔ دوسری بات میں نے ولیس کے متعلق لکھوائی کہ اُس نے ... دست برداری کے فیصلے کو ہر ممکن طریقے سے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

وزیرِ اعظم نے دست برداری کی دستاویز پارلیمنٹ



مسٹر چرچل

میں پیش کر دی، لیکن اس نے اپنی تقریر میں میری صرف ایک بات کا ذکر کیا یعنی جارج کا اور ولیس کے متعلق ذکر چھوڑ دیا، جس کا مجھے افسوس ہوا۔ میں نے وزیرِ اعظم کو یہ اطلاع بھی دی تھی کہ میں ریڈیو سے قوم کے نام الوداعی پیغام نشر کرنا چاہتا ہوں۔ اس دوران میں نے نشریہ کا مسوّدہ تحریر کیا۔ رات کو مسٹر چرچل مجھے ملنے آیا۔ جیسا کہ وہ اکثر آیا کرتا تھا۔ یہ الوداعی ملاقات تھی۔ میں نے اُسے اپنا مسوّدہ دکھایا اور اس نے کمال فراخدلی سے اس میں کئی ایک مناسب تبدیلیاں کیں۔ جب میں نے مسٹر چرچل کو الوداع کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

میں اپنا سامان وغیرہ باندھ رہا تھا کہ میرا بھائی جارج، مستقبل کا بادشاہ، الوداعی ملاقات کے لئے میرے کمرے میں آ گیا۔ ہم دونوں کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ میں نے اُسے تسلّی دی کہ تم ان ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکو گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس پر

اس نے پوچھا کہ اب مجھے کس خطاب سے یاد کیا جائے۔ میں حیران ہو گیا۔ میں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ پھر کہا ظاہر ہے "شہزادہ" اس پر اس نے کہا کہ وہ مجھے ڈیوک آف ونڈسر کا خطاب دے گا اور بادشاہ بننے کے بعد میرا یہ پہلا کام ہو گا۔

دست برداری کے بعد میں نے افرادِ خاندان کے ساتھ مل کر کھانا کھانے کا پروگرام بنایا اور اس کے بعد قوم کے نام الوداعی پیغام نشر کرنے کا انتظام کیا۔ میں نے ویلیس کو ٹیلیفون کیا۔ اس کے ایما پر میں نے ویانا جانے کا پروگرام بنایا، جہاں ہمارے مشترکہ دوستوں کا قیام تھا۔ ظاہر ہے کہ اپریل ۳۷ء تک ہم دونوں آپس میں ملاقات نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے کسی ایسی جگہ قیام کرنا مناسب تھا، جہاں سے فون پر باہمی گفتگو ہو سکتی ہو۔

اب ونڈسر کیسل سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ میرا سامان باندھا جا چکا تھا۔ ویلیس کا کتا بھی میرے ساتھ جانے والا تھا۔ میں نے اپنی قیام گاہ پر آخری نظر ڈالی اور بھاری دل کے ساتھ روانہ ہو گیا اور قصرِ بکنگھم جا پہونچا، جہاں میری والدہ بھائی بہن اور دوسرے اعزہ میرے منتظر تھے۔ کھانا پر تکلف تھا۔ ابھی ہم کھانے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ریڈیو کا عملہ میرے خطاب کے لئے آ پہونچا۔

جب میں نے اپنے خطاب کا مسودہ وزیرِ اعظم کو برائے اطلاع بھیجا تھا، تو اس نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اس کے تعاون کا ذکر کروں۔ میں نے سوچا کہ اس شخص نے میری خواہش کا احترام نہیں کیا تھا اور ویلیس کا ذکر چھوڑ دیا تھا، میں اس کی خواہش کا احترام کیوں کروں! پھر میں نے خیال کیا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا کرنا بادشاہوں کی شان کے برخلاف ہے۔ چنانچہ میں نے مناسب الفاظ میں ذکر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا۔

"آخرکار آج مجھے چند اپنی باتیں کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اب تک آئینی طور پر مجھے دل کی بات کہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ چند گھنٹے پہلے میں نے تخت سے دست برداری اختیار کر لی ہے۔ میں اپنے بھائی شاہ انگلستان کی اطاعت کا دل و جان سے اقرار کرتا ہوں۔

میری دست برداری کے پس منظر سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایسا کرتے وقت ملک و قوم کا مفاد میرے سامنے رہا ہے لیکن ملک و قوم کی خدمت دل و جان سے کرنا، میرے لئے اس خاتون کے بغیر ناممکن تھا جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ یہ فیصلہ خالصتاً میرا اپنا ہے۔ ورنہ اس خاتون نے تو مجھے اس فیصلے سے باز رکھنے کی آخر دم تک انتہائی کوشش کی تھی۔

مجھے یہ فیصلہ کرنے میں سہولت اس وجہ سے بھی ہوئی کہ میرے بھائی میں بادشاہت کی ذمہ داریاں نبھانے کی پوری صلاحیت ہے اور وہ بڑی آسانی سے میرے پیدا کردہ خلا کو پُر کر سکے گا۔ ان تکلیف دہ ایام میں میری والدہ، افرادِ خاندان اور ارکانِ کابینہ بالخصوص وزیرِ اعظم نے پوری دل دہی کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ میرے اور ان کے درمیان کوئی آئینی اختلاف نہیں تھا۔ میرے والد نے میری تربیت ہی اس طرح کی تھی۔ آج تک آپ نے جس شفقت کا میرے ساتھ اظہار کیا ہے، میں اس کے لئے ممنون ہوں۔

میں آج حکومت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے، واپس وطن آنے میں کچھ وقت لگ جائے، لیکن میں اپنی قوم اور سلطنت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا اور اگر کبھی میری خدمت کی ضرورت پڑی تو میں ہرگز کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔

اور اب ہم سب کو نیا بادشاہ مبارک۔ خدا بادشاہ کو سلامت رکھے۔"

●●

انتہائی سنسنی خیز ناول کا سلسلہ

شورش زادے

رابرٹ لڈلم



کرافٹ اس وقت فون پر سام سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے جو کچھ اُسے بتایا تھا وہ ناقابلِ قیاس تھا۔ کرافٹ کو امید تھی کہ اس کے دوست نے اب تک اس کی ماں سے ملاقات کرلی ہوگی۔ لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ اینی ہوٹل ایکارڈ میں مقیم ہی نہ تھی۔ یہ بہت عجیب بات تھی۔ کیونکہ اینی نے خود کہا تھا کہ وہ ہوٹل ایکارڈ میں اس سے ملاقات کرے گی۔

"تم نے ہوٹل والوں سے پوچھا تھا یا نہیں۔ انہیں ممی کا حلیہ بتایا ہوتا کہ وہ امریکی ہیں، ستر برس کے لگ بھگ عمر ہے، اور۔ ۔ ۔ ۔" کرافٹ نے کہا۔

سام نے کرافٹ کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں نے ہوٹل والوں سے نصف گھنٹے پہلے ہی اس سلسلے میں بات کی ہے۔ انہیں تمہاری والدہ کا حلیہ بھی بتایا ہے۔ یہاں اس ہوٹل میں نہ تو ان کے نام کی کوئی عورت مقیم ہے نہ ان کے حلیے کی کوئی عورت ہی موجود ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہوٹل میں سرے سے کوئی امریکی ہی موجود نہیں۔۔۔"

"مگر انہیں وہیں ہونا چاہیئے۔" کرافٹ نے پریشان ہوکر کہا۔ ساتھ ہی وہ کئی اور باتوں پر بھی غور کر رہا تھا۔ جان، ایرک اور اس کا بھائی شام تک ہوٹل پہونچنے والے تھے۔ اس سے پہلے وہ جنیوا میں کسی اور سے اس سلسلے میں بات بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ہوسکتا ہے اُس کی ماں بھی اسی کی طرح کسی اور ہوٹل میں ٹھہری ہو اور وہاں سے کرافٹ سے اُسی ہوٹل میں قیام کرنے کے لئے کہا تھا۔ ان تمام باتوں کو سوچ کر کرافٹ نے سام سے مزید کہا۔ "سنو یار، استقبالیہ کلرک سے کہو کہ میں نے ابھی ابھی تم سے بات کی ہے۔ میرا نام بتاکر کہو کہ میرے نام کوئی پیغام تو نہیں ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں جنیوا کے قاعدے قانون معلوم نہیں۔ یہاں دو افراد کے درمیان پیغامات کسی تیسرے شخص کو نہیں بتائے جاتے۔ ہوٹل ایکارڈ میں بھی اس اصول پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا۔ ایک ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ایلس باتیں کرتے کرتے رک گیا۔ ٹیلیفون پر دروازے پر دستک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "ایک منٹ کرافٹ، کوئی دروازے پر ہے۔ میں ذرا اس سے نمٹ لوں۔ تم انتظار کرو میں ابھی آیا۔"

کرافٹ نے ٹیلیفون پر دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اس کے بعد باتیں کرنے کی آوازیں ابھریں لیکن کوئی واضح لفظ اس کے کانوں میں نہ پڑا۔ چند سوال و جواب کے بعد قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ کرافٹ انتظار کرتا رہا۔

اور پھر جیسے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ مگر یہ کھانسی کم سوا کوئی اور آواز تھی۔ اُسے یوں لگا تھا جیسے کسی نے چیخنا چاہا اور اس سے پہلے ہی اس کو دبا دیا گیا تھا۔

"سام؟" کرافٹ نے چیخ کر کہا۔ "کیا ہوا سام؟"

دوسری طرف خاموشی طاری رہی۔ پھر قدموں کی آواز ابھری۔

"سام!" کرافٹ پھر چیخا۔ اس کا ذہن بری طرح جل رہا تھا۔ آندھیوں کے جھکڑ پورے وجود میں چل رہے تھے۔ اسے پیٹر یاد آگیا۔ وہ بھی تو اس سے باتیں کرتے ہوئے فون کو کراسی طرح دروازہ کھولنے گیا تھا اور پھر قتل کر دیا گیا تھا۔

"سام۔ ۔ ۔ سام۔ ۔ ۔ کہاں ہو تم؟ کیا ہوا؟" وہ بے تحاشہ چیخ اٹھا۔

دوسری طرف سے کھٹ کی آواز آئی۔ لائن کاٹ دی گئی تھی۔

"اف خدایا یہ کیا ہوا؟" اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ اس نے فوراً ہوٹل ایکارڈ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اُس نے فون واپس رکھا اور روتا ہوا باہر آگیا اور پھر دوڑتا ہوا اپنی کار کے پاس پہونچا۔ آندھی طوفان کی طرح کار چلاتا ہوا وہ ہوٹل پہونچا۔ ہوٹل سے کچھ فاصلے پر اس نے کار روکی اور اتر کر ہوٹل کی طرف بڑھا۔

چند منٹ بعد وہ سام کے کمرے میں تھا۔ کمرہ خالی تھا۔ البتہ اس کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس موسم میں کھڑکی کا

ہوا عجیب بات تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اور پھر اندر کے دیکھا۔ آگے کوئی شخص بہت ہی زخمی حالت میں دھرے گیا تھا۔ کھڑکی کے باہر لوہے کا دائرہ نما صوفہ سی تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر خون کے دھبے صاف نظر آ رہے۔ جو کوئی بھی اندر گیا تھا۔ شدید زخمی تھا۔

"سام، سام..." گرافٹ نے آہستہ سے آواز دی۔

جواب میں خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

گرافٹ بیڈ روم کی طرف لپکا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ اس کی نظریں باتھ روم کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ اس پر خون آلود ہاتھ کے نشانات ہویدا تھے۔ گرافٹ ولی کی طرح اُدھر لپکا۔ دروازہ کھولا اور اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔

اس نے اندر جو منظر دیکھا وہ اتنا ہولناک تھا کہ اس وں میں خون کی گردش رک گئی۔ باتھ ٹب کے کنارے سے کی لاش ٹکی ہوئی تھی۔ اس کی لاش خون میں لتھڑی ہوئی۔ سینے اور پیٹ میں بڑے بڑے سوراخ کھلے ہوئے آنتیں جسم سے باہر آ گئی تھیں۔ اس کے حلق کو انتہائی ی سے کاٹ دیا گیا تھا۔ اور سر کھال کے ذرا سے ٹکڑے دن سے لٹکا ہوا تھا۔ اس بدنصیب کی آنکھیں کرب اور اذیت سے پھیل کر رہ گئی تھیں۔ اُسے کسی پاگل قتل کیا تھا۔

سام کی لاش کے اوپر آئینے پر صابن سے "عقاب" کے ے تھے۔

"تم عقاب نہیں گدھ ہو" گرافٹ کے منہ سے جیسے ایک نکلی اور وہ واپس ہو گیا۔

* * *

سورج غروب ہوئے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا اور ہلدا اس دوراہے سے کٹ کر پہاڑی پگڈنڈی پر ٹارچ کی روشنی رنر کے مکان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ مکان بہت ختوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔

ابھی ہلدا اس مکان سے خاصے فاصلے پر تھی کہ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ دروازے میں ایک بوڑھے شخص کا چہرہ میں نظر آیا۔ جو اسے ہاتھ کا اشارہ کر رہا تھا۔ ہلدا حیران تھی کہ آخر بوڑھے ورنر کو کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ آ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ ورنر کے ساتھ اندر پہنچ چکی تھی۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی اور کمرے میں خوشگوار گرمی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کا فرنیچر پرانا لیکن بہت آرام دہ تھا۔ چند منٹ تک وہ آپس میں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر اس سے پہلے کہ ہلدا اس سے سوال کرتی، بوڑھے ورنر نے خود ہی اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

"میں پانچ برس قبل برلن سے یہاں آیا تھا۔ وہاں میرے ہاتھوں میں زبردست اذیتیں اٹھا چکا تھا اور میں نے یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا کہ ان اذیتوں کو برداشت کرتے کرتے میرا ذہن ماؤف ہو چکا ہے۔ لوگ مجھے پاگل سمجھنے لگے تھے۔ وہ میرا اب بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ یہاں کا ڈاکٹر اب بھی میرا علاج کرتا رہتا ہے۔ اس کا نام لوک ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی تمہیں اس کی مدد کی ضرورت محسوس ہو۔ اس جگہ صرف وہی ایک شخص ایسا ہے جو یہ جانتا ہے کہ میں ذہنی طور پر بالکل صحیح ہوں۔"

"مگر اس کی کیا ضرورت ہے؟" ہلدا نے پوچھا۔

"میں سب کچھ تمہیں بتا دوں گا۔ تم اس بات پر بھی حیران ہو کر مجھے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ تم آ گئی ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرا یہ مکان بہت حساس ہے۔ کوئی بھی شخص چوری چھپے یہاں نہیں آ سکتا۔ کسی بھی سمت سے کوئی بھی میرے مکان کی طرف بڑھے گا تو مجھے اس کی اطلاع ہو جائے گی۔ اب مجھے بتاؤ کہ فالکن پر کیا بیتی تھی؟..."

ہلدا نے جو کچھ اُسے معلوم تھا بتا دیا۔ ورنر خاموشی سے اس کا بیان سنتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے درد و کرب عیاں تھا۔ ہلدا خاموش ہوئی تو اس نے مختصر سا تبصرہ کیا: "یہ لوگ وحشی اور درندے ہیں، یہ لوگ کسی آدمی کو معقولیت سے قتل بھی نہیں کر سکتے۔ لاش کو درندوں کی طرح بھنبھوڑ ڈالتے

ہیں۔"

"میرا خیال ہے ان لوگوں کا تعلق اوڈیسہ سے ہے۔"

"نہیں، یہ لوگ ولف شانزے سے متعلق ہیں۔ یہ لوگ عقاب نہیں، درندے ہیں۔"

"عقاب؟ کیا مطلب؟" وزنر نے حیرت سے پوچھا۔

"جولائی ۱۹۴۴ء میں ہٹلر کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ منصوبہ بنانے والے نہایت شریف النفس اور مشہور فوجی جرنیل تھے۔ وہ ہٹلر کی پالیسیوں کے مخالف تھے جو جرمنوں اور پوری انسانیت کے لئے تباہی کا سبب تھیں۔ وہ صرف اس کی خاطر ہٹلر کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ رومیل نے ان جرنیلوں کو جرمنی کے عقاب کا نام دیا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" ہلدا نے پوچھا۔

"ہٹلر کو قتل کرنے کی یہ سازش ناکام ہو گئی۔ دو سو بارہ افسروں کو جن پر اس سازش میں حصہ لینے کا شبہ تھا اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا گیا اور اس کے بعد ولف شانزے کے اس واقعہ کو ہر قسم کے اختلاف رائے کو ختم کرنے اور مخالفوں کو کچلنے کا بہانہ بنا لیا گیا۔ ان ہزاروں افراد کو جو سیاسی یا فوجی پالیسیوں سے ذرا بھی اختلاف کرتے یا ان پر نکتہ چینی کرتے گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے خلاف جھوٹی شہادتیں پیش کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ حالانکہ ان میں سے بڑی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی، جنہوں نے کبھی ولف شانزے نام کے فوجی ہیڈ کوارٹر کا نام تک نہیں سنا تھا۔ ہٹلر پر قاتلانہ حملے کی سازش میں ان کے شریک ہونے کی بات تو بہت دور کی تھی، رومیل کو اس بنیاد پر خود کو گولی مار کر ہلاک کرنے کا حکم دیا گیا کہ اس نے مزید پانچ ہزار افراد کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جرمنی پر پاگلوں کی حکومت تھی۔ عقابوں نے جرمنی کو انہی پاگلوں سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہی لوگ اصل ولف شانزے ہیں۔ اور وہ جنہوں نے ولف شانزے کو مخالفتوں کے خاتمے کا بہانہ بنایا، نقلی ہیں۔ ہم انہی کے خلاف ہیں۔" بوڑھا وزنر خاموش ہو گیا۔

"ولف شانزے کیا یہی دو رُخ ہیں؟" ہلدا نے دریافت کیا۔

"ہاں، وہ جو ہمارے دشمن ہیں، عقابوں کے دشمن ہیں۔ انہوں نے بھی ہٹلر کو قتل کرنا چاہا تھا لیکن ان کے مقاصد مختلف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہٹلر اپنے مقاصد میں ناکام ہو گیا۔ جس پر ہٹلر کی کمزوریاں واضح تھیں۔ وہ ہٹلر کی جگہ کسی اور زیادہ پاگل شخص کو برسرِ اقتدار لانا چاہتے تھے۔ ان کے منصوبے میں امن کی اپیل کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ مکمل اور بھرپور جنگ چاہتے تھے اور اب بھی ان کا مقصد یہی ہے۔"

"لیکن اگر یہ لوگ ہٹلر کو قتل کرنے کی سازش میں شریک تھے تو وہ بچ کیسے گئے؟" ہلدا نے پوچھا۔

"ان لوگوں نے فوراً ہی ہٹلر کے زبردست وفاداروں کا روپ دھار لیا اور چن چن کر دوسروں کا صفایا کر دیا۔ ان کی خون آشامی ہٹلر کے لئے باعثِ تسکین تھی۔ اس لئے اسے ان کی وفاداری کا یقین بھی آ گیا۔"

"آپ کہتے ہیں کہ دوسری ولف شانزے کے یہ لوگ اب بھی اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے کوشاں ہیں۔ میرے خیال میں تو ان میں سے بیشتر لوگ مر کھپ گئے ہوں گے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے؟" ہلدا نے پوچھا۔

بوڑھے وزنر نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "تو واقعی تمہیں کچھ نہیں معلوم۔ فالکن نے تمہارے بارے میں یہی لکھا تھا کہ تمہیں حالات کا کچھ علم نہیں۔"

"تو آپ کو معلوم ہے کہ میں کون ہوں؟" ہلدا نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں، خوب اچھی طرح۔ تم ہی تو فالکن کے خط پوسٹ کرتی تھیں۔"

"میں ان کے بہت سے خطوط پوسٹ کرتی تھی۔ لیکن نیوشیٹل کے پتے پر کبھی کوئی خط پوسٹ نہیں کیا۔" ہلدا نے کہا۔

"جو خط میرے لئے ہوتے تھے، وہ مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔ ان خطوط میں اکثر فالکن تمہارا تذکرہ بڑی محبت اور

کوشش سے کر رہا تھا، جیسے تم نے پوچھا تھا اس قتل والے نشان سے کہ لوگ اب بھی کیوں کر اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں تو میں تمہیں بتاؤں، ہٹلر کے قتل کی سازش میں اس تنظیم کے جو لوگ شامل تھے ان میں سے بیشتر واقعی مر کھپ گئے ہیں۔ لیکن اب ان کے بچے ان کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں...

"بچے؟" ہلدا نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، اور یہ بچے دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ ہر ملک ہر شعبہ، ہر پیشے اور ہر سیاسی گروپ میں موجود ہیں۔ ہر جگہ یہ لوگ نہایت اثر و رسوخ کے حامل ہیں۔ یہ لوگ ہر ملک میں قتل و غارت پھیلاتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ سب کچھ بہت بڑے منصوبے کی تیاری کے مراحل ہیں۔ اور اس میں سرگرم عمل والف شان نسے کے بچے ہیں جو اب جوان ہو چکے ہیں"۔ بوڑھے ورنر نے بتایا۔

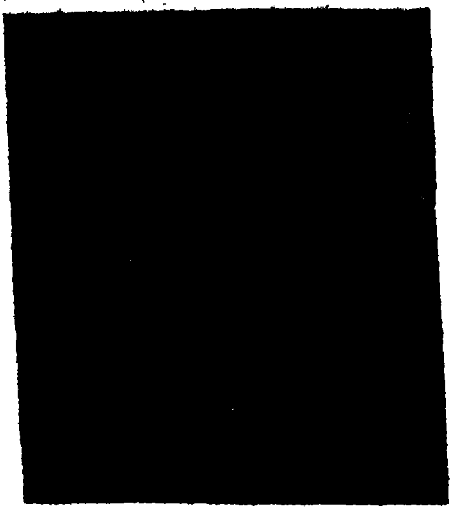
"مگر یہ لوگ آئے کہاں سے ہیں؟"۔

"یہی وہ سوال ہے جس کا جواب تمہارے بہت سے سوالوں کا جواب ہوگا۔ ان لوگوں کے لئے دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں چند انتہائی ذہین افراد نے "آپریشن فرزندانِ شمس" کا آغاز کیا تھا۔ وہ انہیں شورش زادے کہتے تھے۔ جنوری، فروری اور مارچ ۱۹۴۵ء میں چھ ماہ سے ۱۴ برس کی عمر کے ہزاروں بچوں کو جرمنی سے مختلف ذریعوں سے دنیا کے مختلف حصوں میں بھیج دیا گیا تھا..."۔

ورنر ہلدا کو تفصیلات بتاتا رہا اور ہلدا حیرت سے منہ پھاڑے تمام تفصیلات سنتی رہی۔ "اس کے ساتھ ہی ایک اور منصوبہ بھی بنایا گیا۔ مختلف ذرائع سے کروڑوں ڈالر جرمنی سے سوئٹزرلینڈ منتقل کر دیئے گئے اور ایسا انتظام کیا گیا کہ یہ بے شمار دولت تیس برس بعد ان فرزندانِ شمس کے استعمال میں آ سکے۔ یہ منصوبہ تین افراد کے ذہن کی تخلیق تھا..."۔

ہلدا کے منہ سے حیرت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"اور بنیادی طور پر ایک ایسے شخص کی ذہنی اختراع کا نتیجہ



ہٹلر کے قتل کی سازش

تھا جس سے زیادہ معلومات کا ماہر شاید دنیا میں کبھی نہ پیدا ہوا تھا، نہ پیدا ہوگا۔ یہ اسی شخص کی مہارت کا نتیجہ تھا کہ ہٹلر کی حکومت معاشی طور پر مستحکم ہوئی تھی اور جب اس نے دیکھا کہ ہٹلر کی ماتحتی میں جرمنی کی تیسری قیادت ناکام ہو گئی ہے تو اس نے چوتھی قیادت کے قیام کی کوششیں شروع کر دیں"۔

"آپ کی مراد کلاسن سے ہے اور کرافٹ اس کا بیٹا ہے"۔

"ہاں، لیکن اسے ان حقائق کا کچھ علم نہیں۔ وہ محض ایک آلۂ کار ہے"۔ ورنر نے کہا۔

"اور.....؟" ہلدا نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"پھر ایک نوجوان کو ان بچوں کی قیادت کے لئے منتخب کیا گیا جو تمام دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ وہ بہت غیر معمولی بچہ تھا۔ بہت ذہین، بہت خوب صورت۔ ہٹلر کے عہد کے جوانوں کی طرح پُرجوش۔ اس کی کڑی نگرانی کی جاتی رہی۔ اُسے تربیت دی جاتی رہی، اس کردار کے لئے اسے تیار کیا جاتا رہا جو اس کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

"جان۔۔۔اف میرے خدا۔۔۔۔آپ کا اشارہ جان کی طرف ہے!" ہلدا نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، میں جان ہی کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ وان بولٹ کے بیٹے جان کی بات کر رہا ہوں۔ اسی کو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے زندانِ شمس کو اس بے پناہ دولت کے سہارے تمام دنیا پر اقتدار لانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ بے پناہ رقم بھی استعمال کی جائے گی۔ جو جنیوا کے ایک بینک میں جمع ہے۔ اسی وجہ سے جنرل فالکن نے تمہیں اپنے قریب ہونے کا موقع دیا تھا تاکہ تمہارے توسط سے ہم ان کے اصل عزائم کو بھانپ سکیں۔"

"شاید اسی لئے میرے بھائی نے مونیتر یو گاؤں میں مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ اف میرے خدا، وہ میرا بھائی ہے!" ہلدا نے کہا۔

"اس معاملے میں تمہارا اندازہ غلط ہے۔" بوڑھے ورنر نے لرزتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک المناک دن تھا۔ اس روز غلطیوں پر غلطیاں ہوتیں۔ تمہارے تعاقب میں جو دو افراد تھے، انہیں ہم نے بھیجا تھا۔ ہم نے انہیں واضح ہدایات دی تھیں کہ وہ کرافٹ کے بارے میں جو کچھ معلوم کر سکتے ہیں معلوم کرلیں۔ اس وقت تک کرافٹ ہمارے لئے ایک انجانا عنصر تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اس کا تعلق ولف شانزے کے کس رخ سے ہے۔ اگر ہمیں یہ علم ہو جاتا کہ وہ حقائق سے نابلد ہے تو اس کی جان بخشی ہو جاتی اور ہم کوشش کرتے کہ اسے اپنے ساتھ ملالیں۔ اگر معاملہ مختلف ہوتا تو اسے ہلاک کر دیا جاتا۔ اور تمہیں کوئی گزند پہونچنے سے قبل وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کیا اسباب تھے۔ جن کی بنا پر ہمارے آدمیوں نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔"

"اس دن جان نے ہمارے تعاقب میں اپنا ایک آدمی بھیجا تھا۔ وہ اس طرح تم لوگوں تک پہونچنا چاہتا تھا۔" ہلدا نے بتایا۔

"یہی وجہ رہی ہوگی۔ ہمارے آدمیوں نے اس کو پہچان کر یہی سوچا ہوگا کہ کرافٹ، جان سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب ان کے نزدیک یہی تھا کہ کرافٹ نقلی ولف شانزے کا آلۂ کار ہے۔"

"اس میں کچھ غلطی میری بھی تھی۔ جب ان میں سے ایک شخص نے ہجوم میں میرا بازو پکڑا تو میں ڈر گئی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے ساتھ نکل چلوں۔ اس نے جرمن زبان میں بات کی تھی۔ اس لئے میں سمجھی کہ شاید اس کا تعلق اوڈیسہ سے ہے۔"

"ان کا تعلق اوڈیسہ سے نہیں تھا۔ وہ ایک بستی شالاف کے یہودی تھے۔"

ورنر نے ہلدا کو شالاف کے بارے میں مختصراً بتا کر کہا۔ "یہی لوگ ہماری مختصر سی فوج ہیں۔ ہم وہاں ایک تار بھیجتے ہیں اور وہاں سے لوگ روانہ کر دیئے جاتے ہیں۔"

ہلدا کو جنرل فالکن کے الفاظ یاد آگئے: "ضروری ہے کہ ان سرفروشوں کو پیغام دے دیا جائے جو دشمن کو زک پہنچا سکتے ہیں۔" اس نے ورنر سے کہا۔ "تو اب آپ ان لوگوں کو پیغام بھیجیں گے؟"

"یہ کام تمہیں کرنا ہوگا۔" ورنر نے کہا۔ "ابھی ابھی میں نے تم سے ڈاکٹر لٹوک کا تذکرہ کیا تھا۔ وہی دنیا کو دکھانے کے لئے میرا علاج کر رہا ہے۔ وہ بھی ہم میں سے ایک ہے۔ اس کے پاس طویل حیطۂ عمل کا ریڈیو نظام ہے۔ ہم دونوں روزانہ ملاقات کرتے ہیں۔ تمہیں اس کے پاس ہی جانا ہوگا۔ آج ہی رات۔ وہ خفیہ پیغامات بھیجنے کا ماہر ہے۔ وہی شالاف کو پیغام بھیجے گا۔ سرفروشوں کی ایک جماعت کو فوراً جنیوا بھیجا جانا ضروری ہے۔ تم ہی ان لوگوں کو بتاؤ گی کہ انہیں کیا کرنا ہے، جان ایرک اور کرافٹ کو۔ بشرطیکہ وہ خود کو اس سے الگ کرنے پر آمادہ نہ ہو جان سے مار ڈالا جائے تاکہ وہ فنڈز جاری نہ ہوسکیں۔"

"میں کرافٹ کو راضی کرلوں گی۔" ہلدا نے یقین دلایا۔

"تمہاری خاطر میری بھی یہی خواہش ہے کہ وہ تمہاری بات مان لے، لیکن یہ بات تمہارے لئے کچھ آسان ثابت نہ ہوگی۔ اسے بہت خوب صورتی کے ساتھ شیشے میں اتارا گیا ہے۔ اس کو بس اتنا معلوم ہے کہ اسے اپنے ان دیکھے باپ کا ایک عہد پورا

کرتا ہے۔ مورنر نے کہا۔

"آپ کو یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوگئیں؟" ہلدا نے دریافت کیا۔

"اس کی ماں سے ہم برسوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ بھی کلاسن کے منصوبے کی ایک کڑی ہے اس کا ایک حصہ ہے۔ جب ہم نے اس سلسلے میں اس سے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ وہ محض بانی کی ماں ہے۔ منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے ایک فریب ہے۔ جو دنیا کو دیا گیا ہے، ہمیں دیا گیا ہے۔۔۔"

"کرافٹ سلجھے ہوئے ذہن اور مضبوط ارادے کا آدمی ہے۔ وہ کبھی غلط کام نہیں کر سکتا۔ اگر اسے تمام حالات بتا دیئے جائیں تو وہ اس کام سے خود کو علیحدہ کر لے گا" ہلدا نے پھر اپنی بات پر اصرار کیا۔

"کرافٹ کو یقین ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے نیکی اور بھلائی کے لئے کر رہا ہے۔ اسے یہ یقین دلانے کے لئے مختلف آزمائشوں سے گزارا گیا ہے۔ اس پر مختلف انداز سے قاتلانہ حملے کرائے گئے ہیں۔ یہ حملے اگرچہ جعلی تھے۔ لیکن کرافٹ یہی سمجھتا ہے کہ اس پر یہ حملے جلیوا دستاویز کے دشمنوں نے کئے تھے۔ ایسے ہی حملوں میں ریو میں جیراف کی طرف سے اس پر حملے بھی شامل ہیں۔"

"جیراف کا تعلق اوڈیسہ سے ہے؟" ہلدا نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ ولف شان زے کا ایک لیڈر ہے، بلکہ تھا اسے کل کسی شخص نے گولی مار دی ہے۔ اس کی لاش کے پاس سے جو پرچہ ملا ہے اگرچہ اس میں یہی کہا گیا ہے کہ اسے پرتگیزی یہودیوں نے انتقاماً قتل کیا ہے لیکن ہم جانتے ہیں یہ تمہارے بھائی کی کارگزاری ہے۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اب کسی مصرف کا نہیں رہا تھا۔"

ہلدا کے لئے یہ ایک اور اعصاب شکن انکشاف تھا۔ ایک گھنٹے کی اس گفتگو میں ہلدا پر جو کچھ انکشافات ہوئے تھے۔ انہوں نے ہلدا کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "مگر مسٹر ورنر! اگر آپ کو یہ سب باتیں معلوم ہیں تو آپ نے جلیوا دستاویز کا انکشاف کیوں نہیں کیا؟ اگر آپ اس سنسنی خیز انکشاف کے بعد وہ لوگ تم تو حاصل نہیں کر سکتے تھے۔"

"اس لئے کہ اس سے پہلے وہ دنیا کے سامنے ہم جو بھی یہ انکشافات کریں گے مار دیئے جائیں گے۔ پھر یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ دنیا آدمی کہانی سے واقف نہیں ہو سکے گی اور یہی سب سے اہم ہے" ورنر نے بتایا۔

"باقی آدمی کہانی کیا ہے؟" ہلدا نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"باقی آدمی کہانی کا تعلق فرزندان شمس سے ہے۔ وہ کون ہیں۔ کہاں ہیں۔ وہ خونریزی کہاں کہاں آباد ہیں۔ ہمیں اتنا تو معلوم ہے کہ ان فرزندان شمس یعنی شورش پسندوں کی باقاعدہ فہرست تیار کی گئی تھی۔ تیس برس قبل یہ فہرست تیار ہوئی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ فہرست تمہارے بھائی کے پاس ہے۔ یہ فہرست سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہوگی اور اسے جان کہیں نہ کہیں ضرور رکھا ہوگا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس فہرست کے علاوہ بھی ایک اور مختصر فہرست ہونی چاہئے۔ اس فہرست میں مخصوص اور اہم افراد کے نام ہوں گے۔ چند صفحات پر مشتمل یہ فہرست جان ہی کے پاس ہونی چاہئے۔ یہ وہ افراد ہوں گے جنہیں جلیوا کے فنڈ سے بڑی بڑی رقوم منتقل کی جائیں گی۔ یہی لوگ ولف شان زے کے لیڈر ہوں گے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ فہرست آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہے۔ تمہیں پشلاف کے سرفروشوں کو یہ ہدایت بھی دینی ہے کہ وہ اس فہرست کو ضرور حاصل کرنے کی کوشش کریں یہ فہرست ملنے کے بعد ہی ہم نقلی ولف شان زے پر فیصلہ کن ضرب لگا سکتے ہیں۔۔"

"کرافٹ کی والدہ اس وقت کہاں ہیں؟ انہیں کیا کچھ معلوم ہے؟"

"اسے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ بس یہ دعا کرو کہ وہ پریشان نہ ہو گئی ہو۔ ہم نے میکسیکو تک تو اس کا تعاقب کیا تھا اس کے بعد ہم اس کا تعاقب نہ کر سکے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ اپنے بیٹے

کے پاس پہونچنے کی کوشش کر رہی ہے ۔ لیکن جونہی وولف شان ۔ ۔ ۔ ہم لوگوں کی نظروں میں وہ آئی اسے مار ڈالا جائے گا ۔" ورنر نے بتایا ۔

"تو پھر ہمیں کرافٹ کی والدہ کو تلاش کرنا چاہیئے ۔" ہلدا نے کہا ۔

"لیکن اس کی تلاش میں ہمیں اہم کاموں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے ۔ یاد رکھو اب صرف ایک وولف شان ہی سرگرم عمل ہے ۔ اسے ناکارہ بنانا سب سے اہم کام ہے ۔ آج رات تمہیں ڈاکٹر لشوک سے ملنا ہے ۔ اس کا مکان اس کے کلینک کے قریب ہے ۔ بلکہ یوں کہو کہ کلینک کے عقب میں پہاڑ پر اس کا مکان ہے ۔ وہ پہاڑ سخت گزار ہے ۔ لیکن وہاں سینڈ یوکی کارکردگی بہت شاندار ہوتی ہے ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ورنر خاموش ہو گیا ۔ کمرے میں ۔ ورداز جھنجھناہٹ پھیل گئی ۔ آواز اتنی تیز تھی کہ ہلدا چونک کر کھڑی ہو گئی ۔ ورنر کی نگاہیں باہر ، دیوار کی کھڑکی کے ایک شیشے پر جمی ہوئی تھیں ۔

"اس کھڑکی کے ایک چوکھٹے میں ایسا آئینہ جڑا ہے جو اندھیرے میں بھی لوگوں کا عکس منعکس کر سکتا ہے ۔ کوئی آدمی اس طرف بڑھ رہا ہے لیکن میں اس سے واقف نہیں ۔" یہ کہہ کر وہ میز کی طرف بڑھا اور دراز میں سے ایک چھوٹا سا پستول نکال کر ہلدا کو دے دیا ۔

"میں اس کا کیا کروں ؟" ہلدا نے حیرت سے پوچھا ۔

"اسے اپنے پاس چھپا لو ۔ میں اس شخص سے واقف نہیں ہوں ۔ آج شام اسے میں نے چوک میں دیکھا تھا ۔ ہو سکتا ہے یہ ہم میں سے ہو اور ہو سکتا ہے ہم میں سے نہ ہو ۔ ۔"

ہلدا نے پستول اپنے پہلو میں رکھ لیا ۔ اس کے سامنے میز رکھی تھی جس کی وجہ سے دروازے میں کھڑا کوئی بھی شخص پستول کو نہیں دیکھ سکتا تھا ۔ باہر قدموں کی آوازیں قریب آتی گئیں اور دروازے پر پہونچ کر یہ آوازیں ختم ہو گئیں ۔ اس کے بعد دروازے پر دستک ہوئی ۔ ساتھ ہی آواز دی گئی ۔ "مسٹر ورنر ؟ ۔ ۔"

ورنر نے مخصوص انداز میں گنگنا کر کہا ۔ "کون ہو میاں !

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے ۔ میں عبادت میں مصروف ہوں ۔"

"میں شلاف سے آپ کے لئے پیغام لایا ہوں ۔" وہی آواز ابھری ۔

ورنر نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور ہلدا کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے کہا ۔ "وہ اپنا ہی کوئی آدمی ہے ۔ شلاف کے بارے میں ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا ۔ ۔"

ورنر نے دروازہ کھولا ۔ بس ایک لمحے کے لئے ہلدا اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی تھی لیکن اس کے فوراً بعد ہی وہ صوفے سے چھلانگ لگا کر فرش پر گر گئی ۔ وہ پستول کو گرفت میں لینا نہیں بھولی تھی ۔ دروازے میں جو شخص بھی تھا اس کے ہاتھ میں لمبی نال کا ریوالور تھا ۔ اس سے فائر کیا گیا اور کمرہ کان پھاڑ دینے والی آواز سے گونج کر رہ گیا ۔

ہلدا صوفے کی آڑ میں ایک طرف کھسکی ۔ اسی وقت اجنبی نے ایک اور فائر کیا ۔ جس صوفے کی آڑ میں ہلدا تھی اس کی پشت میں نہایت بدنما سا سوراخ ہو گیا ۔ اس کے بعد ایک اور فائر ہوا ۔ گولی اس کی پنڈلی کو چھید گئی ۔ لیکن اس نے حواس قائم رکھے ۔ اس نے پستول سے دروازے کی طرف شست باندھی اور ٹریگر دباتی چلی گئی ۔ دروازے میں کھڑے ہوئے نووارد کے منہ سے چیخ ابھری ۔ اس نے ٹریگر پر پھر دباؤ ڈالا ۔ تین اور گولیاں پستول سے نکلیں اور اجنبی کے زمین پر گرتے ہوئے جسم میں پیوست ہو گئیں ۔

اور پھر وہ بلک پڑی ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر رہے تھے ۔ کمرے میں ہر طرف دھواں بھرا ہوا تھا ۔ اس نے اپنی زخمی پنڈلی کو دیکھا ۔ خون اس کے موزے کو تر کرتا ہوا جوتے میں پہونچنے لگا تھا ۔

"ہلدا ۔ ۔ ۔ ہلدا میری بیٹی ۔ ۔ ۔" اس نے بوڑھے ورنر کی کمزور آواز سنی ۔

ہلدا اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی بوڑھے ورنر کے پاس پہونچی نووارد مر چکا تھا اور بوڑھا مرنے کے قریب تھا ۔

"بیٹی ہلدا ! فوراً ڈاکٹر لشوک کے پاس جاؤ ۔ شلاف کو پیغام

بھجوا دو۔ اور سنو تم خود جنیوا سے دور رہنا۔"

"جنیوا سے دور رہوں، کیوں؟"

"اسے نہیں معلوم ہوگا کہ تم مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ حالانکہ شاہانہ نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ عقابوں میں سب سے آخری رہ گئی ہو۔"

"کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" ابی نے کہا۔

"ہاں، تم عقابوں میں آخری عقاب ہو۔" ونزر نے کہا۔

اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ وہ مر چکا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

سرخ داڑھی والا پائلٹ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کار کی طرف آ رہا تھا۔ ابی کار میں بیٹھی اسے آتے دیکھ رہی تھی اور حیران تھی۔ آخر وہ اکیلا کیوں آ رہا ہے؟ اس کے بیٹے کرافٹ کو لے کر کیوں نہیں آیا؟ اور وہ اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟

پائلٹ نے دروازہ کھولا، جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اطمینان کا سانس لے کے کہا "ہوٹل ایکارڈ میں بہت ہنگامہ ہے مادام۔ وہاں کسی شخص کا قتل ہو گیا ہے۔"

"وہ میرا بیٹا تو نہیں؟ کرافٹ تو نہیں؟" ابی نے گھبرا کر کہا۔

"جی نہیں، مرنے والا کوئی انگریز ہے۔ سام نام ہے ولیم سام۔"

"اف میرے خدایا! کرافٹ کا ایک دوست ہے لندن میں، اس کا یہی نام ہے۔ اکثر اس کا ذکر کیا کرتا تھا۔ میں فوراً اپنے بیٹے سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ہوٹل میں ہر طرف پولیس والے موجود ہیں۔ خود آپ کے بارے میں انٹرپول نے بلیٹن جاری کر رکھا ہے۔ اگر مقتول اور آپ کے بیٹے کے درمیان ذرا بھی تعلق ثابت ہو گیا تو آپ بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گی۔"

"میں اسے فون کرنا چاہتی ہوں۔" ابی نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"میں خود فون کروں گا۔ مادام۔ آپ کے لئے یہ آخری



کام ہوگا جو میں کروں گا۔" سرخ داڑھی والے پائلٹ نے کہا۔

وہ پندرہ منٹ تک کار میں سفر کرتے رہے۔ جب پائلٹ کو یقین ہو گیا کہ ان کا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے تو اس نے کار ایک طرف روک لی۔ اور ابی کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم بلاوجہ شک میں مبتلا ہو گئے ہو۔ آخر ہمارا تعاقب کرنے کی کسی کو کیا ضرورت ہے۔ کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔ تم نے میرے اور کرافٹ کے بارے میں کسی سے کوئی تذکرہ بھی نہیں کیا۔"

"بات یہ ہے مادام میں جنیوا پولیس سے راہ و رسم بڑھانے کا قائل نہیں ہوں۔ ویسے بھی اکثر و بیشتر ان سے مڈبھیڑ ہوتی رہتی ہے۔ میرے اور جنیوا پولیس کے تعلقات کچھ اچھے نہیں ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کار سے باہر نکلا اور ٹیلیفون بوتھ کی طرف بڑھ گیا۔

ابی کار میں بیٹھی اسے فون پر گفتگو کرتے دیکھتی رہی

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آگیا لیکن اب وہ پہلے سے زیادہ پریشان تھا۔

"کیوں، کیا ہوا؟" اینی نے جلدی سے پوچھا۔

"میں نہیں سمجھ پایا کہ چکر کیا ہے۔ وہاں لوگ آپ کے فون کے منتظر تھے۔ یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی۔"

"ہو سکتا ہے میرے بیٹے نے یہ انتظام کیا ہو؟" اینی نے کہا۔

"لیکن مادام فون آپ نے نہیں، میں نے کیا تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم نے میری طرف سے ہی فون کیا تھا۔ کیا کہا ان لوگوں نے؟" اینی نے پوچھا۔

"انہوں نے نہیں مادام، اس نے۔ اور اس نے جو کچھ کہا ہے، وہ میرے لئے تعجب خیز ہے۔ اس شہر کے اپنے آداب ہیں۔ یہاں دو افراد کے درمیان ہونے والی گفتگو سے متعلق کسی کو معلومات نہیں فراہم کی جاتیں۔"

"پیغام کیا ہے؟" اینی نے بے تابی سے پوچھا۔

"کہا گیا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو کہیں ملاقات کی جائے۔ یہاں سے دس کلو میٹر دور روسینا نامی ریسٹورنٹ میں۔ یہ مقام جھیل کے مشرقی کنارے پر ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تمہارا بیٹا بھی وہاں موجود ہوگا۔" کلمنٹ نے کہا۔

"تو پھر ہمیں فوراً وہاں چلنا چاہیے۔"

"ہمیں؟" پائلٹ نے حیرت سے کہا۔ "میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔"

"اس کے عوض میں تمہیں پانچ سو ڈالر ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

"صرف ایک شرط پر کہ جب تک آپ کی ملاقات اپنے بیٹے سے نہ ہو جائے آپ میری ہدایات پر عمل کریں گی۔ اور اگر وہاں آپ کی ملاقات اپنے بیٹے سے نہ ہوئی تب بھی آپ مجھے یہ رقم ادا کریں گی۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"ٹھیک ہے مادام۔" یہ کہہ کر اس نے کار اسٹارٹ کر دی۔

"تمہیں بلاوجہ شبہ کیوں ہو رہا ہے؟" اینی نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ ٹیلیفون آپریٹر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میری بات استقبالیہ کلرک سے کرا رہا ہے۔ لیکن میں نے جس شخص سے بات کی وہ کلرک نہیں تھا۔ یہ اس کے لہجے سے ظاہر تھا۔ وہ جنیوا کا رہنے والا نہیں ہے۔ اس لئے میری ہدایات پر آپ کو عمل کرنا ضروری ہے۔"

"میں یہ کہوں گا کہ اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔ ایک کام کرنا تھا اور تم نے اصرار کیا کہ یہ کام تم خود کرو گے۔ تم خود یہ کام کرنے کے لئے بے چین ہو۔ ویسے اس قسم کے معاملات میں تم ہمیشہ ہی زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہو۔ شاید اس وجہ سے کہ تم بہت مضبوط کاٹھی کے شخص ہو۔" جان نے ٹہلتے ہوئے تقریر کے انداز میں کہا۔

"میں کیا کرتا۔ وہ کم بخت نہایت سخت جان تھا۔ بھینسا تھا بھینسا۔ مر ہی نہیں رہا تھا۔ کم بخت میں نہ معلوم کہاں کہاں کی طاقت بھری ہوئی تھی۔ میرے پیٹ کو دیکھا ہے تم نے؟" یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیض کے بٹن کھول دیئے۔ اس کے پیٹ پر گہرے نیل کے بدنما نشان تھے۔ کئی جگہ سے تو کھال ادھڑ کر رہ گئی تھی۔ "اس نے میرے پیٹ اور سینے کا یہ حشر اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔"

❖ ❖ ❖

جان نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا اور وہ مسکرا رہا تھا۔ ہاتھ لہرا کے اس نے کہا۔ "بالآخر وہ ہمارے چنگل میں آ ہی پھنسی۔ بڑی چالاک بنتی تھی وہ بڑھیا حرام زادی۔" آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ ہینس کی طرف بڑھ گیا جو اپنے دائیں گال پر برف رکھے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ نیل پڑے ہوئے تھے۔ ابرو کے پاس چند ٹانکے بھی آئے تھے۔ یہ ٹانکے جنیوا پولیس کے نائب سربراہ کے ذاتی معالج نے لگائے تھے۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔" ہینس نے تکلیف کی شدت سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"ہینس، میرے خیال میں تمہارا جانا ٹھیک نہیں۔" اس کے بڑے بھائی ایرک نے کہا جو قریبی صوفے پر نیم دراز تھا۔

"میں نہیں چاہتا کہ کوئی تمہیں اس حالت میں دیکھے۔

ہم کرافٹ سے کہہ دیں گے کہ تم ناگہانی مصروفیات کی بنا پر نہیں آسکے ہو۔"

"نہیں" ڈاکٹر رینس نے چیخ کر کہا۔ ساتھ ہی اس نے ساتھ پڑی ہوئی میز پر زور سے مکا بھی مارا۔ "تم کرافٹ سے جو بھی چاہے کہہ دینا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ لیکن آج رات میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گا۔ میں اُس درندے کو سبق دینا چاہتا ہوں۔"

ایرک نے جھرجھری لے کر آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں۔ ماس نے کہا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ وہاں سے زندہ نکل آئے۔ اب واقعی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تمہیں اس ہوٹل سے کہیں اور منتقل کر دیں۔ پولیس ہوٹل میں مقیم ہر شخص سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔۔۔"

"پولیس یہاں نہیں آئے گی۔ ہمارے پولیس کے نائب سربراہ نے اس کا انتظام کر لیا ہے" رینس نے تلخی سے کہا۔

جان نے غور سے رینس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، اگر تم چلنا ہی چاہتے ہو تو چلو۔ اپنا دھوپ کا چشمہ، مفلر اور ہیٹ لے لو۔ نائب سربراہ اس وقت لابی میں ہے۔ لیکن تم چل سکو گے؟"

"ہاں میں چل سکتا ہوں" اس نے زخمی شیر کی طرح دھاڑ کر کہا۔

"تو ٹھیک ہے، تمہیں شاید کرافٹ کی ماں کو ٹھکانے لگا کر کچھ سکون آجائے" جان نے تبصرہ کیا اور پھر مڑ کر ایرک سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تمہیں یہیں ٹھہرنا ہے۔ کرافٹ کسی وقت بھی فون کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اس وقت تک اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرے گا جب تک تمہاری آواز نہ پہچان لے۔ اس سے نہایت نرمی سے گفتگو کرنا۔ ظاہر کرنا جیسے تم اس کی طرف سے بہت پریشان ہو۔ اس سے کہنا کہ میں نے تم سے برلن میں فون پر رابطہ قائم کر کے فوراً یہاں پہنچنے کے لئے کہا تھا۔ اسے بتا دینا کہ میں نے پیرس میں اس کے ہوٹل بھی فون کیا تھا۔ لیکن وہ وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔ اسے بتانا کہ آج اس ہوٹل میں قتل کی واردات

سے ہم سب بہت پریشان ہیں۔ کیونکہ مقتول کے میں معلومات حاصل کی جا رہی تھیں۔ اس لئے ہم ہوٹل ایدلاسڈ کی طرف سے کمرہ نہ کریں۔۔۔"

"ٹھیک ہے اور میں اس سے یہ بھی کہہ دوں کہ واردات کے بعد ایک ایسے شخص کو ہوٹل کے قریب سے بچ جانے دیکھا گیا تھا جس کا حلیہ اس سے ملتا ہے۔ اس بات سے وہ اور بھی پریشان ہو جائے گا تا کہ۔"

"شاباش" جان نے اس کی تجویز پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ "اس سے ملاقات کر کے ہوٹل روز میں جانا اور وہاں کے نام سے مجرا دینا۔ اگر اس کے ذہن میں کوئی شبہ ہوگا تو نام سے ختم ہو جائے گا کیونکہ اس کے لئے یہ نام بتایا گیا تھا۔ وہ سمجھ جائے گا۔ میری تمہاری بات ہو چکی۔"

"ٹھیک ہے بتا دوں میں ہوٹل روز میں ہوں۔ مسائل ہیں جو اتفاقات پیش آئے ہیں اس کی بنا پر تم نے بینک ڈائریکٹروں سے کل صبح ملاقات کا پروگرام بنا لیا ہے۔ جلد سے جلد مت جائے اور ہم نے سب منتقل ہو جانا" اس نے کہا۔

"ضرور ضرور۔ یہ بھی اچھی حکمت عملی ہے" اس نے جواب دیا اور رینس سے کہا۔ "آؤ یار۔ میرے سہارے کی ضرورت تو نہیں!۔۔۔"

"مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہوں تم بس میرا میڈیکل بیگ لے لو۔۔"

"چلو یونہی سہی" جان نے میڈیکل بیگ اٹھا کر کہا۔ "ویسے تمہیں یہ ضرور بتا دینا چاہئے کہ تم کونسی کرنا چاہتے ہو۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ ہم قدرتی موت ہیں، قتل نہیں۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ اس بیگ میں ہر چیز کے استعمال کی واضح ہدایات ہیں، غلطی کا امکان ہی نہیں۔۔۔"

پروفیسر ایرک اپنے بھائی کے شانے پر اوور کوٹ جھکا تھا اور اب مفلر اس کی گردن میں لپیٹ رہا تھا کہ

ماں سے ملاقات کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ ہینس کو کہاں ٹھہرایا چاہئے۔ جان نے تجویز پیش کی۔ کچھ دیر سوچا اور کہا: میرا خیال ہے کہ اسے آپ کے گھر ٹھہرا دیا جائے۔"

"یہ بہت مناسب تجویز ہے۔"

"تم نے بتایا ہے کہ انجکشن کی ہر شیشی پر ہدایت درج ہے" جان نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

ہینس آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دروازے سے نکلا اور بولا۔ "ہاں عورت کو جو انجکشن دیا جائے گا اس سے اس کے دل کی حرکت تیز ہو جائے گی۔ خون کا دباؤ بڑھ جائے گا اور..."

دروازہ بند ہو گیا۔ ایرک مکمل جملہ نہ سمجھ سکا لیکن اس کا مفہوم اس پر عیاں تھا۔ ایرک پھر صوفے میں دھنس گیا۔ وان شان زرے کا طریقہ کار یہی تھا۔ ان حالات میں کوئی اور فیصلہ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ جس ڈاکٹر نے ہینس کے زخموں کو دیکھا تھا اس نے بتایا تھا کہ ہینس اندرونی طور پر جریان خون کا شکار ہے۔ آہنی طاقت رکھنے والے پنجوں نے اس کے اندرونی اعضا کو سخت مجروح کیا اور اندر ہی اندر خون بہہ رہا ہے۔ اس کا علاج اسپتال ہی میں ممکن ہے، ورنہ وہ مر جائے گا۔ مگر حالات ایسے تھے کہ ہینس کو اسپتال میں داخل نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ایسی صورت میں مختلف سوالات پوچھے جا سکتے تھے۔ ہوٹل ایلارڈ میں اسی سہ پہر ایک شخص کا قتل ہوا تھا۔ اور اس وقت ہینس بھی وہیں مقیم تھا۔ اس کے علاوہ ہینس کو اس مرحلے پر جو کام کرنا تھا، وہ سب اس میڈیکل بیگ کی مدد سے کرنا تھا جو جان لے کر گیا تھا۔ تینوں ان چیزوں کے استعمال سے بھی واقف تھے۔ ہینس جو ایک فرزند شمس تھا، موجودہ حالت میں محض ایک بوجھ تھا۔ اس کی اب ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس سے جلد از جلد نجات حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس کی زندگی اب بے کار ہو گئی تھی۔ "خدا حافظ ہینس" ایرک نے زور سے کہا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا بھائی اب زندہ واپس نہیں آئے گا۔ لیکن وہ متاسف نہ تھا۔ ایسی قربانیاں تو وہ تیس برس سے مسلسل دیتے چلے آئے تھے۔

ایرک ایسے ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے اس کے خیالات کا سلسلہ منتشر کر دیا۔

"ایرک؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا تو وہ کرافٹ کی تھی۔

"ہاں، میں ایرک بول رہا ہوں۔"

"میں یہاں پہنچ چکا ہوں۔ تم کچھ جلدی آ گئے؟..."

"ہاں، جان نے مجھ سے فوراً یہاں پہنچنے کے لئے کہا تھا۔ اس نے تمہیں پیرس میں فون کیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ..."

کرافٹ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تو وہ یہاں آ چکا ہے؟"

"ہاں اور وہ اس وقت کل کے لئے پروگرام طے کرنے باہر گیا ہوا ہے۔ تم ہو کہاں۔ بہت سی باتیں تمہیں بتانا ہیں۔"

"میں بھی تمہیں بہت کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کیا ہوا ہے؟" کرافٹ نے کہا۔

"ہاں... جو کچھ بھی ہوا، بہت ہولناک ہے۔"

ایرک نے جواب دیا لیکن وہ ذہن ہی ذہن میں کئی سوالات کر رہا تھا۔ یہ شخص جس کا نام کرافٹ ہے اسے بالکل بھی پریشان نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی گفتگو سے بھی یہ ظاہر نہیں تھا کہ وہ حالات سے ہراساں ہے۔ حواس باختہ ہے۔ کرافٹ کے لہجے میں موت کی سی سنجیدگی تھی۔ وہ ان حالات سے نمٹنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ کسی سے مدد کا خواہش مند نہ تھا۔ "وہ تمہارا دوست تھا۔ تمہاری والدہ کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔"

"ہوں۔" کرافٹ نے گہرا سانس لیا۔ چند منٹ خاموشی رہی پھر اس کی آواز آئی۔ "تم عقابوں کی تنظیم سے واقف ہو؟"

ایرک اور بھی حیران رہ گیا۔ کرافٹ اپنے حواس میں تھا۔ اس کا ذہن منتشر نہیں تھا۔ "صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ جنیوا کے دشمن ہیں۔"

"اور جان پر یہ حقیقت برطانیہ میں منکشف ہوئی تھی؟" کرافٹ نے دریافت کیا۔

"ہاں۔ مگر کرافٹ تم ہو کہاں؟ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔

لیکن تم مجھ یہاں تلاش کی کوشش نہ کرنا۔

"میں بھی جانتا ہوں میری بات غور سے سنو۔ کیا تمہارے پاس کچھ رقم ہے؟"۔

"ہاں۔ کتنی؟"۔

"ایک ہزار سو تیس فرانک۔"

"ہاں اتنی رقم ہوگی۔"

"تو پھر تم نیچے استقبالیہ کلرک کے پاس جاؤ۔ کلرک کو اعتماد میں لے کر بات کرو۔ اس کا نام معلوم کر کے اسے یہ رقم دے دو۔ اس سے کہنا کہ یہ رقم میں نے بھجوائی ہے اور میں تھوڑی دیر میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں" کرافٹ نے جلدی جلدی کہا

"مگر کیسے، کہاں سے؟"۔

"میری بات سن لو پہلے" کرافٹ کے لہجے میں سختی تھی۔ اسے ایرک کی مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ "اس کا نام معلوم کرنے اور اسے یہ رقم دینے کے بعد تم لفٹوں کے قریب لگے ہوئے ٹیلیفون بوتھ کی طرف جانا۔ بائیں طرف والے بوتھ کے قریب کھڑے رہنا۔ جب اس کی گھنٹی بجے تو اسے اٹھا لینا۔ میں بات کر رہا ہوں گا۔"

"تمہیں اس کا نمبر کیونکر معلوم ہوا؟" ایرک نے پوچھا۔

"میں نے کسی کو رقم دے کر اس کا نمبر معلوم کیا ہے" کرافٹ نے بتایا۔

ایرک کا ذہن ہواؤں میں اڑا جا رہا تھا۔ کرافٹ کے بارے میں ان کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس پے در پے جو واقعات گزرے ہیں، اس کے بعد کرافٹ بہت ہراساں ہوگا، سخت پریشان ہوگا۔ صحیح فیصلہ کرنے سے قاصر ہوگا۔ اپنے طور پر کوئی قدم اٹھانے کی بجائے ان سے مدد لینے کے لئے بے چین اور بے قرار ہوگا۔ خطرات سے بچنے کے لئے ان کی پناہ میں آنے کے لئے بے قرار ہوگا۔ لیکن کرافٹ تو نہایت مضبوط اعصاب کا شخص ثابت ہوا تھا۔ وہ واقعی فرزندان شمس میں سے تھا۔

"تم کلرک سے کیا کہو گے؟"



"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی اس وقت نہیں۔ تم کتنی دیر بعد اس کے پاس پہنچو گے؟" کرافٹ نے پوچھا۔

"دس منٹ میں، ویسے میرا خیال تھا کہ ہمیں پہلے جان کا انتظار کر لینا چاہئے۔ وہ ایک دو گھنٹے میں آ جائے گا۔"

"نہیں، میں اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ انہوں نے میرے دوست کو قتل کیا ہے اور اب وہ میری ماں کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔ لیکن وہ میری ماں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس سے پہلے انہیں مجھ تک پہنچنا ہوگا۔ درحقیقت وہ مجھ تک ہی پہنچنا چاہتے ہیں اور خود میں بھی ان تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں ان لوگوں کو اپنے جال میں پھانس لوں گا ایرک۔"

"سنو کرافٹ، جذباتی نہ بنو، ٹھنڈے ذہن سے سوچو۔ پولیس اب بھی ہوٹل میں موجود ہے۔ اگر تم نے کلرک سے بات کی تو ہو سکتا ہے وہ پولیس کو اطلاع کر دے۔ پولیس پھر تمہارے پیچھے بھی پڑ جائے گی۔"

"چند گھنٹے بعد پولیس مجھ تک پہنچ جائے گی۔ اس

کی مجھے پروا نہیں۔ میں خود اس کا استقبال کروں گا۔"

کرافٹ نے جواب دیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ایرک نے پریشان ہو کر کہا۔

"تو پھر جیسا میں نے کہا ہے، ویسا ہی کرو۔ دس منٹ بعد تم نیچے ٹیلیفون بوتھ کے پاس موجود ہو گے۔" یہ کہہ کر کرافٹ نے جواب کا انتظار کئے بغیر فون بند کر دیا۔

ایرک نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے سوچا کہ انہوں نے کرافٹ کے بارے میں کتنے غلط اندازے لگائے تھے۔ اب وہ کرافٹ کی ہدایات پر عمل کرنے کے لئے مجبور تھا۔ ایسا نہ کرتا تو کرافٹ اس کی طرف سے مشکوک ہو جاتا۔ مگر ایرک پریشان اس لئے تھا کہ کرافٹ کے عزائم سے وہ لاعلم تھا۔ اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا تھا کہ کرافٹ کا مقصد درحقیقت کیا ہے۔ جان اُس کی ماں کو ٹھکانے لگانے کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کرافٹ کی ماں مر چکی ہے۔ اب اسے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کے بعد ضروری تھا کہ کرافٹ کو اگلے روز صبح تک کسی نہ کسی طرح زندہ رکھا جائے۔

❖ ❖ ❖

کرافٹ، سڑک کے موڑ پر ٹیلیفون بوتھ کے قریب کھڑا دس منٹ کا وقفہ گزرنے کا منتظر تھا۔ وہ اس وقت جو کچھ کرنے والا تھا اگرچہ محض خود غرضی کو اس میں دخل تھا۔ لیکن غصّے سے اس کا ذہن اتنا کھول رہا تھا کہ اخلاقیات کی ہر بات اس کے لئے بے معنی ہو چکی تھی۔ سام کو جس انداز سے اور جس وحشیانہ انداز میں قتل کیا گیا تھا اس نے اس کے ذہن میں آگ لگا دی تھی۔ اس کے روم روم سے انتقام کی صدا آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے رضاعی باپ رچرڈ کی موت بھی یاد آ گئی۔ اس کے ذہن میں وہ تمام واقعات بھی گھوم رہے تھے۔ جن سے وہ گزرا تھا۔ طیارے میں، ریوٹن، فرانسیسی گاؤں میں اور برلن میں کس طرح اس پر قاتلانہ حملے ہوئے تھے۔ کس طرح وہ قتل ہونے سے بچا تھا اور کس طرح دوسرے افراد مارے گئے تھے۔ پھر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک شخص اس کی ماں کے تعاقب میں تھا۔ وہ اپنی ماں کو ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا۔

اب اس کے حرکت میں آنے، دشمن پر ضرب لگانے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اس کے لئے وہ ہر ذریعہ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اپنی تمام توانائیاں اور تمام صلاحیتیں بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ برلن میں وہ اپنی حماقت سے دشمنوں کو ایرک تک پہنچا چکا تھا۔ اب اگر وہ دشمن، وہ قاتل اس کی تلاش میں تھے تو یقیناً وہ ایرک کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔ وہ ہوٹل سے نکلے گا تو دشمن اس کے تعاقب میں لگ جائے گا۔ محض اس توقع میں کہ اس کے توسط سے وہ کرافٹ تک پہنچ سکتا ہے۔

کرافٹ نے گھڑی دیکھی، دس منٹ گزر چکے تھے۔ ایرک کو فون کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ ٹیلیفون بوتھ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے نمبر ملایا، تھوڑی دیر بعد ہی دوسری طرف سے پروفیسر ایرک کی آواز ابھری اور اس نے پوچھا: "استقبالیہ کلرک کا نام کیا ہے؟"۔

ایرک نے نام بتا کر کہا۔ "سنو کرافٹ، میں اب بھی تم سے یہی کہہ رہا ہوں کہ فوراً مجھ سے ملو۔ بہت سی باتیں ہیں جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ کل کا دن بہت اہم ہے۔"

"کل بہت دور ہے، اس سے قبل، آج رات میں اپنی ماں کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔" ایرک نے کچھ کہنا چاہا تو کرافٹ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں جو کہہ رہا ہوں، وہ سنو۔ ابھی پانچ منٹ اور یہیں ٹیلیفون کے پاس انتظار کرو۔ ہو سکتا ہے میں تمہیں پھر فون کروں اگر میرا فون نہ آئے تو باہر نکل کر پہاڑی سڑک پہ نیچے کی طرف چل دینا۔ بس چلتے رہنا۔ نیچے پہنچ کر بائیں طرف مڑنا اور چلتے رہنا۔ میں فوراً ہی تم سے آ ملوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ایرک نے جواب دیا۔

پولیس اب بھی ہوٹل میں موجود تھی۔ ساتھ ہی کئی رپورٹر بھی وہاں آ چکے تھے۔ خوف اور دہشت کی ایک عجیب ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ایرک اس ہجوم سے الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا۔ مجبوری

شبہ ہوتی تو وہ ہرگز اپنے کمرے سے نہ نکلتا۔

پانچواں منٹ گزر رہا تھا کہ کلرک اس کے پاس پہنچا۔ کرافٹ نے اس کے لئے پیغام چھوڑا تھا۔ وہ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ اس نے کلرک کو پیغام دیا تھا کہ اس کی ماں کا اگر فون آئے تو اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے اور اس سے فون نمبر لے لے تاکہ کرافٹ بعد میں اس فون نمبر پر اپنی ماں سے بات کر سکے۔ کلرک نے اگرچہ قسم کھالی تھی کہ وہ کسی کو یہ نمبر نہیں بتائے گا۔ لیکن ایرک کی بات دوسری تھی۔ وہ خفیہ پولیس کے نائب سربراہ کا دوست تھا۔ اس سے تعاون کرنا کلرک کا فرض تھا۔ ایرک نے اسے ہدایت دی تھی کہ اگر اس کا فون آئے تو اسے ضرور آگاہ کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ کہتے ہوئے کلرک نے اپنی بات یوں ختم کی۔۔ تو جناب اگر اس کا فون آیا اور اس نے کوئی نمبر دیا تو میں وہ نمبر ایک کاغذ پر لکھ کر آپ کے بکس میں ڈال دوں گا۔۔

کلرک یہ پیغام دے کر واپس پلٹا ہی تھا کہ ہوٹل کا ایک ملازم زور سے لوگوں کے درمیان آوازیں لگاتا ہوا ادھر اُدھر لابی میں گھوما۔

"مسٹر ایرک ہیر وفیسر ایرک! آپ کے لئے پیغام ہے۔" وہ ملازم زور سے آواز لگا رہا تھا۔ یہ ناممکن بات تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ اس وقت یہاں ہے۔

"ہاں ہاں، کیا بات ہے؟ میں ایرک ہوں۔" اس کی آواز ہلکی تھی۔ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ کے لئے ایک زبانی پیغام ہے جناب۔" ہوٹل کے ملازم نے کہا۔ "مسٹر [illegible] نے آپ کو فون کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ اب آپ روانہ ہو جائیں۔۔"

ایرک کی سانس جیسے تھم سی گئی۔ اچانک ہی اس پر تمام حقیقت منکشف ہو گئی۔ کرافٹ اسے شکار کے لئے چارے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ کرافٹ کا خیال تھا کہ جو کوئی بھی ایرک کا تعاقب کرے گا، وہی اس کی ماں کا قاتل بھی ہوگا۔

کرافٹ واقعی فرزندانِ شمس میں سے ایک تھا۔

٭ ٭ ٭

ہلدا کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر لتوک کے گھر پہنچ ہی گئی۔

ڈاکٹر لتوک کی عمر ۵۵ برس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کے سر کے نصف سے زیادہ بال اڑ چکے تھے۔ اور اس کی آنکھیں گہری نیلی اور چمکیلی تھیں۔ وہ ایک یہودی تھا۔ بچپن میں اسے ایک ولندیزی کیتھولک خاندان نے چھپا لیا تھا اور اسی خاندان میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ، دو بہنوں اور ایک بھائی کو آشوٹز کے عقوبتی کیمپ میں زہریلی گیس سے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اگر ایک سوئس ڈاکٹر اسے نیوشٹیل آنے کی ترغیب نہ دیتا تو وہ بھی اسرائیل میں خلاف کی بستی میں رہ رہا ہوتا۔ اس نے سوچا تھا کہ تین برس نیوشٹیل میں رہ کر وہ اسرائیل چلا جائے گا۔ یہ پانچ برس پہلے کی بات تھی۔ لیکن نیوشٹیل آنے کے چند ماہ بعد اسے پتہ چلا تھا کہ اسے بعض ایسے لوگوں نے نیوشٹیل بھیجا تھا جو اس گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو نازی ازم کے احیا کے خلاف نبرد آزما تھے۔ یہ عقابوں کا گروپ تھا اور شورش زادوں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ عقابوں سے اس کا رابطہ ورنر کے توسط سے ہوا کرتا تھا۔

ڈاکٹر لتوک اسے گھر میں لے گیا۔ ہلدا نے جلدی جلدی اسے تمام واقعات سے آگاہ کیا تو اس نے کہا۔ "باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے میں تمہارے زخم کو دیکھ لوں۔" یہ کہہ کر اس نے ہلدا کی زخمی پنڈلی سے پٹی کھولی۔ زخم کا معائنہ کیا اور پھر اس کے بازو میں بے ہوشی کا انجیکشن لگا دیا۔

ہلدا ہوش میں آئی تو ڈاکٹر لتوک اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ "چار ٹانکے آئے ہیں۔" اس نے ہلدا کو سہارا دے کر تکئے کے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔ "اس شیشی میں گولیاں ہیں۔ پہلے دو دن تک ہر دو دو گھنٹے بعد ایک گولی کھانا۔ اس کے بعد ایک گولی ہر چار گھنٹے بعد۔ زخم جلدی بھر جائے گا۔۔۔ ہاں اب جلدی جلدی بتاؤ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کے بعد ورنر کے گھر جا کر مجھے بعض چیزیں وہاں سے ہٹانی پڑیں گی۔ بے ہوشی میں تم بڑبڑاتی رہی ہو۔ کئی مرتبہ تم نے عقابوں کی تنظیم کا نام

لیں۔ پھر ہلدا، کا نام تمہارے لبوں پر آیا۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کی بہن ہو۔ اور تم ہی جنرل فالکن کے ساتھ رہتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ جس چیز کے منتظر تھے اب وہ سامنے آنے والی ہے۔ تین وارث جنیوا میں جمع ہونے والے ہیں۔"

"ہاں" ہلدا نے جواب دیا۔

"اس کا اندازہ مجھے آج صبح ہو گیا تھا۔ نجف سے ملنے والی تمام اطلاعات بہت ہولناک ہیں۔ دشمنوں کو نہ معلوم شلاف کا علم کیسے ہو گیا۔ اس بستی پر نہایت خوفناک حملہ ہوا ہے۔ تمام گھروں کو بموں سے اڑا دیا گیا ہے۔ بستی کے ایک ایک فرد کو، ہر مرد، عورت اور بچے کو قتل کر دیا ہے۔ مرنے والوں کی گنتی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ سو سے زیادہ لاشیں مل چکی ہیں۔ عام خیال ہے کہ یہ بہیمانہ حملہ راکا والوں نے کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ حملہ آوروں کا تعلق لف شان زرے سے ہے۔" ڈاکٹر لٹوک کہتا چلا گیا۔ اس کے لہجے میں غم کی لہریں کروٹیں لے رہی تھیں۔

"ورنر کا کہنا تھا کہ آپ شلاف کو پیغام بھیجیں گے۔"

لٹوک نے آنکھیں بند کر لیں اور بولا۔ "اب وہاں کس کو پیغام بھیجا جائے۔ وہاں کوئی بھی تو نہیں رہا۔ مجھے بتاؤ کہ ورنر پر کیا بیتی؟"۔

ہلدا نے تمام باتیں، تمام واقعہ۔ پوری تفصیل سے ڈاکٹر لٹوک کو بتا دیئے۔ یہ سب کچھ سن کر ڈاکٹر نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ جنیوا اب میدانِ جنگ ہے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر شلاف کو پیغام بھیج بھی دیا جاتا تو تب بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ بہر حال اب بھی لندن میں شلاف کا ایک آدمی موجود ہے۔ اُسے وہیں ٹھہرنے کی ہدایت تھی۔ اسی نے پورٹ ساؤتھ میں کرافٹ کا تعاقب کیا تھا اور اس کی جیب سے باسنی کی تصویر نکالی تھی۔ بہر حال اس وقت سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ فہرست تلاش کی جائے۔ بلکہ ایک اعتبار سے اس غنڈز کو متحرک ہونے سے روکنے سے زیادہ یہ فہرست تلاش کرنا ضروری ہے۔"

"کیوں؟" ہلدا نے پوچھا۔

"اس لئے کہ چوتھی جرمن قیادت کے لئے یہ رقم صرف ایک ذریعہ ہے۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ وہ لوگ کون ہیں اور یہ معلوم کرنے کے لئے فہرست حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہم جان کو بایک کو اور ضرورت پڑے تو کرافٹ کو بھی قتل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے وہ فہرست حاصل کرنا ضروری ہے اور یہ کام لندن میں موجود شلاف کا کارندہ کر سکتا ہے۔ وہ بہت ذہین اور باصلاحیت شخص ہے۔ میں اس کے بارے میں تمہیں یہ سب اس لئے بتا رہا ہوں کہ اب تمہیں اسی کے ساتھ مل کر کام کرنا ہے۔ وہ ایک دہشت پسند اور بے رحم قاتل ہے۔ لیکن صرف ولف شان زرے کے لئے دشمن کا پکا ہے اور جو کام اس کے سپرد کیا جائے، اسے پورا کر کے رہتا ہے۔ وہ لندن کے ہیتھرو ائیر پورٹ سے ایک میل کے فاصلے پر رہتا ہے۔ اس وقت نو بجنے میں تین منٹ ہیں۔ ابھی اس سے رابطہ قائم ہو جائے تو وہ نصف شب تک جنیوا پہنچ جائے گا۔ ویسے تمہیں معلوم ہے کہ کرافٹ کہاں مقیم ہے؟"۔

"ہوٹل ایکارڈ میں۔ لیکن آپ کو معلوم ہی ہے کہ کرافٹ کو حقائق کا علم نہیں۔ وہ خلوصِ نیت سے یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک نیک کام کر رہا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ لیکن سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تمہاری اس سے ملاقات ہو۔"

"میں نے اس سے آج رات فون کرنے کے لئے کہا تھا۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ تم یہاں سے اسے فون کر سکتی ہو۔ لیکن اس سے بات کرتے ہوئے محتاط رہنا۔ ہو سکتا ہے اس کا فون ٹیپ کیا جا رہا ہو۔" یہ کہہ کر وہ ہلدا کو سہارا دے کر اس میز تک لے گیا جس پر فون رکھا ہوا تھا۔

دوسری طرف سے جب ہوٹل ایکارڈ کے آپریٹر کی آواز آئی تو ہلدا نے کہا۔ "میں کرافٹ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ایک منٹ مادام" آپریٹر نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی، ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور ایک

مرد انہ آواز ابھری۔ "مسز اینی رینیڈ؟"

"پکیا؟" ہلدا نے کہا۔ "یہ نمبر آیا آپ نے؟"

"آپ اینی رینیڈ ہی ہیں نا؟"

ہلدا حیران رہ گئی۔ معاملہ یقیناً گڑبڑ تھا۔ آپ یٹر نے کرافٹ کے کمرے کا نمبر ملانے کی بجائے زحمت نہیں کی تھی۔ وہ قدرے حیرت سے بولی۔ "تو آپ میرا ہی انتظار کر رہے تھے؟"

"جی ہاں مادام۔" آپ یٹر نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "آپ کے صاحبزادے بہت تنگی آدمی ہیں۔ آپ کے لئے ان کا پیغام یہ ہے کہ آپ ہرگز سامنے نہ آئیں، چھپی رہیں۔ البتہ آپ اپنا فون نمبر بتادیں تاکہ وہ آپ سے رابطہ قائم کر سکیں۔"

"او، بس ابھی ذرا ایک منٹ۔" ہلدا نے فون پر ہاتھ رکھ کر ڈاکٹر لسٹوک سے کہا۔ "وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں کرافٹ کی ماں بول رہی ہوں۔ کرافٹ نے آپ یٹر کو کچھ رقم دی ہے تاکہ مجھ سے ٹیلیفون نمبر لے لے اور کرافٹ اسی نمبر پر فون کرے گا۔"

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ "اس سے باتیں کرتی رہو۔ اس سے کہو کہ تمہارا فون نمبر کرافٹ کے سوا کسی اور کو نہ دیا جائے۔ اسے کچھ رقم کی پیش کش کرو۔ باتیں کرتی رہو۔ اس دوران میں میں تمہیں نمبر بتادیتا ہوں۔" یہ کہہ کر لسٹوک نے ایک پرانی ڈائری اٹھائی اور اس میں سے پتے دیکھنے لگا۔

"اس سے پہلے کہ میں نمبر بتاؤں، میں یہ یقین کرنا چاہتی ہوں کہ یہ ٹیلیفون نمبر کرافٹ کے سوا کسی کو نہیں دیا جائے گا۔"

دوسری طرف سے کلرک نے اپنی مری ہوئی ماں کی قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ وہ کسی اور کو یہ نمبر نہیں بتائے۔ اس عرصہ میں ڈاکٹر لسٹوک نے ایک کاغذ پر فون نمبر لکھ کر ہلدا کو دے دیا۔ ہلدا نے وہ نمبر کلرک کو بتا کر فون بند کر دیا۔ اس نے ڈاکٹر لسٹوک سے پوچھا۔ "یہ نمبر کہاں کا ہے؟"

"یہ فون نمبر ایک خالی فلیٹ کا ہے۔ لیکن وہ فلیٹ اس مقام پر نہیں ہے جس کا پتہ ڈائریکٹری میں دیا گیا ہے۔ یہ لو، یہ ہے اس فلیٹ کا پتہ۔ ٹیلیفون نمبر اور یہ پتہ اچھی طرح یاد کر لو۔ میں اب لندن میں شلاف کے کارندے سے بات کرتا



ہوں۔ پھر میں تمہیں جنیوا پہونچانے کا بھی انتظام کر دوں گا۔ اس زخم کی وجہ سے تم کو تکلیف تو ہوگی لیکن یہ زخم کچھ زیادہ گہرا بھی نہیں ہے۔ پٹی سے تمہارے ٹانکے کھل نہیں پائیں گے۔ بہر حال تم آج رات ہی کرافٹ تک پہونچ سکوگی۔ میری دعا ہے کہ تم اس تک پہونچنے میں کامیاب ہو جاؤ اور کرافٹ کو ایرک اور رحان کے چنگل سے بچا لوں۔ اگر اس نے انکار کیا تو پھر اس کا مارا جانا ضروری ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" ہلدا نے جواب دیا۔

"لیکن اس کے بارے میں قطعی فیصلہ وہی شلاف کا کارندہ کرے گا۔ ویسے یہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کا فیصلہ حقائق پر مبنی ہوگا۔ تمہاری اس سے ملاقات اسی فلیٹ میں ہوگی۔ میں تمہیں طیارے سے جنیوا پہونچانے کا بھی انتظام کرتا ہوں۔ بے فکر رہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

❖ ❖ ❖

ایبی کو سخت غصہ آیا لیکن اسے پائلٹ کی شرط منظور کرنا

بڑی۔ پائلٹ نے اس سے صرف ایک سوال کیا تھا: کیا آپ ان لوگوں سے واقف ہیں مادام جو آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں" ایپی نے جواب دیا تھا۔

"ہوسکتا ہے دن ختم ہونے سے قبل آپ ان لوگوں سے واقف ہو جائیں۔"

اس وقت ایپی سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے تنے کی آڑ میں تھی۔ نیچے سڑک پر کار اسے نظر آرہی تھی۔ اس درخت کے پاس ڈرائیور ہی نے اسے کھڑا کیا تھا۔ "اگر آپ کا بیٹا کار میں ہوا تو میں اسے آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ اگر نہ ہوا تو آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ کون لوگ اس کی تلاش میں ہیں۔"

"اگر میرا بیٹا کار میں نہ ہوا تو تمہارا کیا ہوگا؟" ایپی نے پوچھا۔

"میری فکر نہ کرو مادام۔ میں اس قسم کے معاملات سے بارہا گزر چکا ہوں۔ لیکن یاد رکھئے اگر کار میں آپ کا بیٹا نہ ہوا تو اس کا یہی مطلب ہوگا کہ وہ لوگ بس آپ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ ہرگز یہاں سے نہ ہٹئے گا۔ میری مدد کے بغیر وہ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور اب وہ درخت کے تنے کی آڑ میں کھڑی اس کار کو دیکھ رہی تھی جس میں پائلٹ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کار اس سے کوئی چالیس گز کے فاصلے پر تھی اور اس کا رُخ اب پھر اسی طرف تھا جدھر سے وہ آئے تھے۔ پائلٹ نے ہوٹل میں ڈرائیور کا اس شخص سے جس سے اس نے بات کی تھی یہی کہا تھا کہ وہ ایک گھنٹہ بعد اس مقام پر پہنچے، اور اس کار کو دیکھ کر اشارے کے لئے بار بار اپنی کار کی بتیاں جلائے اور بجھائے۔

اچانک پائلٹ نے چیخ کر کہا۔ "مادام ہوشیار، وہ لوگ آرہے ہیں۔ اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔ ہماری باتیں سنتی رہنا۔ اگر کار سے تمہارا لڑکا نکلے تو اس وقت تک کچھ نہ کہنا جب تک کہ میں اسے تمہارے پاس نہ بھیج دوں۔ اگر یہ لوگ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جائیں تو جھیل کے مغربی کنارے پر اسی جگہ پہنچ جانا جہاں ہمارا طیارہ اترا تھا۔ اس جگہ کا نام میڈوک ہے۔ میں وہیں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ لیکن جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ کار میں دو آدمی اگلی نشستوں پر بیٹھے ہیں، ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور ہے۔" پائلٹ نے جلدی جلدی بتایا۔

"مگر میں وہاں کس طرح پہنچوں گی؟" ایپی نے پوچھا۔

"ہڈ کے نیچے مقناطیسی بکس میں چابیوں کا دوسرا سیٹ ہے۔ دائیں طرف۔ اس سے کار چلا سکتی ہیں آپ۔"

اسی وقت ایک سیاہ کار پائلٹ کی کار کے سامنے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر آکر رک گئی۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص کار سے اتر آیا لیکن وہ ایپی کا بیٹا نہ تھا۔ وہ بھاری بھرکم جسم والا شخص تھا۔ اس کے اوورکوٹ کے کالر کھڑے ہوئے تھے۔ اس کی گردن میں ایک دبیز مفلر پڑا ہوا تھا۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا تھا۔ چال میں ہلکا سا لنگ تھا۔ اس کا ساتھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہا۔ ایپی کی نظریں اسی پر جمی تھیں۔ وہ بھی کرافٹ نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے کہ مسز ایمی جیرڈ کار میں موجود ہیں؟"

ساتھ آنے والے بھاری بھرکم شخص نے کہا۔ انگریزی وہ ٹھیک بول رہا تھا لیکن لہجہ جرمن تھا۔

"تو یہ ہے معاملہ تمہارا۔ میں سمجھا!" پائلٹ نے سوچا۔

"مسز ایمی سے کہو کہ راستے پر آ جائیں۔"

"براہ کرم ان کے صاحبزادے سے کہیں کہ وہ بھی کار سے باہر آ جائیں۔"

"بلاوجہ کی باتیں نہ کرو۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

"وقت ہمارے پاس بھی نہیں ہے مسٹر۔ تم دیکھ رہے ہو کار میں صرف ایک شخص اور ہے لیکن وہ مادام ہالوگا نہیں ہے۔" پائلٹ نے کہا۔

"ہم انہیں۔ ان کے بیٹے کے پاس لے جائیں گے۔" بھاری بھرکم شخص نے کہا۔

"اور ہم ان کے بیٹے کو ان کے پاس لے جائیں گے۔"

"بکواس بند کرو۔" بھاری بھرکم شخص نے غصے سے کہا۔

"بکواس کیسی جناب، مجھے اس کام کی رقم ملی ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی میری طرح ہی معاوضے پر کام کر رہے ہیں۔ ہم دونوں کو اپنا اپنا کام کرنا ہے۔"

"میرے پاس تمہاری بکواس سننے کے لیے وقت نہیں۔" یہ کہہ کر بھاری بھرکم شخص کار کی طرف بڑھا۔

"بہتر ہے مسٹر کہ تھوڑا بہت وقت نکال لو، اس لیے کہ مادام کار میں نہیں ہیں۔" پائلٹ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

اس مرتبہ جواب میں بھاری بھرکم شخص نے اوور کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہیں اتنا معاوضہ نہیں ملا ہوگا کہ اس کے عوض اپنی جان دے دو۔ بتاؤ کہاں ہے وہ عورت؟"

"لگتا ہے تمہیں کچھ زیادہ ہی معاوضہ ملا ہے، جو مجھے مارنے پر تل گئے ہو۔"

جواب میں کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ پائلٹ کے پیروں کے قریب سے گرد کا مرغولہ اٹھا۔ ایمی نے سہم کر درخت



کا سہارا لیا۔

"اب بتاؤ، وہ عورت کہاں ہے؟" بھاری بھرکم شخص نے پوچھا۔

"تمہیں عورت چاہیے تو اس کے بیٹے کو پیش کرو، میں اسے اس کی ماں کے پاس لے جاؤں گا۔" پائلٹ نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔

"تم مجھے بتاؤ گے کہ وہ کہاں ہے؟" یہ کہہ کر بھاری بھرکم شخص نے ریوالور کی نال کا رخ پائلٹ کے سر کی طرف کر دیا۔ "ہاں بتاؤ کہاں ہے وہ؟"

ایمی نے سیاہ کار کا دروازہ کھلتے دیکھا تھا، پھر تلے اوپر دو زوردار دھماکے ہوئے۔ پائلٹ نے زمین پر لوٹ لگا دی۔ بھاری بھرکم شخص کے منہ سے چیخ نکلی، اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

جان۔۔۔۔ جان۔۔۔۔۔۔

تیسرا دھماکا ہوا اور بھاری بھرکم ہینس بے جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔ پائلٹ لڑکھڑا کر اٹھ کھڑا ہوا

"وہ تمہیں مارنے والا تھا۔ میں جانتا ہوں۔ ایسے حالات میں اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ جاتا تھا۔" ڈرائیور نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"مجھے مار دیتا، مگر کیوں؟" پائلٹ نے پوچھا۔

"پہلے اس کی لاش کو یہاں سے ہٹانے میں میری مدد کرو۔ پھر میرے ساتھ چلو۔" ڈرائیور نے قریب آ کر کہا۔

"مگر تم کون ہو؟" پائلٹ نے پوچھا۔

"کرافٹ کا ایک دوست۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"کیا میں تمہاری بات پر یقین کر لوں؟"

"کرنا ہی پڑے گا۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔"

اس نے بمشکل تمام خود پر قابو پایا تھا۔ اس کی ٹانگیں جیسے شل اور بے جان ہو گئی تھیں۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا اور آنکھوں میں چبھن سی ہونے لگی تھی۔ ان دونوں نے مل کر بھاری بھرکم شخص کی لاش سڑک سے اٹھا کر درختوں کے درمیان لا کر ڈال دی۔ اسے اب سمجھ میں آیا تھا کہ پائلٹ کے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔

"کیا میں اپنی کار بھی لے کر چلوں؟" پائلٹ نے پوچھا۔

"نہیں، بتیاں گل کر دو اور میرے ساتھ چلو، ہم صبح کو یہ کار یہاں سے لے جائیں گے۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔ "چابیاں ہیں تمہارے پاس؟" اس نے پوچھا۔

اپنی اپنی جگہ یونہی بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ درخت کی آڑ سے نکلی اور لڑکھڑاتی ہوئی کار کی طرف بڑھی۔ پائلٹ نے کہا تھا کہ ڈیش بورڈ کے نیچے مقناطیسی ڈبہ میں کار کی چابیوں کا دوسرا سیٹ موجود ہے۔ اسے اس کار سے میڈوک پہونچنا تھا۔ پائلٹ نے اسے یہی ہدایت کی تھی۔

❊ ❊ ❊

ہلدا چھوٹے سے طیارے میں پائلٹ کے پیچھے بیٹھی تھی۔ اس کی پنڈلی میں ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پٹی بہت کسی ہوئی تھی لیکن دورانِ خون میں خلل نہیں پڑ رہا تھا۔ گولیاں کھانے کی وجہ سے زخم کی تکلیف قابلِ برداشت حد تک کم ہو گئی تھی۔ وہ سہولت سے چل پھر بھی سکتی تھی۔ حالانکہ اگر تکلیف بھی زیادہ ہوتی تب بھی وہ چپ رہتی۔ طیارے کے نوجوان پائلٹ نے پیچھے جھک کر اس سے کہا۔ "طیارہ اترنے کے بعد آپ کو جھیل کے کنارے بنے ہوئے ایک ہوٹل میں پہنچا دیا جائے گا جہاں سے آپ کو شہر کے لئے ٹیکسی مل جائے گی۔ آپ کو آئندہ دو ہفتوں کے دوران ہماری خدمات کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔ اس کے بعد یہ لینڈنگ اسٹرپ سیزن کے لئے بند ہو جائے گا۔ اس جگہ کا نام میڈوک ہے۔ ہمیں آپ کی خدمت کر کے بہت مسرت ہوگی۔"

ایرک قد کاٹھ کا مضبوط آدمی اگرچہ نہ تھا لیکن وہ ضرورت پڑنے پر لڑنے بھڑنے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔ مگر صرف اس وقت جب اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو، ورنہ اپنے مسائل پر وہ ذہنی صلاحیتوں ہی سے صورتِ حال پر قابو پانے کا قائل تھا۔ اور اس وقت اس نے اپنی انہی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کرافٹ نے اسے جو پیغام دیا تھا، اس کا مقصد یہی تھا کہ وہ نادیدہ دشمنوں کو چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اور ایرک نے اس کے اس شبہہ کو تقویت دی بلکہ اسے یقین دلانے کے لئے فوراً ایک حکمتِ عملی وضع کی۔

ہوٹل کی لابی میں کئی رپورٹر قتل کی واردات کے بارے میں کسی سنسنی خیز خبر کی تلاش میں اب بھی موجود تھے۔ اس نے ان اخباری رپورٹروں میں سے ایک کو تاڑ لیا اور ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اسے اعتماد میں لیا اور اسے بتایا کہ اس واردات کے بارے میں اسے چند حقائق معلوم ہیں۔ یہ حقائق پولیس کو بتانا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے قانونی مشیر نے اسے اس سے روک دیا ہے کیونکہ اس کے بیان کا غلط مطلب لیا جا سکتا ہے۔ جس کی بنا پر وہ یہاں بلاوجہ میں گرفتار ہو سکتا ہے جب کہ اگلے دن صبح اسے ہر صورت یہاں سے فرانس چلے جانا ہے۔ جہاں اسے بہت اہم کام ہے۔ رپورٹر اس کے جھانسے میں آ گیا اور اس نے کہا۔ "اگر تم واردات میں ملوث نہیں ہو تو میں تمہارا نام اپنی رپورٹ

تمہیں نہ دوں گا۔

ایرک نے کہا۔ میں بھی بس یہی چاہتا ہوں۔ دو تین منٹ کے لئے یہاں ٹھہرو۔ میں باہر سے اپنا اوور کوٹ لے آؤں۔ میں واپس آ کر سیدھا باہر جاؤں گا تم میرے پیچھے پیچھے چلے آنا کہیں تنہائی میں، میں خود تم سے بات کروں گا۔ یہاں سنو، جب تک میں تمہیں مخاطب نہ کروں، تم میرے پاس نہ آنا۔

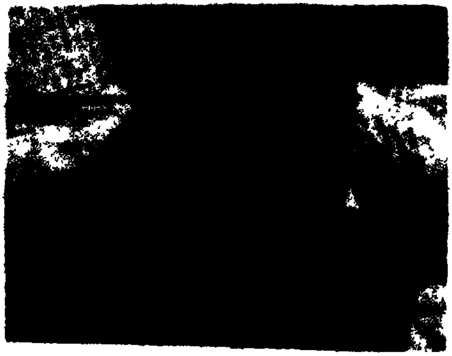
رپورٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ایرک وہاں سے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے کوٹ کی جیبوں میں دو ریوالور موجود تھے۔

چند لمحوں بعد رپورٹر بھی ایرک کے تعاقب میں ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

کرافٹ نے ایک مقام سے پہلے ایرک اور پھر اس کے پیچھے رپورٹر کو نکلتے دیکھا تو وہ محتاط اور چوکنا ہو گیا۔ دو تین منٹ بعد ہی کرافٹ کو یقین ہو گیا تھا کہ ایرک کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہ محفوظ فاصلے سے ان کے تعاقب میں چلتا رہا۔ وہ خوش تھا کہ اس نے جو ترکیب چلی تھی وہ کامیاب رہی تھی۔ دشمن ایرک کا تعاقب کر کے اس تک پہونچنا چاہتا تھا۔ اور اس کا دشمن مقابل تنظیم کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ کرافٹ نے تہیہ کر لیا تھا کہ ایک مرتبہ اس کو قابو میں کر کے اس سے سب کچھ اگلوا لے گا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول کو چھوا اور ان کے تعاقب میں چلتا رہا۔

چار منٹ یہ تعاقب جاری رہا۔ ایرک پہاڑی کے ڈھلان کے آخری سرے پر پہنچ کر بائیں طرف مڑ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی رپورٹر بھی موڑ پر اوجھل ہو چکا تھا۔ کرافٹ نے چند لمحے توقف کیا اور جب اس نے موڑ پر پہنچ کر دیکھا تو اس کے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ ایرک اور اس کا تعاقب کرنے والا، دونوں میں سے کسی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔

کرافٹ نے بے تحاشہ دوڑ لگا دی وہ اس وقت خود کو مجرم سا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی شخص کو اس طرح استعمال کیا تھا مگر وہ کرتا بھی کیا۔ اس سے قبل وہ کبھی ایسے



حالات سے بھی دوچار نہیں ہوا تھا۔

دوسری طرف ایرک موڑ پر بائیں جانب گھومتے ہی آگے جا کر ایک نیم روشن تنگ سڑک پر مڑ گیا تھا۔ وہ بہت تیز قدم اٹھا رہا تھا اور اسی مناسبت سے اخباری رپورٹر نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ کرافٹ کا دور دور تک پتہ نہ تھا اور اسے اب تیزی سے اپنا کام کر دکھانا تھا۔ کوئی سو گز کا فاصلہ طے کر کے وہ ایک تاریک جگہ پہونچ گیا۔ یہاں تنگ سڑک کی ایک طرف جھاڑیوں کے درمیان وہ ٹھہر گیا۔ اس نے اوور کوٹ کی جیب سے ایک پستول نکال لیا اور آہستہ سے رپورٹر کو آواز دی۔ ”یہاں اس طرف آ جاؤ۔ یہاں ہم اطمینان سے بات کر سکیں گے۔“

رپورٹر اس کی طرف بڑھا جب ان کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو ایرک نے اس کے پہلو پر پستول سے فائر کر دیا۔ اس نے گردن کا نشانہ لیا تھا۔ سائلنسر لگے ہونے کی وجہ سے پستول نے ایک ہچکی سی لی۔ رپورٹر لڑکھڑا کر گرا۔ ایرک نے قریب جا کر دوسرا فائر کیا۔ اس مرتبہ اس نے رپورٹر کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔

ایرک نے پستول سے سائلنسر نکالا۔ رپورٹر کے کوٹ کی جیبوں کی جلدی جلدی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی اور ایک نوٹ بک نکال کر ایک طرف پھینکی۔ اپنے کوٹ کی جیب سے دوسرا پستول نکالا اور اس کا دستہ رپورٹر کے ہاتھ میں پھنسا کر انگشتِ شہادت پستول کے ٹریگر پر رکھ دی۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کے دو بٹن توڑ دیئے، قمیص کا گریبان پھاڑا۔ ہتھیلیوں کو

زمین پر گر گیا اور چہرے پر دو ایک جگہ مٹی بھی لگی، بال بکھر گئے۔

ایرک پلٹ کر سڑک کی طرف آیا۔ کرافٹ اب اسی نیم تاریک سڑک کی طرف آچکا تھا۔ ایرک واپس ریو رشر کی لاش کے پاس آیا پستول پر مردہ ہاتھ کی گرفت پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ایرک نے پستول کا رخ آسمان کی طرف کر کے تین مرتبہ جلدی جلدی ٹریگر دبایا۔ فضا میں فائروں کی آواز گونج گئی۔ وہ وہاں سے ہٹ آیا اور پہلا والا پستول پھر ہاتھ میں لے لیا۔

"کرافٹ..... کرافٹ......" اس نے چیخ کر کہا۔

فائر کی آواز سنائی دی۔ "ایرک!" وہ چیخا۔

"کرافٹ!" ایرک چیختا ہوا جھاڑیوں سے نکل کر سڑک پہ آگیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"ہوا کیا؟" کرافٹ نے اس کے قریب پہنچ کر رکتے ہوئے کہا۔

"اس نے..... اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی کرافٹ۔" ایرک نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کس نے؟" کرافٹ نے حیرت سے پوچھا۔

"ادھر آؤ۔" یہ کہہ کر وہ کرافٹ کو جھاڑیوں میں لے گیا اور بولا: "اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بھی گولی چلادی۔"

"تم تو ٹھیک ہو؟" کرافٹ نے پوچھا۔

"بس خدا نے بچا ہی لیا۔ وہ میرے تعاقب میں تھا۔ وہ تمہارے بارے میں بھی واقف تھا۔ مجھ سے یہی پوچھ رہا تھا کہ کرافٹ کہاں ہے۔ اور پھر اس نے مجھے گرا دیا۔" ایرک نے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان کہا۔

کرافٹ زمین پر پڑی ہوئی لاش پر جھک گیا۔ اس کی جیبوں کی تلاشی لی اور مایوس لہجے میں ٹارچ بجھاتے ہوئے کہا۔ "اس کی جیبوں میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے اس کی شناخت ہوسکے۔"

"ہمیں یہاں سے فوراً نکل لینا چاہئے کرافٹ، ہمیں کل کے بارے میں سوچنا ہے۔" ایرک نے کہا۔

"میں ان لوگوں کو آج رات ہی ختم کر دینا چاہتا ہوں۔"

ایرک چند لمحے خاموش رہا، پھر اس نے کہا۔ "تو تم لوگوں کا یہ منصوبہ بنایا تھا......"

کرافٹ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے، لیکن میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ حالات میرے قابو میں ہیں۔ مجھے اپنی والدہ کی طرف سے خطرہ ہے۔ اگر وہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گئیں تو انہیں بھی مار ڈالیں گے، بالکل اسی طرح جیسے انہوں نے سام رچرڈ اور دوسرے لوگوں کو جان سے مار دیا ہے......"

"کن لوگوں نے؟" ایرک نے پوچھا۔

"جنیوا کے دشمنوں نے۔ عقابوں کی تنظیم نے۔ میں ان میں سے صرف ایک کو زندہ پکڑنا چاہتا ہوں، پھر میں اس سے دوسروں کے نام بھی اگلوالوں گا، اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا اور پولیس سے اپنی والدہ کو تلاش کرنے کے لئے مدد حاصل کروں گا۔" کرافٹ نے بتایا۔

"مگر اب ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ شخص مر گیا ہے۔ لیکن جان اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جنیوا پولیس کا نائب سربراہ اس کا گہرا دوست ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میری تم سے ملاقات ہوجائے تو تمہیں ہوٹل روز لے جاؤں۔ وہاں تم فریبکا کے نام سے قیام کروگے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے یہ نام کیوں دیا تھا؟"

"میں جانتا ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جان وہیں ہم سے رابطہ قائم کرے گا۔"

"ہاں۔ وہ بینک والوں سے کل کے لئے تمام انتظامات طے کر رہا ہے کل یہ تمام سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ میں تمہیں یہی بتانا چاہتا تھا۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکل لینا چاہئے۔ جان نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہیں یہ بتا دوں کہ اگر تمہاری والدہ جنیوا پہنچ گئی ہیں تو ہم بہر صورت انہیں تلاش کر لیں گے۔ ہم ان کی حفاظت کریں گے۔"

پھر ایرک نے اسے اگلے روز یعنی ہفتے کے دن بینک ڈائریکٹروں سے ملاقات کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ ●

بہار میں اُردو تحریک

معین الدین عبدالمغنی

پس منظر ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا ایک موضوع آخری مرحلے بہار ہی میں بن گئی۔ اس لئے کہ جس طرح برطانوی سامراج کی ابتدا میں اردو کو پھیلانے کی کوشش کی گئی، اسی طرح اس کی انتہا پر ملک کے اندر ابھرتے ہوئے لسانی سامراج نے اردو کے خلاف محاذ آرائی کی، اور ۱۹۳۷ء ہی سے جب ذمہ دار ہندوستانی حکومت کا تجربہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت شروع ہوا۔ اقتدار وقت نے اردو کے خلاف ایک پالیسی متعین کرلی، حالانکہ قومی سطح پر غیر ملکی سامراج کے خلاف لڑائی اہل ملک کے عزائم کی ترجمانی میں سب سے مؤثر رول اردو ہی ادا کرتی رہی تھی۔ بہرحال جب ملک آزاد ہوا تو بعض اہم قومی رہنماؤں کے ذہن کے برخلاف مجموعی اور عمومی طور پہ حکومت کا رویہ اردو کے متعلق مبنی بر انصاف نہیں رہا۔ اس کے باوجود کہ پورے ملک میں رابطے کی واحد زبان آج کی طرح کل بھی اردو ہی تھی، اس کو سرکاری زبان نہیں بننے دیا گیا۔ اور دستور ساز اسمبلی میں صدر کے کاسٹنگ ووٹ سے اردو کے مقابلے میں فقط ہندی ۱۹۵۰ء میں ہندوستان کی آئندہ سرکاری زبان قرار دے دی گئی، جب کہ اردو کو صرف دستور کے شیڈول ۸ کے تحت ملک کی متعدد قومی زبانوں میں ایک کی حیثیت سے درج فہرست کر دیا گیا۔ بس۔ یا ست

جموں و کشمیر میں وہاں کی مخصوص صورت حال کے پیش نظر اردو۔ کشمیری زبان بنائی گئی۔ دستور میں علاقائی زبان کے لئے دفعہ ۳۴۷ اور سرکاری زبان کے لئے دفعہ ۳۴۵ تجویز کی گئیں۔ مگر ان میں کسی کا استعمال کبھی کسی ریاست میں اردو کے لئے نہیں کیا گیا۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے اپنی ساتویں رپورٹ ۱۹۶۵ء میں قرار دیا کہ اردو کے لئے کسی حکومت نے دفعہ ۳۴۷ کا استعمال نہیں کیا۔ جب کہ ۱۹۵۶ء میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے اپنی رپورٹ میں درج کیا تھا کہ انتظامی مقاصد کے لئے اقلیتی زبان کے استعمال کا اختیار ریاستوں کو دے دیا گیا ہے۔ خود دستور کے اندر دفعہ ۳۵۰ کے تحت ملک یا ریاست میں بولی جانے والی کسی بھی زبان میں عرضیاں وصول کرنے اور ان کا جواب دینے کی گنجائش رکھی گئی اور ۱۹۶۱ء کی وزرائے اعلیٰ کانفرنس نے اس دفعہ کی تعمیل پر زور بھی دیا۔ اسی طرح دستور کی دفعات ۱۲۰ اور ۲۱۰ میں پارلیمنٹ اور اسمبلی میں کسی بھی ہندوستانی زبان میں تقریر اور اس کی رپورٹ کا حق دیا گیا ہے۔ یہ آئینی حقوق دستور کی دفعہ ۲۹ کی تشریح کرتے ہیں جس میں ضمانت دی گئی ہے کہ شہریوں کا کوئی طبقہ جو اپنی ایک مستقل زبان، رسم الخط اور ثقافت رکھتا ہے۔ اس کو اس کے تحفظ کا حق ہوگا۔

اردو تحریک کی ابتداء

دستور ہند کی منظوری اور جمہوریہ ہند کے قیام کے بعد تدریج کے چند برسوں میں واضح ہوگیا کہ جب تک آئینی تحفظ کے باوجود عملاً اردو کو تعلیمی نظام کا جزو اور عام کاروبار کا حصہ بنانے کی کوئی قانونی صورت نہیں نکالی گئی۔ تو ریاستی حکومتیں اردو کو نظر انداز کرنے کی اس روش پر قائم رہیں جو انھوں نے ۱۹۴۷ء سے اختیار کر رکھی تھی، بلکہ تقسیم ہند سے پیدا ہونے والے فرقہ وارانہ تعصبات کے نتیجے میں یہ اردو دشمن رویہ زیادہ سخت ہوگیا اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے ۱۹۵۸ء میں پٹنے میں ایک بار اردو کنونشن کا انعقاد ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام عمل میں آیا۔ جب کہ اس سے قبل ۱۹۵۱ء میں آزاد ہندوستان کا پہلا تاریخی اردو کنونشن پٹنے میں منعقد ہو چکا تھا اور انجمن ترقی اردو کی نئی تشکیل ریاست میں اس کے بعد ہو چکی تھی۔ ۱۹۵۱ء کے کنونشن کی پہلی میں ایک دستخطی مہم کا آغاز انجمن نے بہت بڑے پیمانے پر کیا اور بالآخر ۱۹۵۴ء میں دس لاکھ دستخطوں کا ایک محضر انجمن کے ترتیب دیئے ہوئے وفد نے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں پیش کیا۔ اسی زمانے میں اتر پردیش میں اردو کے لئے دستخطی مہم چلی اور وہاں سے بیس لاکھ دستخط صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ بہار اور اتر پردیش دونوں جگہوں سے مطالبہ کیا گیا کہ دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق اردو کو ان ریاستوں کی علاقائی زبان قرار دیا جائے۔ لیکن اس مطالبے پر مرکز نے کوئی توجہ نہیں دی اور معتد بہ تعداد کے آئینی الفاظ کی تشریح کے سرکاری گورکھ دھندے میں پیس کر دستخطوں کے پرزے اڑ گئے۔ اس حادثے نے ... اتر پردیش کی اردو دنیا پر ایک سکتہ سا طاری کر دیا۔

بہار میں تحریک کا اگلا قدم

اس واقعے کا بہت سخت ردعمل بہار اردو دوستوں پر ہوا اور انھوں نے ۱۹۶۰ء میں ریاستی انجمن ترقی اردو کے اجتماع منعقدہ مظفر پور میں مطالبہ کیا کہ دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق اردو کو بہار کی سرکاری زبان ہندی کی طرح بنایا جائے۔ ۱۹۶۲ء کے انتخاب عام کے موقع پر انجمن نے اردو کے متعلق حکومت وقت کے رویے کے خلاف ایک سخت موقف اختیار کیا اور اس وقت کے صدر انجمن جناب [illegible] مرحوم نے وزیر اعلیٰ بہار شری جھا کے مقابلے پر راج محل کے حلقے سے اسمبلی کے لئے اپنا پرچہ نامزدگی

داخل نصاب اس کا نفاذ فوراً عمل میں آئے اور حکومت سے گفت و شنید کرنے کے لیے انجمن کا ایک مطالبہ بنا دیا گیا۔ [illegible] اردو [illegible] پورا کر دیا۔ سب انجمن نے [illegible] اسمبلی [illegible] واپس لے لیا گیا تھا۔ جب نئے [illegible] تھا۔ جب اردو آزادی کی بے چینی بڑھنے لگی تو [illegible] کے اردو کنونشن [illegible] بہار [illegible] انجمن ترقی اردو منعقدہ پٹنہ نے اردو کو [illegible] الیکشن [illegible] بنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء کے انتخاب کے موقع پر [illegible] یہ مسئلہ آگیا۔ اس وقت انجمن کے صدر جناب غلام [illegible] تھے۔ انہوں نے تمام سیاسی جماعتوں سے مطالبہ کیا کہ اردو کو سرکاری زبان بنانے کے سوال پر اپنا موقف واضح کریں۔ کانگریس کے سوا تمام جماعتوں نے اپنے منشور میں اعلان کیا کہ وہ اگر برسر اقتدار آگئیں تو [illegible] اردو کو سرکاری زبان بنائیں گی۔ لہٰذا انجمن نے کانگریس مخالف جماعتوں کی حمایت کا فیصلہ کیا، جب کہ ڈاکٹر سید محمود کے زیر صدارت مسلم مجلس مشاورت نے کانگریس کی حمایت کا اعلان کیا۔

انتخاب میں کانگریس ہار گئی، غیر کانگریسی جماعتوں کے متحدہ محاذ کی حکومت بہار میں بنی، اس نے اپنے ۳۳ نکاتی پروگرام میں ایک نکتہ یہ بھی رکھا کہ اردو کو سرکاری زبان بنایا جائے گا، یہاں [illegible] فیصلے [illegible] اسمبلی میں گورنر کے خطبے میں بھی اس کا ذکر آگیا۔ لیکن قانون بننے کی بجائے رانچی میں فرقہ وارانہ فساد ہوگیا۔ اور اس کے نتیجے میں [illegible] وزارت بالکل ناکام رہی۔ [illegible] میں ریاستی انجمن ترقی اردو کی [illegible] کانفرنس پٹنہ میں ہوئی اور پالیسی کی تجویز میں حکومت خاص کر وزیر تعلیم [illegible] کرپوری ٹھاکر کی توجہ [illegible] گئی ہے [illegible] کی مخالفت کی بنا پر [illegible] نے اس تجویز کو رد کر کے حکومت کے خلاف [illegible] تجویز...

بہار کی اردو تحریک دو صفوں میں بٹ گئی

منتقل کی جو راقم السطور نے پیش کی۔ اس وقت سے انجمن میں دو مختلف مکاتب فکر کی [illegible] کشمکش شروع ہوگئی یہاں تک کہ [illegible] میں [illegible] تھا [illegible] بعد [illegible] میں کانگریس دوبارہ بہار میں برسر اقتدار [illegible] اور اس کے چند ماہ بعد عبدالغفور [illegible] کے دور [illegible] اور غیر [illegible] تحریک [illegible] کے نام سے شروع ہوئی جو [illegible] کے [illegible] تحریک [illegible] انجمن [illegible] اس کے ہم [illegible] ہے۔

تحریک کا نیا مرحلہ

۱۹۷۹ء میں انجمن کا [illegible] اجلاس [illegible] تھا [illegible] مظفر پور میں منعقد ہوا۔ بہار کی اردو تحریک [illegible] گئی۔ انتخاب کے بعد راقم السطور نے [illegible] صدر منتخب [illegible] مجلس [illegible] اردو کو [illegible] زبان بنوانے کے لیے ایک نئی جدوجہد شروع کی۔ [illegible] تھا [illegible] تب انجمن ترقی اردو [illegible] ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کی وزارت کے درمیان [illegible]

تشدید ہوئی اس کے نتیجے میں وزیر اعلیٰ بہار نے دس فیصد اردو آبادی پر مشتمل پندرہ اضلاع میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا۔ لیکن آنے والے انتخاب میں ان کی جماعت ہار گئی اور ریاست میں ایک بار پھر غیر کانگریسی جماعتوں سے ترکیب پانے والی نومولود جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہوئی جس میں ایک وزیر کابینہ ریاستی انجمن کے ایک سابق بنائے گئے۔ اس حکومت نے پچھلی وزارت کے فیصلے کو پس پشت ڈال دیا اور خود بھی اردو کے لئے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا جب تک یہ وزارت اور اس کے اعلیٰ کمان کی حکومت مرکز میں قائم رہی اس کے سربراہ [illegible] اختیار، وزیر اعظم، وزیر داخلہ، وزیر صحت اور وزیر اعلیٰ بہار وغیرہ مسلسل اردو کے خلاف بیانات دیتے رہے۔ اس وقت [illegible] گیر سطح پر انجمن ترقی اردو نے جنتا پارٹی کی اردو مخالف مہم کا زبردست مقابلہ کیا جس سے خاص کر بہار میں اردو کے لئے ایک عوامی فضا بنی۔ کانگریس کے رہنماؤں (اندرا گاندھی) نے اردو تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور اردو کے تمام مطالبات کی پرزور تائید کی۔

اسی فضا میں ۱۹۸۰ء میں مرکزی انجمن کے اقدام پر جناب عبدالغفور، سابق وزیر اعلیٰ بہار کی زیر نگرانی انجمن ترقی اردو بہار کی بڑی بھری ممبر سازی ہوئی اور انجمن کی تاریخ میں پہلی بار ڈیڑھ لاکھ عوامی ممبران بنائے گئے۔ یہ ممبر سازی انجمن کی دونوں صفوں نے مل کر کی تھی اور توقع تھی کہ ۱۹۷۵ء کے بعد ایک بار پھر اردو تحریک کی سب سے بڑی تنظیم میں جو ایک بکھراؤ سا خلا پیدا ہو گیا تھا وہ بند ہو جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا اور انجمن کی عوامی سطح بہت وسیع ہو جانے کے باوجود [illegible] چند افراد جو ۱۹۷۵ء سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے ہوئے ہیں، بند رہی ہے۔ چند رفقا کے بچھڑ جانے کا واقعہ یہ ہے کہ پیچھے رہ جانے کے باوجود بہار کا روانے

اردو بہت تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں جب انتخاب کا موقع آیا تو ایک بار پھر انجمن ترقی اردو بہار نے اپنی تحریک شدید کر کے اور اس کے مطالبے پر کانگریس (آئی) نے اپنے منشور میں اس عہد کا اعلان کیا کہ دوبارہ برسر اقتدار آتے ہی وہ اردو کو اضافہ شدہ سابق قانون میں ترمیم کر کے بہار کی ایک سرکاری زبان بنا دے گی جب کہ دوسری کسی سیاسی جماعت، خاص کر جنتا پارٹی یا لوک دل، نے ایسا کوئی عہد نہیں کیا۔ انجمن نے ریاست کی اردو آبادی سے اپیل کی کہ وہ کانگریس کو برسر اقتدار لا کر اپنا عہد پورا کرنے کے لائق بنائے۔ انتخاب میں کانگریس کی فتح ہوئی اور ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کی تشکیل کابینہ نے اپنی پہلی ہی نشست میں فیصلہ کیا کہ وہ اردو کو بہار کی سرکاری زبان بنائے گی جب کہ وزارت کا حلف لیتے ہی ڈاکٹر مشرا نے اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن کابینہ کا ایسا فیصلہ ۱۹۶۷ء میں دو بار، ایک انتخاب سے قبل کرشن بلبھ سہائے وزارت کے ذریعے اور دوسرا انتخاب کے بعد مہامایا [illegible] کی جانب سے کیا جا چکا تھا۔ اس کے علاوہ بہار سے پہلے آندھرا میں بعض علاقوں میں اردو کے سرکاری استعمال کے چند ذیلی قوانین کچھ عرصہ قبل منظور کئے جا چکے تھے اور گجرال کمیٹی کی ایک سرکاری رپورٹ میں اردو کے لئے بعض سہولتوں اور رعایتوں کی سفارشات کی جا چکی تھیں۔

تحریک کی پہلی بڑی کامیابی

ان حالات میں انجمن ترقی اردو بہار کی قیادت نے جگن ناتھ مشرا وزارت پر واضح کر دیا کہ وہ ریاست میں قانونِ اردو کی منظوری کے سلسلے میں کوئی تاخیر گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور بہاری ریاست میں اردو کی اہم سرکاری حیثیت سے کم کوئی چیز قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوگی۔ جب حکومت کی جانب سے کچھ تاخیر ہونے لگی تو اردو تحریک نے

ایک بہت بڑا قدم عوامی سطح پر اٹھایا اور انجمن نے پورے بہار کا طوفانی دورہ کیا اور جگہ جگہ عوامی جلسوں سے خطاب کر کے ملک بھر میں اردو کے سوال پر ہمدردی پیدا کی۔ ۱۹۶۱ء میں اردو دوستوں نے شہروں اور قصبوں کا ایک ایک گاؤں اردو کی سرکاری حیثیت کا مطالبہ پیش کرنے کے لئے لگا دیا۔ انجمن کی قیادت نے نومبر ماہ کی آخری تاریخ بھی قانون سازی کے لئے مقرر کر دی۔ اسی زمانے میں انجمن کی نئی ممبر سازی اور اس سلسلے میں عوامی رابطے کا ایک بہت بڑا تجربہ ہوا [illegible]۔ جب ممبر سازی کی مہم پایۂ تکمیل کو پہنچی تو انجمن کے ابتدائی ممبروں کی تعداد تقریباً تین لاکھ ہو گئی۔

ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے جو بہار کے وزیر اعلیٰ تھے اردو تحریک کا اثر قبول کرتے ہوئے ایک جمہوریت پسند کی طرح نومبر میں وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کی سالگرہ کے موقع پر اردو کو سرکاری زبان بنانے کا آرڈیننس جاری کروا دیا۔ انجمن ترقی اردو بہار نے دسمبر کے اوائل میں انھیں ایک عوامی استقبالیہ دیا اور ایک سپاس نامہ پیش کیا جس میں ان سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ اسی ماہ چند روز بعد ہونے والے اسمبلی کے اجلاس میں ہی اردو کی سرکاری حیثیت کا بل لایا جائے۔ وزیر اعلیٰ نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ اب فرقہ پرستوں اور اردو دشمنوں میں ایک کھلبلی مچ گئی اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے ریاست میں اردو کے سوال پر ایک بار پھر فساد کرانے کی کوشش کی۔ لیکن انجمن نے دیگر اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ رابطہ کر کے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حکمراں جماعت کی طرف سے پیش کئے جانے والے اردو بل کی تائید و حمایت کریں چنانچہ سبھی اپوزیشن پارٹیوں کے رہنماؤں نے اخبارات میں مشترکہ بیان دے کر اردو کے کاز کی وکالت اور



پہلے صدر جمہوریہ ہند عزت مآب ڈاکٹر راجندر پرشاد مرحوم

اس کاز کے خلاف فرقہ پرستوں کی سازشوں کی مذمت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے درمیان اردو مخالف مہم بے اثر ہو گئی اور جب اسمبلی میں اردو کا بل پیش کیا گیا تو تمام جماعتوں نے بیک آواز اسے منظوری دی اور صرف بی جے پی کے مٹھی بھر ممبران ایوان سے باہر [illegible] کے لئے چلے گئے۔

قانونِ اردو کی اہمیت

۱۹۳۶ء تک ملک کے سیاسی مسئلے کا حل نکالنے کے لئے پٹنہ میں انجمن ترقی اردو کی کوششوں سے عبدالحق، راجندر پیکٹ پر دستخط ہوئے اور طے پایا کہ آزاد ہندوستان کی قومی سرکاری زبان اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں ہندوستانی ہوگی۔ لیکن ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد اس قومی میثاق کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور آزاد ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں فقط صدر اسمبلی یعنی مذکورہ پیکٹ پر ایک دستخط کرنے والے ڈاکٹر راجندر

چند اور کے [illegible] سے صرف ہندی کو [illegible] گئی اور بہار میں زبان بنا دی گئی اور اردو کو یکسر نظر انداز کر کے اس کو تسلیم کیا گیا۔ [illegible] ریاست کی سرکاری تو کیا علاقائی زبان بھی اسے تسلیم نہ کیا گیا۔ اس کی اصل تحریک [illegible] کے دس سالہ تجربہ کے بعد یہ موقف اختیار کر لیا کہ آئینی طور پر اردو کے لئے انصاف کا مطالبہ کرنے کا [illegible] راستہ رہ گیا ہے کہ آئین و دستور کی دفعہ [illegible] کے مطابق ۱۹۵۰ء کے آفیشیل لینگویج ایکٹ میں [illegible] کے ذریعے ترمیم کر کے ہندی کے ساتھ [illegible] اردو کو بھی ایک علاقائی زبان بنایا جائے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کی وزارت نے انجمن ترقی اردو بہار کے مطالبے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے انتخابی منشور ۱۹۸۰ء کی روشنی میں بہار آفیشیل لینگویج امنڈمنٹ ایکٹ ۱۹۸۰ء کے نام سے اردو کی سرکاری حیثیت کا قانون دستور کی دفعہ [illegible] کے مطابق تقریباً پورے ایوان کے اتفاق رائے سے [illegible] اسمبلی اور کونسل میں منظور کرایا۔ اس طرح ۱۹۸۰ء میں بہار کے [illegible] میں اردو کا قانونی حیثیت کے لئے جو جدوجہد کیا گیا تھا وہ [illegible] کے بعد بار آور ہوا یعنی [illegible] اردو کو اس کا کھویا ہوا مقام بہار میں واپس ملا۔

اس طرح کشمیر سے باہر آزاد ..... ہندوستان کی کم از کم ایک ریاست میں اردو دوبارہ قومی نظام اور عوامی زندگی کا ایک جز بن گئی۔ اس کا رشتہ روزگار اور [illegible] سے [illegible] ہو گیا۔ وہ محض [illegible] مردہ [illegible] زبان کی حیثیت سے یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو میں دفن نہیں ہوئی۔ ایک زندہ [illegible] عوامی زبان کی حیثیت سے محکموں اور دفتروں میں اس کے استعمال کا انتظام ہوا۔ اردو کا سوال فقط [illegible] تہذیبی، لسانی اور ادبی سوال نہیں رہا، ایک سیاسی معاشی اور معاشرتی سوال بن گیا۔ چنانچہ اس بات کا امکان پیدا ہوا کہ [illegible] اردو کے [illegible] اور اس کے ذریعے اپنے [illegible] کوشش کریں [illegible] اس لئے کہ [illegible] اس کے علاوہ بہار میں اردو کی سرکاری حیثیت نے پورے ملک [illegible] ایک راہ دکھائی [illegible] ہے [illegible] متحدہ ملک کی قومی [illegible] کے لئے ایک قابل عمل [illegible] بہار کے قانون اردو سے [illegible] آزاد ہندوستان [illegible] سے محفوظ ہو جائے گا۔ اور ایک بار پھر قومی [illegible] پیدائش اور ترقی ہوئی تھی۔

نمونے کا قانون

مغربی بنگال میں بائیں محاذ [illegible] کے زیر قیادت بائیں [illegible] اردو کے متحدہ محاذ کی حکومت نے فقط چند اضلاع میں اردو کے جزوی استعمال کے لئے انتظامی احکام جاری کئے ہیں جب کہ بہت قبل آندھرا میں بعض علاقوں میں اردو کے سرکاری استعمال کے لئے کچھ ذیلی قوانین بنائے گئے تھے اور گجرال کمیٹی کی رپورٹ نے تو سرے سے اردو کی کسی بھی علاقے میں سرکاری حیثیت کے لئے کوئی سفارش ہی نہ کی تھی۔ لیکن ۱۹۸۱ء میں باضابطہ ترمیمی ایکٹ کے ذریعے پورے بہار میں کسی بھی علاقے اور کسی بھی مقصد کے لئے ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کے سرکاری استعمال کا قانونی اختیار حکومت کو دے دیا گیا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۸۱ء میں حکومت نے انتظامی سہولت کے پیش نظر نفاذ قانون کے پہلے مرحلے پر پندرہ

ضلع میں حسب ذیل سات کاموں کے لئے اردو کے استعمال کا گزٹ نوٹیفیکیشن جاری کیا۔

۱۔ اردو میں درخواستوں، عرضیوں اور دستاویزوں کی وصولی اور اندراج میں لایا جانا۔

۲۔ اردو میں لکھی دستاویزوں کا رجسٹریشن آفس کے ذریعے اندراج کیا جانا۔

۳۔ اہم سرکاری قواعد، احکام، اصول اور ضابطوں کی اردو میں بھی اشاعت

۴۔ عوامی اہمیت کے سرکاری احکام و ہدایات کا اردو میں بھی جاری کیا جانا۔

۵۔ اہم سرکاری اشتہارات کی اردو میں بھی اشاعت۔

۶۔ ضلع گزٹ کے اردو ترجمہ کی بھی اشاعت۔

۷۔ اہم سائن بورڈوں کا اردو میں بھی لکھا/لگایا جانا۔

ان کاموں کے لئے پندرہ اضلاع میں جہاں سے ڈسٹرکٹ بلکہ ہر ٹاؤن تک تقریباً نو سو اردو کے سند یافتہ مترجموں، نائب مترجموں اور ٹائپسٹوں کا تقرر عمل میں آچکا ہے۔ عام اردو آبادی کی ضروریات کے لئے یہ کام بڑی حد تک کافی ہیں۔ اب پرائمری سے یونیورسٹی تک کی سطحوں پر اردو کی تعلیم کا بندوبست بہار میں پہلے سے ہے۔ قانون اردو کے نفاذ کے دوسرے مرحلے پر مزید دس اضلاع میں اردو کے سرکاری استعمال کے احکام جاری کرنے کا مطالبہ حالیہ ایام میں انجمن ترقی اردو بہار مسلسل کرتی رہی ہے۔ اور حکومت نے مطالبہ پورا کرنے کی امید بھی دلائی ہے جس کے بعد تیرہ اضلاع رہ جائیں گے۔ جو تیسرے مرحلے پر لئے جائیں گے۔

کسی ریاست میں اردو کی سرکاری حیثیت کے لئے یقیناً بحالات موجودہ یہ ایک نمونے کا قانون ہے اور اس سے کم کسی چیز پر کسی ریاست میں اردو دوستوں کو راضی نہیں ہونا چاہئے، ورنہ یہ اردو کے ساتھ ایک فریب ہوگا۔ انجمن ترقی اردو ہند اب اپنے تمام جلسوں میں پالیسی کی یہ تجویز بعد منظور کرلی ہے کہ دوسری ریاستوں میں بھی اردو کی سرکاری حیثیت کا قانون بہار کے قانون کے نمونے پر بنایا جائے۔ حکومت ہند اور ملک کی سطح پر مختلف جماعتوں اور کانگریس نے بھی بہار کے قانون کو مثالی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۸۵ء کے اجلاس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے اجلاس میں اعلان کیا کہ وہ اردو ... دیگر ریاستوں میں بھی بہار کی طرح اردو کو سرکاری زبان بنائے گی۔

تحریک کی منزل

انجمن ترقی اردو نے بہار میں ۱۹۶۰ء سے اردو کی سرکاری حیثیت قانون ہونے کے لئے جو تحریک پچھلے ۲۵ سال میں چلائی ہے، اس کا نتیجہ نکلا ہے کہ بہار کی ... یونیورسٹی تک کی سطحوں پر عام تعلیمی اداروں میں اردو کی تعلیم کا بندوبست عام طور پر پایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ مشکلات بعض وقت پیش آتی ہیں وہ عملی اور جزوی قسم کی ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت کے تسلیم شدہ، ملحقہ اور عملی طور پر امداد یافتہ اقلیتی اسکول اور کالج بالکل سرکاری اسکولوں اور کانسٹیٹیونٹ کالجوں کے برابر تمام ضروری سہولتوں کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں کام کر رہے ہیں۔ بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے ملحق سیکڑوں مدارس اسلامیہ ہیں جن کی ڈگریوں کو ہائی اسکولوں اور کالجوں کی ڈگریوں کے مساوی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور جنھیں سرکاری تعلیمی اداروں کی طرح تنخواہ وغیرہ کی تمام سہولتیں حاصل ہیں۔

یہ یقیناً ریاست میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کی سیاسی و عوامی تحریک کا فیض ہے، اس لئے روزگار اور کاروبار سے الگ کر کے فقط اردو کی تعلیم کا وعظ بالکل بے اثر ہوتا ہے۔ آخر وہ لوگ اردو کیوں پڑھیں، جنھوں نے اپنی مذہبی و تہذیبی زبان ہونے کے باوجود پہلے عربی پھر فارسی کو گویا ترک کر دیا، اس لئے کہ اب ان زبانوں

انقلابی تبدیلی عمل و ظہور میں نظر نہیں آتا اور وہ دنیا بھر کو کرشت کا مظاہرہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، چنانچہ سنگین حقائق ہے۔ انجمن ترقی اردو بہار نے جمہوریۂ ہند کی دوسری دہائی شروع ہوتے ہی اردو کے لسانی و تہذیبی سوال کو ایک معاشی و سیاسی سوال بنا دیا اور صرف دو دہائیوں کے اندر اپنا مقصد بہت بڑی حد تک حاصل کر لیا۔

لیکن بہار کی اردو تحریک ابھی اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچی ہے۔ اردو نہ صرف ہماری واحد ادبی زبان ہے بلکہ آج کے ہندوستان میں واحد تہذیبی زبان بھی ہے گرچہ یہ ساتھ ہی ساتھ پورے ملک کے مشترکہ کلچر کا بھی بہترین قومی ذریعۂ اظہار اور انڈین یونین میں واحد رابطے کی زبان ہے۔ لہٰذا انجمن ترقی اردو بہار اردو کو تمام عملی مقاصد کے لئے مکمل و مؤثر طور پر قومی نظام اور انتظامیہ کا جزو بنانا چاہتی ہے۔ مستقبل میں اوّل تو اسے قانونِ اردو کے نفاذ کی پوری ریاست اور اس کے تمام محکموں میں تکمیل کرانی ہے، دوسرے اور ساتھ ہی ساتھ اردو کی عام تعلیم میں جہاں کہیں کوئی کسر رہ گئی ہے اسے وہ پورا کرانا چاہتی ہے۔ یہ بات بہت صاف ہے کہ اب بہار ایک دو لسانی ریاست بن چکا ہے اور یہاں ہندی اور اردو کو ساتھ ساتھ ترقی کرنی اور ریاست کی ترقی کے لئے کام کرنا ہے اس طرح ہندوستانی بشمول اردو ہندی کا وہ خواب پورا ہوگا جو ملک کی آزادی کے لئے قربانی دینے والوں نے دیکھا تھا اور اسی طور سے قومی یکجہتی کی وہ مہم بھی کامیاب ہوگی جو آزاد ہندوستان میں ایک عرصۂ دراز سے چل رہی ہے۔

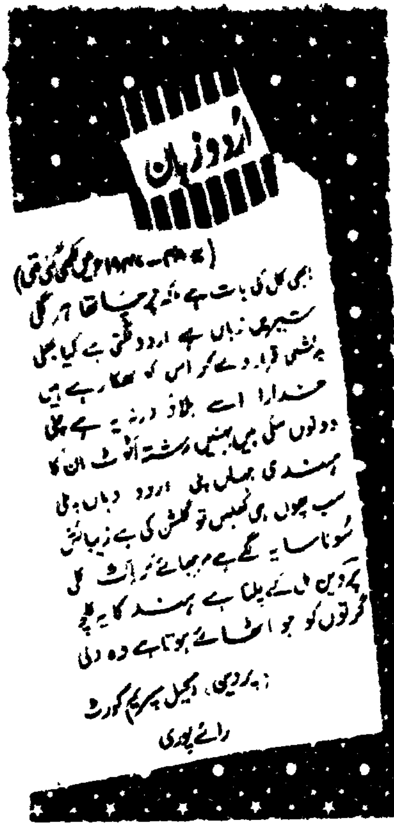
اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ سکنڈری ایجوکیشن میں سہ لسانی فارمولے کے تحت جہاں پہلی زبان مادری زبان ہے وہیں دوسری زبان ایک جدید ہندوستانی زبان ہو تاکہ جس طرح اردو بولنے والے ہندی پڑھتے ہیں اسی طرح ہندی بولنے والے بھی اپنی خوشی سے اردو پڑھیں تاکہ ایک قومی زبان کے مقابلے میں دوسری قومی زبان کو بے جا امتیاز حاصل نہ ہو اور دونوں قومی زبان کے بولنے والے ایک دوسرے کی زبان سیکھ کر یک جہت ہو جائیں۔ ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے بھی دوسری قومی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کا استعمال پرائمری سے یونیورسٹی تک تمام مضامین کے لئے ہونا چاہئے اور اردو کی معیاری درسی و علمی کتابیں ہر مضمون میں فراہم کی جائیں۔ اس لئے کہ ریاست اور ملک کی ترقی اب قومی زبانوں کے ساتھ ہی وابستہ ہے، غیر ملکی زبان کا دور ختم ہو چکا ہے۔ بہار میں اردو ذریعۂ تعلیم کے ساتھ اردو ذریعۂ امتحان کی بھی جو سہولت حاصل ہے اس پر پورے طور سے عمل درآمد ہونا چاہئے۔

ریاست کی ترقی اور اردو

کسی ریاست کی ترقی میں کسی زبان کا حصہ تعلیمی وانتظامی اور علمی و ادبی ہر سطح پر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ عوامی جدوجہد بھی ضروری ہوتی ہے۔ بہار کی اردو تحریک نے کم از کم ریاست میں ایک ایسی لسانی فضا بنائی ہے جس میں عوام اور علماء کے تمام طبقات مل جل سکتے ہیں تو ہر قسم کی ترقیات میں حصہ لے سکتے ہیں اور زبان کی دشواری کے سبب کوئی طبقہ پچھڑا ہوا رہ کر پوری ریاست کی پس ماندگی کا خطرہ نہیں پیدا کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت سے مطالبات اور سہولتیں حاصل کرنے کے علاوہ اپنی حدود میں انجمن ترقی اردو بہار خود بھی کچھ کام کرتی رہتی ہے۔ اس کے ممبروں کی بڑھتی ہوئی تعداد ہر جگہ سماجی کارکن پیدا کر رہی ہے جو تعمیری کاموں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرا رہے ہیں۔ انجمن کا اردو تعلیمی کیمپ ہزاروں غیر اردو دانوں کو بہت ہی مختصر مدت میں اور آسان طریقے پر اردو سکھا رہا ہے۔ اس کے حلقۂ ادب کی دیگر ادبی سرگرمیوں کے علاوہ اس کا ماہنامہ مریخ ادب کی صحیح سمت کا پتہ دے کر ادیبوں شاعروں کو صحیح

سلسلے کو شکل کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا تعلیمی بورڈ ان کا بھی انتہائی اہم رول ادا کرتا ہے۔ اردو کی تعلیم کے مسائل سے نبرد آزما ہے۔ مناسب مواقع پر انجمن جیسے قومی مقاصد کے لئے بہت سے اہم کام بھی چلاتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۱ء کی مردم شماری میں انجمن نے باضابطہ اپنے آرگنائزر ہر کمشنری میں مقرر کرکے جس طرح حکومت کے ساتھ تعاون کیا اس کا اعتراف تحریری طور پر خود مردم شماری کے کمشنر نے کیا اور اس کے نتیجے میں ۱۹۷۱ء کی بہ نسبت تقریباً تین گنا زیادہ اردو آبادی کا اندراج ہوا۔ انجمن کے دفاتر ریاست کے دارالسلطنت کے علاوہ متعدد اضلاع میں باضابطہ کام کر رہے ہیں اور عوام و حکام سے رابطہ کرکے ریاست کی ترقی میں اردو اور اردو آبادی کا حصہ متعین کرانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس مقصد کے لئے انجمن کے ڈویژنل آرگنائزر اپنے علاقوں کا دورہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ انجمن کی ریاستی عاملہ پابندی سے تمام مسائل پر اپنا موقف حکومت وقت اور پورے سماج کے سامنے واضح کرتی رہتی ہے۔ اس طرح ہر قسم کے ترقیاتی امور میں اردو تحریک کی سب سے بڑی تنظیم ملک کی سب سے بڑی اقلیت اور حکومت کے درمیان رابطے کا کام کر رہی ہے۔ انجمن کی نئی ممبر سازی کے لئے چھ لاکھ رسیدیں دفتر سے جاری ہو چکی ہیں۔ انجمن کے مطالبے پر پٹنہ میں ایک 'اردو بھون' تعمیر ہو رہا ہے اور حکومت نے اس کے لئے ۱۹ لاکھ روپے منظور کئے ہیں۔

انجمن کے مطالبات کی روشنی میں حالیہ برسوں میں حکومت بہار نے اردو اور اردو آبادی کی ترقی کے لئے چند ادارے قائم کئے ہیں، جن میں ایک بہار اردو اکادمی ہے اور دوسرا مذہبی و لسانی اقلیتی کمیشن۔ ان کے علاوہ عبدالغفور وزارت نے اقلیتوں کی لسانی سہولتوں کے لئے ایک کمیٹی محکمہ تعلیم کے اندر تشکیل دی تھی جو بعض وجوہات کے سبب کام نہ کر سکی، مگر بعد میں اسی کے نمونے پر گرچہ کچھ



چھوٹے پیمانے پر ایک خالص سرکاری سیل جگن ناتھ مشرا وزارت نے محکمے کے ایک افسر کے تحت تشکیل دیا جو اقلیت کی تعلیمی مشکلات اور شکایات دور کرنے کے لئے مامور تھا اور کچھ دنوں تھوڑا بہت کام کرتا بھی رہا۔ اردو کے سرکاری زبان بن جانے کے بعد حکومت نے ایک تو سرکاری سطح پر نفاذِ قانون کی نگرانی کے لئے اردو صلاح کار کمیٹی بنائی، دوسرے راج بھاشا کے محکمے میں اس نے ایک اردو داں ڈپٹی ڈائرکٹر مقرر کیا۔

میرے سامنے دن آپا اور غلام حسین شام کو واپس گھر آ گئے۔ میں اب غلام حسین کو غلام حسین نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ قانونی اور شرعی طور پر میرا بہنوئی بن چکا تھا۔ مجھے ہدایت دی گئی تھی کہ میں اس سے دولہا بھائی کہا کروں۔

آپا اس دن ساڑی پہنے ہوئے تھیں۔ میں نے پہلے دن آپا کو ساڑی میں دیکھا۔ اس سے پہلے تو انھوں نے کبھی ساڑی نہیں پہنی تھی۔ بلکہ ان کے پاس تو کوئی ساڑی تھی ہی نہیں۔ میں آپا کو ساڑی میں دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ کس قدر خوبصورت لگ رہی تھیں وہ۔ انھوں نے خاصا میک اپ بھی کر لیا تھا۔ اور ان کا چہرہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔۔۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ کچھ بجھی بجھی اور افسردہ تھیں ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ویرانی تھی جسے میں اس وقت بھی بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ ان کی مسکراہٹ پھیکی اور مصنوعی تھی۔

دولہا بھائی تو بالکل چھیلا بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے سر میں تیل کی شاید پوری بوتل انڈیل دی تھی اور اپنے بالوں کو جن کی تعداد خاصی کم تھی بڑے اہتمام کے ساتھ چندیا پر چپکا رکھا تھا۔ دولہا بھائی کا تقریباً آدھا سر گنجا اور ان کی اول چندیا خوب چمک رہی تھی۔ انھوں نے آج پتلون اور قمیص پہنی ہوئی تھی اور پتلون پر سیاہ چمکدار

کھلاڑی

ایک نوجوان کی ہنگامہ خیز سلسلہ وار سرگزشت

• الف صدیقی



بیلٹ بامدھی ہوئی تھی، جو ان کے موٹے سے پیٹ پر ٹکنے کے بجائے ناف کے نیچے کھسک گئی تھی اور اس طرح ان کی توند اور بھی زیادہ نمایاں ہو گئی۔ وہ بار بار بیلٹ کو اوپر کھینچتے تھے، لیکن توند کی ڈھلان کی وجہ سے وہ پھر نیچے کو کھسک جاتی تھی۔

امی اور ابا، دولہا بھائی اور آپا کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ آپا اور دولہا بھائی اپنے ساتھ مٹھائی کا ایک بڑا سا ڈبہ بھی لائے تھے جو دولہا بھائی نے امی کے ہاتھ میں دے دیا۔ میرے تمام چھوٹے بہن بھائی حریص نظروں سے مٹھائی کے ڈبے کو دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو شاید میں خود بھی اسے حریص نظروں سے دیکھتا، لیکن اس وقت مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس وقت تو میں صرف اپنے اور آپا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"کہو بیٹی، خوش تو ہو؟ اچھی تو ہو؟" ابا نے آپا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ دولہا بھائی اپنے پیلے پیلے دانت نکالتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

"ہاں ابا!" آپا نے مختصر سا جواب دیا۔

"اور تم... غلام حسین،" شاید ابا کہنا چاہتے ہوں "اور تم بیٹا غلام حسین،" لیکن وہ غلام حسین کے لئے لفظ "بیٹا" نہ استعمال کر سکتے تھے، کیونکہ دونوں کی عمروں میں بالکل معمولی سا فرق تھا۔

"جی اچھا ہوں۔" دولہا بھائی نے پوری بتیسی باہر نکال کر جواب دیا۔ "آپ لوگوں کی دعا ہے۔"

امی اور ابا دولہا بھائی سے باتیں کرنے لگے اور آپا وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئیں۔ میں ان کے ساتھ ساتھ آگیا۔ ہم دونوں کمرے میں اکیلے تھے۔ آپا نے بے تابی کے ساتھ مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور میرا سر سہلانے لگیں۔

اُفوہ۔ کس قدر مہک آ رہی تھی آپا کے کپڑوں سے۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انسانی لباس اس قدر بھی مہکتا ہوا بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے گھر میں تو کوئی خوشبو لگاتا ہی نہیں تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ ہمارے گھر میں خوشبو کی کوئی شیشی کبھی خریدی لائی گئی ہو۔ میں دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ آپا نے اپنے کپڑوں میں اس قدر خوشبو کیوں لگا رکھی ہے۔ میں اپنی اس حیرانی کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"آپا، تم نے اپنے کپڑوں میں اتنا عطر کیوں لگا رکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "تمہارے تو سارے کپڑے اس قدر مہک رہے ہیں۔"

"میں نے خود سے تو نہیں لگایا۔" آپا نے آہستہ سے کہا "بس تمہارے دولہا بھائی چاہتے تھے کہ میں پوری شیشی اپنے اوپر انڈیل لوں۔ تم اچھے تو ہو شیرے؟ ہمیں یاد کرتے ہو؟" اور آپا کی آواز بھرا سی گئی۔

"لو بھلا، میں تمہیں نہیں یاد کروں گا تو اور کسے یاد کروں گا۔" میں آپا کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گیا۔ "میں تو تمہیں روزانہ یاد کرتا ہوں۔ مجھے تو اب یہ گھر بھی نہیں اچھا لگتا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"دھیرے دھیرے عادی ہو جاؤ گے۔" آپا نے بے جان سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "بس، شرارتیں اور بدتمیزیاں نہ کرنا اور خوب دل لگا کر پڑھتے رہنا۔"

"ارے ہاں آپا۔" مجھے فوراً وہ بات یاد آگئی۔ "تمہیں یاد ہے، تم نے شادی سے پہلے کہا تھا کہ تم ٹیوشن کرو گی اور پھر تمہیں جو پیسے ملیں گے..."

"مجھے یاد ہے۔" آپا نے جلدی سے کہا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے، تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے بارے میں کچھ اور ہی سوچ رہی ہوں۔"

"کیا سوچ رہی ہو آپا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"جو کچھ سوچ رہی ہوں، وہ ابھی نہیں بتا سکتی۔" آپا نے کہا۔ "پہلے تمہارے دولہا بھائی سے بات کر لوں، پھر بتاؤں گی۔"

آپا کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر انھوں نے چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے مجھ سے پوچھا۔ "عرفان چچا کے گھر گئے تھے؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ "میں تمہاری شادی کے بعد اس گھر نہیں گیا۔"

آپا ناخوش ہو گئیں۔ پھر چند لمحوں کے بعد بولیں: "وہ لوگ آئے تو ضرور ہوں گے شادی میں۔ میرا مطلب ہے عرفان بھیا اور سراج ... رخسانہ بجیا کا تو مجھے معلوم ہے کہ وہ نہیں آئی تھیں۔"

"وہ لوگ نہیں آئے تھے" میں نے جواب دیا۔ "نہ تو عرفان بھیا آئے تھے اور نہ سراج بھائی۔ دونوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔"

میں اس وقت کے ان سوالوں کا مطلب اور اُن کے دل کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ اس قصے کے بارے میں تو بہت بعد میں ساری معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

"آپا چلو امی بلا رہی ہیں۔" اچانک صغیر نے کمرے میں داخل ہو کر کہا اور ہمارا سلسلۂ گفتگو منقطع ہو گیا۔ ہم دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

"آؤ بیٹی چائے پیو۔" امی نے بڑی چاہت اور اپنائیت کے انداز میں کہا۔ کوثر اور تسنیم نے دولہا بھائی کے سامنے وہ چھوٹی سی میز لا کر رکھ دی تھی جو کمرے میں ایک طرف رکھی رہتی تھی اور صرف مہمانوں کے آنے پر ہی استعمال کی جاتی تھی۔

مجھے یہ سب کچھ بہت ہی عجیب اور ناقابلِ یقین سا لگ رہا تھا۔ اس گھر میں جہاں آپا کی اب تک کی عمر نوکرانیوں کی طرح کام کرتے ہوئے، امی کی گالیاں اور جھڑکیاں سنتے ہوئے، ان کی مار کھاتے ہوئے، ذلتیں سہتے ہوئے گزری تھی۔ اس گھر میں آج ان کا استقبال مہمانوں کی طرح کیا جاتا تھا۔ امی جو آپا سے بہت کم سیدھے منہ بات کیا کرتی تھیں، آج اپنے ہاتھ سے انھیں چائے کی پیالی پیش کر رہی تھیں۔ کوثر اور تسنیم جن کی آپا خدمت گزاری کرتے کرتے تھک جایا کرتی تھیں اور پھر بھی ان کے احکامات اور فرمائشوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا، آپا کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں۔

"واقعی شادی ہو جانے کے بعد تو لڑکیوں کی قسمت ہی بدل جاتی ہے۔" میں نے سوچا۔ "یہ قسمت ہی تو ہے کہ آپا کی شادی ہو گئی۔ اب امی ان کے گھر تو نہیں ہیں جو انھیں ماریں اور ڈانٹیں گی تو نہیں۔"

دولہا بھائی مسکرا مسکرا کر ابا اور امی سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں کا زیادہ تر موضوع ان کا کاروبار اور اس سے ہونے والا منافع تھا۔

"امی، میں آج بشیرے کو اپنے ساتھ لے جاؤں؟" آپا نے اچانک بڑی لجاجت سے پوچھا۔ "کل شام کو واپس پہنچا دوں گی۔"

"میں خود چھوڑ جاؤں گا۔ کل دکان بند کرنے کے بعد" دولہا بھائی نے کہا۔ "اصل میں ان کی بڑی خواہش ہے کہ ایک دن کے لئے چھوٹے بھائی کو گھر بلا کر رکھیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ زیادہ دن کے لئے بلا لیں، لیکن پھر یہی سوچا کہ آپ لوگوں کو تکلیف ہو جائے گی..."

"نہیں نہیں، کوئی بات نہیں۔" ابا نے جلدی سے کہا۔ "تم جتنے دن کے لئے چاہو بشیرے کو لے جاؤ۔"

"ہاں بھیا۔" امی نے ابا کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ "ضرور لے جاؤ۔"

"بس ایک دن کے لئے کافی ہے۔" دولہا بھائی نے کہا۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولے: "کیوں میاں چلو گے؟"

"ہاں چلوں گا۔" میں نے اپنی بے پایاں مسرت کو دباتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ کو مجھے چھوڑنے آنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ میں خود آ جاؤں گا۔ مجھے سب معلوم ہے کہ کون سی بس کہاں جاتی ہے۔"

"بڑے تیز معلوم ہوتے ہو۔" دولہا بھائی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ ان کی اس بات کو اپنی تعریف سمجھوں یا تضحیک۔

"اے ماشاءاللہ بڑا ذہین بچہ ہے۔" امی نے جلدی سے میری پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "بالکل اپنی بہن کی طرح پڑھنے لکھنے میں بھی تیز۔ کبھی آج تک فیل نہیں ہوا۔ ہماری سکینہ بھی آج تک کبھی فیل نہیں ہوئی۔"

"اچھا چچا جان اور چچی جان!" دولہا بھائی بولے: "ہم لوگ اس وقت ایک خاص مقصد سے آپ کے پاس آئے ہیں!"

"چچا جان اور چچی جان!" میں دل ہی دل میں ہنسا۔ دولہا بھائی عمر میں امی سے تو کسی طرح بھی کم نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے برابر کے ہی ہوں گے۔ ابا سے شاید ایک آدھ سال چھوٹے ہوں گے۔ اور وہ ان لوگوں کو چچا جان اور چچی جان کہہ رہے تھے۔ بہت خوب!

"ہاں ہاں کہو غلام حسین!" ابا نے ایک دم سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ گذارش یہ ہے کہ اگلے جمعے کو آپ سب لوگ رات کا کھانا ہمارے گھر کھائیے گا!"

"نا بھیا نا!" امی فوراً نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولیں۔ "یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ بیٹی داماد کے گھر جا کر دعوتیں اڑانا معیوب بات ہے!"

"تمہاری چچی ٹھیک کہہ رہی ہیں!" ابا نے کہا: "ماں باپ کے لئے اپنی بیٹی اور داماد کے گھر مہمان بن کر جانا ایک غلط بات ہے، ہاں البتہ اگر تم چاہو تو میں بچوں کو بھیج دوں گا!"

"ارے آپ لوگ کون سے زمانے کی باتیں کر رہے ہیں؟"

دولہا بھائی نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا: "یہ تو سب پرانے دستور تھے جو نہ جانے کب کے ختم ہو گئے ہیں۔ آج کل کے دور میں کون ایسی باتوں کو سوچتا ہے۔ بڑے آدمیوں کے ہاں برابر دعوتیں اور پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں عورتوں کے میکے والے، سسرال والے، سبھی تو شامل ہوتے ہیں۔ خود میری دکان سے کتنا کتنا سامان جاتا رہتا ہے کہ ایسی دعوتوں کے لئے اور مجھے نوکروں کی زبانی سب پتا چلتا رہتا ہے کہ کس بڑے گھر کی دعوت ہے کون کون سے مہمان آئے تھے۔ سارے بڑے بڑے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں آج کل وہ ہمارے محلے میں ایک جج صاحب رہتے ہیں۔ اُن کی بیٹی تو ولایت سے پڑھ کر آئی ہے۔ بال کٹائے گھومتی ہے۔ اس کی شادی ہوئی تھی کوئی دو مہینے پہلے۔ اس کی سسرال ادھر کہیں گلفشن کی طرف ہے۔ جج صاحب اور ان کی بیوی ابھی ایک ہفتے تک اپنی بیٹی اور داماد کے گھر رہنے کے بعد پرسوں ہی واپس آئے ہیں!"

"بڑے لوگوں کی تو بڑی باتیں ہیں بھیا!" امی نے کہا۔ "مگر..."

"اگر مگر کچھ نہیں چچی جان!" دولہا بھائی نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "بس آپ لوگ آ رہے ہیں ہمارے گھر سب بچوں کے ساتھ!"

"ہاں امی!" آپا نے کہا: "تم لوگ ضرور آؤ!"

"اچھا بھئی اگر تم لوگوں کا اتنا اصرار ہے تو ہم ضرور آئیں گے!" ابا نے کہا۔

ابا نے اصرار کر کے آپا اور دولہا بھائی کو کھانے کے روک لیا۔ کوثر اور تسنیم نے اس دن بہت کام کیا۔

کافی رات گئے ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ میں بے حد خوش تھا کہ آپا کے گھر رہنے کے لئے جاؤں گا۔ میں اس سے پہلے اُن کے گھر نہیں گیا تھا۔ مجھے تو بس اتنا معلوم تھا غلام حسین کا گھر اچھی جگہ میں کہیں ہے۔

باہر نکل کر کچھ دور جا کر دولہا بھائی نے رکشہ لیا اور ہم تینوں اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

دولہا بھائی کی دستک کے جواب میں ایک معمر عورت نے دروازہ کھولا۔ جو بڑی ہنس مکھ تھی۔ اس کی شکل دولہا بھائی سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر مجھے فوراً یاد آیا کہ میں اسے پہلے دیکھ چکا ہوں۔ آپا کی منگنی والے دن یہ عورت ہمارے گھر آئی تھی۔ اور پھر شادی والے دن بھی میری اس پر نظر پڑی تھی، لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ عورت کون ہے۔

"آ گئے تم لوگ؟" عورت نے مردوں جیسی بھاری آواز میں کہا: "بڑی دیر کر دی؟"

"ہاں باجی دیر ہو گئی" دولہا بھائی نے کہا: "دراصل چچا جان اور چچی جان نے کھانے پر روک لیا تھا!"

"اور تم جلدی سے بیٹھ گئے پیٹ کھول کر کھانے کو" عورت نے دولہا بھائی کو گھورتے ہوئے خاصے ناخوش

بھابی نے کہا۔

"ارے نہیں باجی،" دولہا بھائی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولے، "یہ تو تیار نہیں ہو رہا تھا، لیکن چچا جان نے اتنی ضد کی کہ ہم دونوں ہی مجبور ہو گئے۔ آخر یہ بھی تو بُری بات ہوتی اگر ان لوگوں کے اتنا کہنے کے باوجود ہم ان کی بات نہ مانتے۔"

"یہ شاید دلہن کا بھائی ہے؟" باجی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں،" دولہا بھائی بولے، "یہ آج اسے اپنے ساتھ لے آئی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ بہت یاد آئے گا۔ کل تک رہے گا یہ یہاں۔"

"پہلے کے کھانے کے لئے کہہ دیا ہے ان لوگوں سے؟" باجی نے جیسے میرے وجود کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے دولہا بھائی سے پوچھا۔

"ہاں، کہہ دیا ہے،" دولہا بھائی نے جواب دیا، "مان نہیں رہے تھے۔ بڑی مشکل سے تیار ہوئے۔"

رات کافی ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد سونے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دولہا بھائی کا گھر کافی بڑا اور اچھا تھا، کم از کم مجھے تو اپنے چھوٹے سے اور کباڑخانے والے گھر کے مقابلے میں وہ کوئی محل معلوم ہو رہا تھا۔ اس میں کئی کمرے تھے۔ دو برآمدے تھے۔ ایک آگے کی طرف اور دوسرا پیچھے کی طرف۔

"تم کچھ کھاؤ پیو گے بشیرے؟" اچانک آپا نے مجھ سے پوچھا۔

"اس وقت؟" میں نے حیرت سے کہا، "ہم تو گھر سے کھانا کھا کر چلے ہیں۔"

"ان کا مطلب ہے شاید تمہیں پھر بھوک لگ گئی ہو،" دولہا بھائی نے ہنستے ہوئے کہا، "شاید تم نے اپنے گھر پر یہاں آنے کی خوشی میں پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا ہو۔"

"نہیں، میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے،" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو اب جا کر آرام کرو،" دولہا بھائی نے کہا، "ہم لوگ سونے جا رہے ہیں۔ باجی تمہیں بتا دیں گی کہ کہاں سونا ہے۔"

دولہا بھائی اور آپا اپنے کمرے میں چلے گئے اور انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں باجی کے ساتھ چلا گیا۔ مجھے یہ دولہا بھائی کی باجی ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ ان کا چہرہ بالکل سخت تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا، ہر وقت غصے میں رہتی ہیں۔ ان کی آنکھیں چھوٹی اور بڑی تیز تھیں اور جب وہ گھور کر دیکھتی تھیں تو یوں لگتا تھا گویا ان کی یہ آنکھیں سیدھی جسم کے اندر گھستی چلی جا رہی ہیں۔ برچھی جیسی تیز اور نکیلی نظروں کے آگے کوئی کچھ نہ بول پاتا تھا۔ ان باجی کے بولنے کے انداز میں بھی بالکل نرمی نہیں تھی۔ بھاری مردوں جیسی آواز میں جب وہ کوئی بات کہتی تھیں تو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ صرف حکم دینے اور دوٹوک فیصلے کرنے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہیں۔

"آؤ، کیا نام ہے تمہارا۔ ہاں بشیرے،" انہوں نے اٹھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں خاموشی سے ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کمرے میں آ گئے۔ جہاں پر دو مسہریاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور ان میں سے ایک پر صاف ستھرا بستر تھا۔ سرہانے جو تکیہ رکھا تھا اس پر خوبصورت غلاف چڑھا ہوا تھا جس کے کنارے پر سفید جھالریں لگی ہوئی تھیں۔ ایسی مسہری، ایسا بستر اور ایسا تکیہ میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ میرے اپنے گھر میں تو صرف چارپائیاں تھیں، اور محلے کے گھروں میں سے جہاں میرا آنا جانا تھا، صرف زبیدہ پھپھی اور ہاشم چچا کا گھر ایسا تھا جہاں دو مسہریاں تھیں، لیکن وہ بہت پرانی تھیں اور میل جم جم کر ان کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ ان پر بستر بھی پرانے ہی تھے، لیکن یہاں دولہا بھائی کے گھر کے اس کمرے میں، ہر چیز دل کو موہ لینے والی تھی، صاف ستھری اور تقریباً نئی۔ اس مسہری کے علاوہ جس پر بستر بچھا ہوا تھا، ایک اور مسہری بھی تھی، جو خالی تھی۔ کمرے میں دو مسہریوں کے علاوہ چند اچھی کرسیاں

اور ایک میز بھی موجود تھی۔

"میں تمہارے لئے اس دوسری مسہری پر بستر بچھائے دیتی ہوں۔" باجی نے کہا، "یہ میرا کمرہ ہے اور تم یہیں پر سو جانا۔"

انھوں نے دوسری مسہری پر بھی صاف ستھرا بستر بچھا دیا۔ اور میں اس پر آرام سے لیٹ گیا۔ زندگی میں پہلی بار میں ایک مسہری پر اور اتنے صاف ستھرے بستر پہ لیٹا تھا۔ میرے سرہانے جو تکیہ تھا وہ بڑا نرم اور صاف ستھرا تھا۔ مجھے اس بستر پہ لیٹنے سے بڑا مزہ آرہا تھا۔ باجی دوسری مسہری پہ لیٹ گئیں جو قریب ہی تھا۔

"دُلہن۔ میرا مطلب ہے سکینہ تم سے کتنی بڑی ہے؟" باجی نے اپنے بستر پہ لیٹے لیٹے مجھ سے پوچھا۔

"کوئی چار سال کے قریب۔" میں نے جواب دیا۔

"بس، تم دونوں ہی بہن بھائی ہو نا؟" انھوں نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ "ہماری تین چھوٹی بہنیں اور دو چھوٹے بھائی اور بھی ہیں۔"

"اے وہ تو ہاجرہ کی اولادیں ہیں۔" باجی نے خاصی بھاری آواز اور تند لہجے میں کہا۔ "وہ کوئی تمہارے سگے بھائی بہن تھوڑی ہیں۔ سگے تو صرف تم دونوں ہی ہو نا؟"

"جی ہاں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کھانے کو ٹھیک سے دیتی ہے تمہاری سوتیلی ماں؟" انھوں نے پوچھا۔ "تمہیں اور تمہاری بہن کو تو آدھے پیٹ ہی کھانا دیتی ہوگی۔"

"ن... ن نہیں تو۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ وہ نہ جانے کس قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے ان سے ڈر لگنے لگا۔ کہیں ابا اور امی کو ان باتوں کا پتہ چل جائے تو کتنی بری بات ہوگی۔

"نہیں تو کیا؟" انھوں نے عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے "نو آدمیوں کا اتنا بڑا ٹبر۔ نو کھانے والے اور ایک کمانے والا اور وہ بھی کارخانے کا ایک معمولی سا مزدور۔ کیا خاک بھرتا ہوگا پیٹ۔ ٹھیک سے روٹی بھی تو نصیب نہیں ہوتی ہوگی۔"

میں بالکل خاموش ہو گیا۔ ان کی ان باتوں سے میرے دل کو بڑی تکلیف پہنچی تھی۔ اس وقت میں یہ بھول گیا کہ امی میری سوتیلی ماں ہیں۔ انہی کے بچے میرے سوتیلے بھائی بہن ہیں اور امی ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتی ہیں۔ اس وقت میں صرف ایک خاندان کے نمائندے کی حیثیت سے سوچ رہا تھا۔ باجی کو کیا حق تھا کہ وہ اس طرح ہم لوگوں کو غریب ہونے کا طعنہ دیں۔ اور میرے ابا کے بارے میں ایسی باتیں کہیں۔ ہم جو کچھ بھی تھے، کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے تو نہیں جاتے تھے۔

"کتنی تنخواہ ملتی ہے تمہارے ابا کو؟" قدرے توقف کے بعد انھوں نے پھر پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے سچ سچ کہہ دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے ابا کی تنخواہ نہیں معلوم تھی اور نہ ہی میں نے کبھی جاننے کی کوشش کی تھی۔

"ہاجرہ تو تم دونوں کو بہت مارتی ہوگی؟" انھوں نے کہا۔ "اور تمہارا باپ اسی کے گن گاتا ہوگا۔"

"امی تو نہیں مارتیں۔" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ میں ان کے الٹے سیدھے سوالوں سے سخت بیزار ہو رہا تھا۔

"امی تو نہیں مارتیں۔" انھوں نے بڑے بھونڈے انداز میں میری نقل اتارتے ہوئے کہا۔ "مجھے الو بنانے چلا ہے لڑکے۔ ارے وہ تو سارا محلہ جانتا ہے کہ کتنی مارتی ہیں۔ مجھے تو رتی رتی حال معلوم ہے تمہارے گھر کا۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"ارے تمہارے سارے پڑوسیوں کو معلوم ہے۔" انھوں نے بڑے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "زرینہ کو بھی معلوم ہے۔ اسی نے مجھے سب کچھ بتایا ہے اور کیا میں تمہارے گھر دیکھنے آتی ہوں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔"

مجھے یہ بات سن کر زرینہ خالہ پر سخت غصہ آیا۔ انھوں نے کتنی خراب حرکت کی تھی۔ ہمارے گھر کی باتیں وہ نہ جانے کہاں کہاں بیان کرتی پھرتی ہیں۔

"تمہاری بہن تو بوجھ تھی سوتیلی ماں پر۔" انھوں نے

مجھے لیتا آپ سے باتیں کرتے ہوئے بھر بھری آواز میں آہستہ آہستہ کہا۔ "ابو جب زندہ ہوں گی تو اس بڑے سانحے کے بعد کبھی یاد نہ دیتی۔ لیکن بھلا اسے کون کہے کہ گھر بیاہی عمر رسیدہ سے دوسری شادی کرنے سے تو اپنی عمر کے جوڑ کی کوئی عورت تلاش کرلے، مگر اُسے جوان بیٹھا چاہیے تھی۔ اور یہ سب وجہ ہے زرینہ کو اتنا کچھ تو سمجھتی ہی نہیں، مری جاتی ہے دیوانی۔ کیا بات پہ کچھ بھروسہ ہوتا ہے ایسی لڑکیوں کا۔ جب بھی موقع ملے اِدھر اُدھر آنکھ لڑاتی پھرتی ہیں۔ اس بوجھل گدھے سے سنبھالی جائے گی یہ۔۔۔"

میں باجی کی باتیں سن رہا تھا اور میرا دماغ گھوم رہا تھا اور میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ جن میں سے کئی باتوں کا مطلب تو میں بالکل ہی نہیں سمجھ سکا تھا۔ بہرحال اتنی بات تو صاف ظاہر تھی کہ وہ اس شادی کے سخت خلاف تھیں اور جیسا کہ وہ کہہ رہی تھیں، انھوں نے دولہا بھائی اور زرینہ خالہ کو ایسا کرنے سے منع بھی کیا تھا، لیکن یہ کس قدر عجیب انسان تھیں کہ میرے منہ پر دولہا بھائی کے لئے "بڈھا سانڈ" اور "بوجھل گدھا" جیسے الفاظ استعمال کر رہی تھیں۔ کھلم کھلا دولہا بھائی کو بُرا کہہ رہی تھیں اور زرینہ خالہ کے خلاف بس باتیں کر رہی تھیں۔ میرے لئے یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔

"مگر یہ ہیں کون؟" میں نے دل میں سوچا۔ "انھوں نے ہم لوگوں کے گھر میں گھستے ہی دولہا بھائی کو اس بات پر ڈانٹا تھا کہ وہ اپنی سسرال سے کھانا کھا کر کیوں آئے؟ تو کیا یہ دولہا بھائی ان سے ڈرتے ہیں؟ کیا زرینہ خالہ بھی ان سے ڈرتی ہیں؟ کمال ہے، یہ دولہا بھائی کے گھر میں رہتی ہیں اور انہی کو ایسی بُری بُری باتیں کہتی ہیں۔"

"تم اسکول میں پڑھتے ہو؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔

"کون سی جماعت میں؟" وہ بولیں۔

"میں نے چھٹی پاس کر لی ہے" میں نے کہا۔ "جب اسکول



کھلیں گے تو میں ساتویں میں جاؤں گا۔"

"تم دونوں بھائی بہن بہت خوبصورت ہو" اچانک انھوں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ "تمہاری ماں یقیناً خوبصورت ہوں گی۔ تم نے تو شاید اپنی ماں کو دیکھا بھی نہیں۔"

"جی نہیں" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے انھیں نہیں دیکھا۔"

"قسمت ہے اپنی اپنی" انھوں نے ایک سانس بھر کر کہا اور میری طرف سے پشت کرلی۔ انھوں نے گویا اب بات چیت کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی کہ ان کے الٹے سیدھے سوالوں سے نجات ملی۔

صبح کا ناشتہ میرے لئے زندگی کا پہلا اتنا عمدہ اور بھرپور ناشتہ تھا۔ سارا ناشتہ باجی نے ہی تیار کیا تھا۔ تلے ہوئے انڈے، مکھن لگے ہوئے ڈبل روٹی کے توس، شکر پڑی ہوئی بالائی اور بہت سارا دودھ پڑی ہوئی چائے۔ ایسا ناشتہ اس سے پہلے تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

میں جلدی جلدی تھوک نگلنے لگا۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دولہا بھائی نے پورے تین تلے ہوئے انڈے کم از کم سات آٹھ توسوں کے ساتھ کھائے پھر انھوں نے مزید دو توس شکر ملی ہوئی بالائی کے ساتھ کھائے اور ایک بڑی سی بھیانک ڈکار لی اور پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ باجی نے انھیں کھاجانے والی نظروں سے دیکھا، اور وہ ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"دلہن، تم اتنا کم کیوں کھاتی ہو؟" باجی نے آپا سے پوچھا: "ارے تمہارے تو کھانے پینے کے دن ہیں، خوب اچھی طرح کھایا کرو۔"

"جی بس میں تو اتنا ہی کھاتی ہوں باجی،" آپا نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔

"شرماؤ نہیں بشیرے،" باجی نے میری طرف دیکھ کر کہا: "اچھی طرح کھاؤ، تمہاری بڑی بہن کا گھر ہے، کسی غیر کا گھر نہیں ہے۔"

"جی کھا تو رہا ہوں۔" اصل میں میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں بہت سارا کھاؤں۔ ساری میٹھی بالائی توسوں کے ساتھ لگا کر کھا جاؤں، لیکن میں اپنی اس خواہش کو روکے ہوئے تھا۔ باجی اور دولہا بھائی کے سامنے میں ندیدے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ رات باجی مجھے غربت اور فاقہ کشی کے طعنے دے چکی ہیں۔

دولہا بھائی تو ناشتہ کرنے کے تھوڑی دیر بعد دکان پر چلے گئے۔ باجی نے ناشتے کے برتن اٹھائے، آپا نے اُن کی مدد کرنی چاہی تو باجی نے انھیں سختی سے منع کر دیا: "ابھی نہیں دُلہن،" انھوں نے کہا: "جمعے کے دن سے۔ اس دن تمہارا ہاتھ لگواؤں گی کھانا پکانے میں۔ بس پھر اپنے گھر کو سنبھالنا۔"

باجی باورچی خانے میں چلی گئیں اور میں اور آپا کمرے میں آگئے۔ یہ آپا اور دولہا بھائی کا کمرہ تھا جواب تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اُفوہ کس قدر خوبصورت کمرہ تھا۔ یہاں کی ہر چیز مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ میں اُن کے بستر پر نیم دراز ہو گیا تھا۔

"آپا، یہ باجی کون ہیں؟" میں نے سرگوشی میں آپا سے پوچھا۔

"یہ ہماری نند ہیں،" آپا نے چپکے سے جواب دیا: "تمہارے دولہا بھائی سے اور بھائی صاحب قیوم، دونوں سے بڑی ہیں۔ یہ یہیں رہتی ہیں، اسی گھر میں اپنے بھائی کے ساتھ۔"

"کیوں، اُن کا اپنا گھر نہیں ہے کوئی؟"

"کیوں نہیں ہے!" آپا نے جواب دیا: "تین تین مکان ہیں ان کے تو۔ ایک مکان ان کا پیر کالونی میں ہے، ایک جمشید روڈ پر اور ایک فردوس کالونی میں ہے۔ مگر تینوں مکانات انھوں نے کرائے پر اٹھا رکھے ہیں۔ خوب بہت سے روپے آتے ہیں اُن کے پاس ہر مہینے۔ ان کا فردوس کالونی والا مکان ہے، اس کے ساتھ دکانیں بھی ہیں۔ دکانوں کا کرایہ الگ آتا ہے۔"

"تو پھر یہاں کیوں رہتی ہیں؟" میں نے پوچھا: "اپنے کسی گھر میں کیوں نہیں رہتیں؟"

"بات یہ ہے کہ دونوں بھائیوں کے علاوہ ان کا کوئی اور ہے نہیں،" آپا مجھے چپکے چپکے بتانے لگیں: "یہ بیوہ ہیں آج سے پانچ سال پہلے ان کے میاں کا انتقال ہو گیا۔ اصل میں وہ سود پر روپیہ چلاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے بہت سی رقم کمائی تھی اور تین مکانات بنوا لیے تھے۔ اپنی بیوی کو سونے سے لاد دیا تھا انھوں نے۔ پھر یوں ہوا کہ آج سے پانچ سال پہلے لین دین کے معاملے میں کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ ان کا بیٹا بھی تھا جس کی عمر اس وقت کوئی بیس سال کے قریب تھی۔ باپ بیٹے دونوں رات دن سود کے کاروبار میں لگے رہتے تھے۔ وہ لوگوں کی قیمتی چیزیں گروی رکھ کر انھیں سود پر روپیہ دیتے تھے۔ اور اگر مقررہ وقت پر رقم مع سود کے واپس نہیں ملتی تھی، تو گروی رکھی ہوئی چیز ضبط کر لیتے تھے جو ہمیشہ قرض دی ہوئی رقم سے کہیں زیادہ مالیت کی ہوتی تھی۔ تو ہوا یوں کہ ان کا کسی سے جھگڑا ہو گیا۔ کسی آدمی نے اپنی بیوی کا بہت سا زیور ان کے پاس گروی رکھوایا تھا

واقعہ گزر گیا اور وہ شخص قرض کی رقم ادا کرنے کا حلف اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے کافی عرصے کے بعد اس شخص نے رقم لوٹانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا لیکن انھوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ اس شخص نے اپنے بعض ساتھیوں کی مدد سے ان لوگوں پر حملہ کر دیا۔ دونوں باپ بیٹا مارے گئے تب سے باجی قدسیہ بیوہ ہو گئیں۔ اور بے اولاد بھی۔ لیکن جائیداد اور پیسہ بہت ہے ان کے پاس۔ اسی زمانے میں تمہارے دولہا بھائی کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ چنانچہ یہاں آ کر اپنے چھوٹے بھائی کے پاس رہنے لگیں اور تب سے یہیں رہ رہی ہیں۔"

"تمہیں ان کے بارے میں اتنی بہت سی باتیں کس طرح معلوم ہو گئیں آپا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"زرینہ خالہ نے مجھے پہلے ہی دن ان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔" آپا نے سرگوشی کی۔ "خاصی بدمزاج اور تیز طبیعت کی ہیں اور بہت زیادہ منہ پھٹ بھی۔ مگر بات یہ ہے کہ اتنی بڑی جائیداد کی مالک ہیں۔ کوئی آل اولاد ان کے ہے نہیں جو کچھ ہے ان کے پاس وہ ان کے دونوں بھائیوں کا ہے۔ اس لئے وہ ان کی ساری باتیں خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ ڈرتے ہیں اُن سے۔" آپا نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ یہ اپنی جائیداد کسی اور کے حوالے کر دیں۔ اس لئے ان کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔ اور وہ زرینہ خالہ ہیں نا، پیٹھ پیچھے تو ان کی خوب برائی کرتی ہیں، مگر منہ پر دیکھو کیسی چاپلوسی کرتی ہیں۔ مجھے تو پہلے ہی دن انھوں نے ساری بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ اگر میں نے کبھی باجی کو ناراض کیا تو میرے میاں مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ دونوں بھائی باجی کی ناراضگی تو برداشت کر ہی نہیں سکتے۔ مگر دیکھو، خبردار جو یہ باتیں تم نے کسی سے کبھی کہیں۔ ہاں بہت بُری بات ہو گی۔ کبھی کسی کے سامنے ذکر نہ کرنا ان باتوں کا۔"

"میں کیوں ذکر کرنے لگا کسی سے۔" میں نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔ "بھلا تمہارے گھر کے اندر کی باتیں ہیں کسی اور سے کہوں گا؟"

"مگر تم بھی نہ کہنا۔" آپا نے کہا۔ "ان باجیوں کے سامنے۔"

"نہیں آپا۔" میں نے کہا۔ "میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر یہ باجی قدسیہ تو بڑی عجیب عجیب قسم کی باتیں کرتی ہیں۔"

"کیا ... ؟" آپا نے ایک دم چونک کر پوچھا۔ "کیا تم سے کچھ کہا انھوں نے؟"

جواب میں میں نے آپا کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو باجی نے رات مجھ سے کہی تھیں۔ آپا خاموشی سے سنتی رہیں اور پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اچھا تماشہ بنا لیا ہے لوگوں نے ہمارا۔" انھوں نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔ "مگر ہم کیا کریں، ہمارے ہاتھ میں کیا۔ جو جس کا جی چاہے کہہ لے ہم بھلا کسی کی زبان پکڑ سکتے ہیں؟"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، پھر آپا بولیں۔ "ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں بشیرے۔ ہیں تو وہ بدمزاج تیز اور منہ پھٹ مگر میرے ساتھ بہت اچھی ہیں۔ ابھی تک تو بہت اچھی ہیں۔ مجھ سے بڑی محبت کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ آگے کا حال اللہ ہی جانے۔"

اسی وقت دروازے کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ہم خاموش ہو گئے۔

"دلہن، کیا کھاؤ گی دوپہر کو؟" باجی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "جو تم کھانے کو کہو وہی پکا دوں۔"

"آپ کا جو جی چاہے پکا لیں باجی۔" آپا نے نرم لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو سب کچھ کھا لیتی ہوں۔"

"نہیں تم بتاؤ۔" باجی نے کہا۔ "آج تو تمہارا بھائی بھی آیا ہوا ہے۔ دونوں بھائی بہن کو جو پسند ہو بتا دو۔"

"آپ اپنی پسند سے پکا لیں باجی۔" آپا نے کہا۔ "میں اور بشیرے آپ کی پسند سے کھائیں گے۔"

"کوفتے پکا لوں آلو ڈال کے؟" باجی نے پوچھا۔ "کیوں میاں بشیرے کوفتے پسند ہیں تمہیں؟"

"جی ہاں" میں نے کہا "پسند ہیں۔" اور باجی مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔

مجھے بڑا تعجب ہو رہا تھا۔ واقعی آپا شاید ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ باجی ایک طرف اگر غصہ ور اور بد مزاج تھیں، تو وہ دوسری طرف آپا کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ رات کو تو انھوں نے مجھ سے ہم لوگوں کے بارے میں ہنسی خوشی باتیں کی تھیں اور اس وقت وہ مجھ سے ہمارے پسند کے کھانے کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ عجیب و غریب قسم کی عورت تھیں وہ بھی۔

دوپہر تک باجی باورچی خانے میں مصروف رہیں۔

اور میں اور آپا کمرے میں بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ آج تک مجھے آپا کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر اتنی دیر تک اور اتنے سکون سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہم دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہے۔ پچھلی باتیں موجودہ حالات کے بارے میں۔ باتیں اور آئندہ ہونے والی باتیں۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم خوب پڑھ لکھ جاؤ" آپا نے کہا۔ "کم از کم بی اے کرو۔ جس طرح تمھارے بھائی نے کیا ہے۔" وہ ایک دم رک گئیں اور ان کی آنکھوں میں اداسی اتر آئی۔ میں اس وقت اس بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔ "پھر تم اچھی سی نوکری کرنا۔ کوئی بڑے افسر بننا۔ جب تم افسر بن جاؤ گے تو مجھے اتنی خوشی ہوگی کہ زندگی میں کبھی نہیں ہوئی ہوگی۔"

میں عالم تصور میں اپنے آپ کو ایک افسر کے روپ میں دیکھنے لگا۔ میرے جسم پر ایک خوبصورت سوٹ تھا۔ دولہا بھائی کے مکان سے زیادہ اچھا اور بڑا سا مکان میرے پاس تھا۔ گھر میں دو نوکر بھی تھے اور میرے پاس اپنی کار بھی تھی۔ میں افسر جو ٹھہرا۔ میرے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ آ گئی۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میٹرک کے بعد ٹیوشن کر دوں گی" آپا نے کچھ دیر رک کر کہا۔ "اب ٹیوشن تو میں نہیں کر سکتی، لیکن جیسا کہ کل میں نے تم سے کہا تھا، میں تمھارے لیے کچھ کروں گی۔ ضرور۔ ابھی نہیں بتا سکتی کہ کیا کروں گی۔ ہر چیز میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

باتوں باتوں میں دیر ہو گئی اور کھانے کا وقت آ گیا۔ باجی نے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔

"چلو بھئی ہاتھ منہ دھو لو تم دونوں" انھوں نے نرمی سے کہا "آج بہت دن بعد میں نے کوفتے پکائے ہیں۔"

باجی نے واقعی کوفتے بہت اچھے پکائے تھے۔ میں نے اور آپا نے ان کی بہت تعریف کی۔ اور میں نے پہلی بار انھیں مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"دولہا بھائی کھانا کھانے گھر نہیں آتے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" آپا کے بجائے باجی نے جواب دیا "آدمی آتا ہے سائیکل پر۔ وہ گھر سے کھانا لے جاتا ہے ان کے لیے وہیں دکان پر کھاتے ہیں۔ اب تو وہ دکان بند کر کے رات کو ہی آئیں گے۔"

رات کے کھانے پر ہم تینوں کے علاوہ دولہا بھائی بھی موجود تھے۔ صبح کے ناشتے کی طرح انھوں نے کھانا بھی خوب ڈٹ کر کھایا۔ نہ جانے کتنی روٹیاں اُتارتے چلے جا رہے تھے

لیکن وہ کھانا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ یہ وہاں کا پہلا کھانا تھا جو میں نے بہت شوق سے کھایا تھا۔ ضرور انھوں نے گھر میں آکر دوبارہ کھانا کھایا ہوگا۔ بھلا اتنے تھوڑے سے کھانے سے ان کا کیا ہوا ہوگا۔

کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد میں نے آپا سے کہا کہ "میں اب گھر جاؤں گا۔"

"چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں" دولہا بھائی نے کہا۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ بات محض رسماً کہہ رہے ہیں۔

"نہیں دولہا بھائی" میں نے سختی سے کہا "مجھے سارے راستے معلوم ہیں۔ بسوں کے نمبر بھی معلوم ہیں۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"اچھا، تمہاری مرضی" دولہا بھائی نے جلدی سے کہا "مگر دیکھو سیدھے گھر جانا کہیں اور نہ نکل جانا ورنہ گھر پر لوگ پریشان ہوں گے۔"

"جی نہیں" میں نے کہا "میں سیدھا گھر جاؤں گا۔"

دولہا بھائی نے اپنی جیب سے نکال کر ایک روپیہ مجھے دیا اور کہا "یہ رکھ لو، کرائے کے لئے ہے۔"

"نہیں دولہا بھائی" میں نے انکار کرتے ہوئے کہا "میرے پاس کرائے کے لئے پیسے موجود ہیں۔" میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ ابا نے مجھے گھر سے چلتے وقت چپکے سے کرائے کے لئے پیسے دیئے تھے۔

"نہیں نہیں رکھ لو" دولہا بھائی نے اصرار کیا اور باجی نے بھی سختی سے کہا کہ میں روپیہ رکھ لوں۔ آپا البتہ خاموش رہیں۔

ان لوگوں کے کہنے پر میں نے روپیہ جیب میں رکھ لیا۔ اور سب کو سلام کرکے وہاں سے چلا آیا۔

جب میں گھر واپس پہنچا تو اس وقت سب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ ابا امی اور میرے سوتیلے بھائی بہن زمین پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھے روز کی طرح کھانا کھا رہے تھے۔ "آگئے تم" ابا نے مجھے دیکھ کر کہا "آؤ کھانا کھا لو۔"

"نہیں، میں نے کھانا کھا لیا ہے" میں نے جواب دیا "آپا نے کھلایا تھا" اور آپا کہاں کھانا کھا کر آیا ہوں۔

میں نے کھانے کی طرف دیکھا۔ روز کی طرح آج بھی دال اور سوکھی روٹی تھی۔ ہمیشہ کی طرح دال میں تھوڑا سا گھی۔ پہلے کبھی دال اور سوکھی روٹیاں کھاتے کھاتے میرے خوب دیر تک ہوتے تھے۔ لیکن آپا کے گھر کا کھانا کتنے مزے کا تھا۔ اس وقت قورمہ کے علاوہ مٹر پلاؤ بھی تھا اور بیسن کا حلوہ بھی۔ کتنے مزے کا تھا مجھے اتنے اچھے کھانے کھا کر۔

اچانک مجھے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں پر جو اپنے ننھے نازک ہاتھوں سے روٹی کے نوالے توڑ توڑ کر دال میں ڈبو رہے تھے، پھر انھیں منہ میں رکھ رہے تھے بہت ترس آیا۔ مجھے اپنے ابا اور امی پر بھی۔ ان سب لوگوں پر اور خود اپنے آپ پر بھی ترس آیا۔ ہم لوگ اس طرح رہتے تھے اور یہ کھاتے تھے۔ اسی انداز میں ہم لوگوں کی زندگیاں گزرتی تھیں اور دوسری طرف دولہا بھائی کے گھر میں، جہاں میں نے ایک رات اور ایک دن گزارا تھا، بھلا کس چیز کی کمی تھی۔ سب کچھ تو تھا وہاں۔ عمدہ عمدہ چیزوں۔ اچھے اچھے کھانے۔ خوبصورت ساز و سامان۔

"سکینہ کیسی ہے؟" ابا نے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں" میں نے جواب دیا "تم کو اور امی کو سلام کہا ہے۔"

"بھیا، اب اگر تم جاؤ آپا کے ہاں تو ہمیں بھی لے چلنا" کوثر نے خوشامدانہ انداز میں مجھ سے کہا "ہم بھی دیکھیں گے آپا کا گھر۔"

"جمعے کو سب چلیں گے" امی نے کہا۔

دوسرے دن میں کچھ سودا لینے جا رہا تھا کہ راستے میں سراج بھائی مل گئے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائے اور میرا حال چال پوچھنے لگے۔ ہم دونوں ایک کنارے پر کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

"میں پرسوں رات کو آپا کے گھر گیا تھا" میں نے سراج

بھائی کو بتایا "کل رات کو واپس آیا ہوں، سارا دن دہلی پر رہا تھا۔

"اچھا" سراج بھائی نے جلدی سے کہا "کیا حال ہے سکینہ کا؟ اپنے میاں کے ساتھ خوش تو ہوں گی؟"

"ہاں خوش تو ہیں" مجھے اس کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں سوجھا۔ "مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ خوب دل لگا کر پڑھو۔ ایک دن سراج بھائی کی طرح تم بھی بی اے کرو۔ پھر کوئی اچھی سی نوکری کرنا، افسر بننا۔"

"ہونہہ، بی اے، افسری، نوکری" سراج بھائی نے عجیب انداز میں سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ اور جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ میں ان کی شکل دیکھ رہ گیا۔ نہ جانے کیوں وہ اچانک ناراض سے ہو گئے تھے میں نے سوچا کہ آپا کو اس بات کے بارے میں بتاؤں گا۔

جمعے والے دن ہم سب لوگ بس میں بیٹھ کر آپا کے گھر پہونچے۔ آپا ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ عبدالقیوم زرینہ خالہ اور ان کے بچے بھی آئے تھے۔ دولہا بھائی گھر پر ہی موجود تھے۔ باجی بھی تھیں۔

"بھئی اب دس دن ہو گئے شادی کو" باجی نے کسی خاص شخص کو مخاطب کئے بغیر کہا "میں نے سوچا کہ اب دلہن کا ہاتھ لگوا دوں کام کو۔ اُن کا گھر ہے۔ اور انہی کو سنبھالنا ہے۔ اسی لئے میں نے آج رات سب لوگوں کو کھانے پر بلوایا تاکہ سب کے سامنے دلہن کے ہاتھ سے تھوڑی سی کھیر پکوا کر ان کا ہاتھ کھلوا دوں۔ باقی سارے کھانے میں نے تیار کر ہی لئے صرف کھیر دلہن پکائیں گی۔"

آپا جب کھیر پکا رہی تھیں تو سب عورتیں باورچی خانے میں چلی گئیں۔ بچوں نے بھی وہیں دھاوا بول دیا۔ میں، ابا، دولہا بھائی اور عبدالقیوم کمرے میں بیٹھے رہے۔ وہ سب لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔

کھانا بہت شاندار اور عمدہ تھا۔ سب لوگوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ باجی نے سب لوگوں کو پان لگا کر دیئے اور پھر برتن سمیٹ کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

"اب تم کون سی کلاس میں جاؤ گے بھیا" دولہا بھائی نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"ساتویں میں" میں نے جواب دیا۔

"میں نے ایک بات سوچی ہے چچا جان" دولہا بھائی نے ابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پتا نہیں آپ لوگوں کو پسند آئے یا نہ آئے۔"

"ارے تم کہو تو بیٹا" امی جلدی سے بولیں "تمہاری بات کا ہم کوئی برا تھوڑی مانیں گے۔"

"اب یہ دیکھئے آپ لوگوں نے بھی ماشاء اللہ بھائی کو پڑھنے بٹھا رکھا ہے" دولہا بھائی نے کہا "بارہ بارہ اور چودہ چودہ سال پڑھ کر جو لوگ ایف اے، بی اے کرتے ہیں، کہاں جاتے ہیں ان کو؟ اِدھر سے اُدھر جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور کوئی دو کوڑی کو نہیں پوچھتا۔ پھر اتنے دن کے کھانے کے بعد کوئی چھوٹی موٹی نوکری مل بھی گئی تو اس سے کیا حاصل؟"

امی بڑے غور سے دولہا بھائی کو دیکھ رہی تھیں۔ ابا خاموش تھے۔ آپا کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور میں پریشان تھا کہ دولہا بھائی آخر کیا کہنا چاہتے ہیں۔

"ہاں بھیا، تم کہتے تو ٹھیک ہی ہو" امی نے دولہا بھائی کی تائید کرتے ہوئے کہا "خود ہمارے جاننے والوں میں کتنے لڑکے ایف اے، بی اے پاس ہیں اور بے چاروں کو نوکری نہیں ملتی کہیں بھی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو غلام حسین؟" ابا نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں چچا جان کہ جو آمدنی اور برکت کاروبار میں ہے، وہ تعلیم اور نوکری وغیرہ میں نہیں ہے" دولہا بھائی نے کہا "اصل بات یہ ہے کہ یا تو آدمی کے ہاتھ میں کوئی خاص ہنر ہو، اور وہ اسے کاروبار کے لئے استعمال کرے، اور یا پھر وہ کوئی کاروبار کرے۔ اب مجھ کو ہی دیکھ لیجئے، چوتھی جماعت بھی تو نہیں پاس کی میں نے، مگر اللہ نے کاروبار میں برکت دی ہے۔ شکر ہے اس پاک پروردگار کا۔ ہزاروں ایف اے، بی اے سے اچھا ہوں۔

[illegible] ضرورت نہیں ہے، اپنا لال [illegible]
[illegible] صاحب کو دیکھ لیجیے۔" انھوں نے عبدالقیوم کی طرف [illegible] ہوئے کہا۔ "وہ تیسری ہی کلاس سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے مگر ماشاءاللہ آج کہاں کھڑے ہیں ـــ دس دفعہ بی اے، بی اے کر کے بھی اتنی حیثیت نہ ہوتی جتنی کہ آج ہے۔ ہزاروں روپے کما رہے ہیں۔ اس لیے میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ بشیر کو اسکول وسکول میں پڑھانے کے بجائے کسی کاروباری لائن میں لگا دیجیے۔"

"نہیں نہیں" میں نے ایک دم گھبرا کر کہا۔ "میں تو پڑھنا چاہتا ہوں، میں تو ضرور اسکول جاؤں گا۔" میں نے ابا کی طرف دیکھا وہ بت کی طرح خاموش بیٹھے تھے۔

"تم چپکے بیٹھو جی۔" امی نے بڑی زور سے مجھے ڈانٹا۔ "بڑوں کی بات کے بیچ میں نہیں بولا کرتے۔ ہاں بھیا وہ" دولہا بھائی سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔ "بات تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو مگر کاروبار کرنا ہر آدمی کے لئے ممکن بھی تو نہیں ہے۔"

"بغیر سرمائے کے کوئی کاروبار نہیں ہوتا بھائی۔" ابا نے جیسے الجھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہر قسم کے کاروبار کے لئے پیسہ چاہیے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے چچا جان" دولہا بھائی نے کہا۔ "لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر کاروبار کے لئے شروع میں روپیہ چاہئے ہو۔ اب دیکھئے نا، بشیر کو ابھی دسویں پاس کرنے کے لئے چار سال چاہئیں۔ پھر دو سال ایف اے اور دو سال بی اے کے لئے۔ کتنے ہو گئے؟ آٹھ سال اور آٹھ سال گزارنے کے بعد بھی کیا ملے گا اور کیا نہیں ملے گا۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بجائے اگر وہ ابھی سے کوئی ہنر سیکھنا شروع کر دے تو اندازہ لگائیے کہ یہ آٹھ سال میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ پھر اپنی دکان کھولے، کارخانہ کھولے، کچھ بھی کرے۔ اس عرصے میں تو یہ اتنا کما چکا ہوگا کہ بڑے آرام سے اپنا کاروبار شروع کر سکے گا۔"

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ابا جی چپ چاپ [illegible] کر رہے تھے [illegible] حسین کا چہرہ دیکھ رہی ہوں۔ جیسے [illegible] الٹی سیدھی [illegible] گئے ہوئے ایک ان دیکھی تھیں۔

مثلاً [illegible]

"میرا ایک دوست ہے" دولہا بھائی نے [illegible] ایک موٹر گیراج ہے۔ گاڑیاں ٹھیک کرتا ہے۔ وہ ہزاروں کا کام ہے۔ کتنی [illegible] کے پاس اتنا کام ہے کہ [illegible] نہیں تھی۔ آپ یقین کریں کہ [illegible] بھی سارا خرچ نکال کر ماہانہ پانچ ہزار [illegible] آمدنی نہیں ہے اس کی۔"

"چار پانچ ہزار روپے ماہانہ" امی نے جیسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دولہا بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں چچی جان" دولہا بھائی نے کہا "اس سے کم آمدنی نہیں ہے کسی طرح بھی۔ اور جانتی ہیں آپ دس برس کا تھا وہ، تب سے یہ کام کر رہا ہے۔ باپ اس کا چنے بیچا کرتا تھا مگر بیٹے کو اس نے پڑھانے لکھانے یا اسکول بھیجنے کے بجائے ایک گیراج میں لگا دیا جہاں وہ کام سیکھتا رہا۔ برسوں تک وہ مختلف گیراجوں میں کام کرتا رہا۔ پیسے کماتا رہا اور پھر اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس نے اپنا گیراج قائم کر لیا۔ اور آج دیکھیے جناب چھولے بیچنے والے کا وہی بیٹا ہزاروں میں کھیل رہا ہے۔"

"رکھا کیا ہے اس پڑھنے پڑھانے میں" عبدالقیوم نے پہلی مرتبہ بات چیت میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "ہم نے تو کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ اور اب جو پڑھے لکھوں کا حشر دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ ٹھیک ہی تو کیا۔"

"مگر قیوم میاں تمہارا بیٹا محمود بھی تو اسکول جاتا ہے۔" ابا نے کہا۔ "تم اسے دکان پر بٹھانے کے بجائے اسکول بھیجتے ہو آخر وہ بھی تو پڑھ رہا ہے۔"

"محمود کی بات اور ہے سکینہ" قیوم نے آہستگی سے کہا

"محمود کو پڑھ لکھ کر کوئی نوکری تو نہیں کرنا ہے۔ اس کا تو اپنا گھر کا کاروبار ہے۔ جب بھی ہمارا جی چاہے گا۔ اُسے اسکول سے اٹھالیں گے اور دکان پر بٹھالیں گے۔ مگر تمہارے بھائی کے ساتھ تو حالات ذرا مختلف ہیں۔"

"اگر آپ لوگ اس بات کے لئے تیار ہوں تو میں اپنے دوست سے بات کر سکتا ہوں۔" دولہا بھائی نے کہا... "بشیرے کو وہ اپنے گیراج میں رکھ لے گا۔ یہ کام بھی سیکھ لے گا اور اسے پیسے بھی ملنا شروع ہو جائیں گے اور پھر جلد ہی یہ بڑا ہوشیار موٹر مکینک بن جائے گا۔ اور پھر تو اتنی کمائی ہو گی کہ آپ لوگوں سے سنبھالی بھی نہیں جائے گی۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ بشیرے کو پڑھنا چاہئے۔" آپا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "آدمی تعلیم یافتہ ہو تو اس کے لئے آئندہ ترقی کے بہت امکانات ہوتے ہیں۔"

"اے رہنے دو تم اپنے امکانات و مکانات۔" امی نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "تمہارے میاں جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ باتیں میرے دل کو لگ رہی ہیں۔ اے بھیا، تم ذرا اپنے دوست سے بات تو کر کے دیکھو۔"

"چچا جان اجازت دیں تو میں بات کروں۔" دولہا بھائی نے کہا۔ "اور بات وات کیا کرنا ہے۔ میں بشیرے کو ساتھ لے جاؤں گا اور اُس کے حوالے کر دوں گا۔ باقی وہ جانے اور اس کا کام۔ آدمی سچا ہے بھروسے کا ہے۔"

"بھئی مجھے تو تمہاری بات بہت پسند آئی۔" امی نے کہا۔ "اے تم بھی تو کچھ بولو۔" وہ ابا کی طرف دیکھ کر دہاڑیں۔

"نہیں جی۔" آپا نے ایک بار پھر حق میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "بشیرے کو اسکول جانے دو۔ میں تو لڑکی تھی اور تم نے مجھے میٹرک تک پڑھایا۔ بشیرے تو لڑکا ہے۔ اسے تو اس سے بھی زیادہ پڑھنا چاہئے، ورنہ میٹرک تو کرنا ہی چاہئے۔"

امی نے بڑی ناگواری کے ساتھ آپا کو گھورا لیکن آپا نے امی کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

"میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔" ابا نے سنبھل کر کہا۔ "بشیرے کا اسکول تو اب تقریباً دو ماہ بعد کھلے گا۔ اس وقت تک کے لئے ہم اسے گیراج میں بٹھائے دیتے ہیں۔ دو ماہ میں ہمیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ یہ اس لائن میں کام سیکھ سکتا ہے یا نہیں۔"

"سیکھ کیوں نہیں سکتا چچا جان۔" غلام حسین نے [illegible] انداز میں کہا۔ "میرے دوست کا نام تو شرافت علی ہے مگر وہ استاد شرفو کے نام سے مشہور ہے۔ لڑکوں کو کام سکھانے میں تو وہ بڑا ماہر ہے۔ میں دو ایک دن میں بشیرے کو لے جا کر اس کے حوالے کر دوں گا۔"

"بس جلدی سے جلدی اسے بٹھا دو۔ بھیا۔" امی بولیں۔ "اِدھر اُدھر واہی تباہی گھومتا پھرتا ہے۔ چار پیسے لائے گا تو اس کے اپنے ہی کام آئیں گے۔ ہمیں کون سا اس کی کمائی کھانی ہے۔"

"کیوں نہیں کھانی ہے چچی جان۔" دولہا بھائی نے کہا۔ "آخر اولاد کی کمائی پر سب سے زیادہ حق تو ماں باپ کا ہی ہوتا ہے۔"

مجھے سوائے آپا کے یہ سارے لوگ بہت بُرے لگ رہے

گئے تھے۔ میری تعلیم کے سلسلے میں ... دولہا بھائی ساری بات کی ... وہ آپ کے بار بار منع کرنے کے باوجود یہی کہہ رہے تھے کہ میری تعلیم ختم کروادی جائے۔

اس رات جب ہم لوگ وہاں سے واپس آئے تو مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ اب پڑھائی کے دروازے مجھ پر بند کر دیے گئے ہیں۔ آپ نے تو صرف دو ماہ کی بات کی تھی، لیکن میں جانتا تھا کہ اگر ایک بار میں نے گیراج میں کام شروع کر دیا اور میں پیسے لانے لگا، تو پھر امی مجھے کبھی اسکول نہیں جانے دیں گی۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں گیراج میں کام کرنے نہیں جاؤں گا۔ میں وہاں سے بھاگ جاؤں گا۔

اس واقعے کے کوئی دو دن بعد دن کے وقت آپا اچانک ہمارے گھر آگئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اور ابا جی قریب کسی کام سے عبدالقیوم کے گھر آئی ہیں اور وہ وہاں سے تھوڑی دیر کے لئے ہمارے گھر بھی آگئیں۔ حسن اتفاق سے اس وقت امی کچھ سامان خریدنے چوک گئی ہوئی تھیں، ابا کام پر گئے ہوئے تھے، شہروز سفر میں تھا اور چھوٹے بہن بھائی ... مجھے آپا سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

"مجھے بہت سخت افسوس ہے بشیر، کہ میری بات کا اثر نہ ہوا۔" آپا اداس ہو گئیں۔ "میں نے تو تمہارے دولہا بھائی سے یہ بات کی تھی کہ ہم لوگ تمہیں اپنے پاس اپنے گھر میں رکھ لیں۔ اور تم ہمارے ساتھ رہ کر اپنی پڑھائی کرتے رہو۔ آخر رخسانہ چچی نے بھی تو اپنے بھائی سراج کو پال پوس کر بڑا کیا، اسے تعلیم دلوائی اور اب تک وہ پال رہی ہے۔ عرفان چچا تو اس کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ تمہارے دولہا بھائی میری بات ضرور مان لیں گے، لیکن انھوں نے تو سنتے ہی صاف انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ وہ کسی اور کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ میں نے انھیں آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ بالکل ہی راضی نہیں ہوئے۔ میں مایوس ہو گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ جب تم چھٹے دن دعوت میں آؤ گے تو میں تمہیں الگ بلا کر ساری بات تم کو بتا دوں گی اور تم سے معافی مانگ لوں گی کہ میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکی۔ پھر میں کوئی اور صورت نکالنے کی کوشش کروں گی۔ تمہارے دولہا بھائی نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ میں نے بھی اس بارے میں اُن سے کوئی بات نہیں کی۔ لیکن اس دن مجھے کہ انھوں نے تمہیں گیراج میں بھیجنے کا شوشہ نکال لیا۔ اور ابا اور امی دونوں کو اس بات پر راضی بھی کر لیا۔ مجھے پہلے نہیں معلوم تھا کہ وہ ابا اور امی کے سامنے اس قسم کی باتیں نکالیں گے، ورنہ میں سختی سے انھیں منع کر دیتی کہ وہ ہمارے معاملے پر چھوڑ دیں۔" آپا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اب تم بتاؤ آپا، میں کیا کروں؟" میں نے کہا۔ "تم نے واقعی میری بھلائی چاہی تھی، مگر خیر، دولہا بھائی نہیں مانے ..."

"نہ صرف یہ کہ نہیں مانے، بلکہ انھوں نے اس وجہ سے کہ شاید میں دوبارہ کبھی اُن سے اس قسم کی بات کروں، تمہاری تعلیم کا سلسلہ ہی ختم کروانا چاہا۔ بالکل جاہل، خود غرض اور گھٹیا آدمی ہیں تمہارے دولہا بھائی ..." آپا کے لہجے میں بڑی نفرت تھی۔

"رہنے دو آپا،" میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "جو بھی ہو دولہا بھائی ہیں، ایسا نہ کہو۔ مگر اب تم مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

"دیکھو نا۔" آپا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم فی الحال گیراج میں کام کرنا شروع کر دو۔ دو ماہ کی ہی تو بات ہے۔ جیسے ہی اسکول دوبارہ کھلے میں خود ابا سے کہوں گی کہ تمہیں اسکول جانے دیں۔ میں تو بس اُن کے پیچھے پڑ جاؤں گی۔ ان سے اپنی بات منوا کر رہوں گی۔"

"آپا اگر تم کہہ رہی ہو تو میں گیراج میں کام کرنے چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ کام کرنے کے بجائے وہاں سے بھاگ

جایا کروں گا، لیکن تم کہتی ہو تو میں چلا جاؤں گا۔"

"اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔" آپا نے کہا۔ "انسان کوئی بھی ہنر سیکھ لے۔ وہ کبھی نہ کبھی اس کے کام آتا ہی ہے۔ رائیگاں نہیں جاتا۔ اگر تم اس وقت کام کرنے وہاں نہیں جاؤ گے، تو امی قیامت برپا کر دیں گی۔ اور ابا تو انھی کی سی کہیں گے۔ وہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ چھٹیوں بھر کام کر لو۔ تو تم چھٹیوں میں کام کر لو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر تم چھٹیوں کے بعد ابا سے بات ضرور کرنا۔"

"ہاں، میں ضرور بات کروں گی۔" آپا نے کہا۔

اس سے اگلے ہفتے دولہا بھائی ہمارے گھر آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر پاپوش نگر جہاں ان کے دوست استاد شرفو کا گیراج تھا، گئے۔

استاد شرفو کا قد بہت چھوٹا سا تھا۔ اتنا چھوٹا کہ وہ بونا سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اکہرے بدن کا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کا گیراج ایک طویل و عریض احاطے میں تھا جس میں ایک طرف ٹین کی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ اس سائبان کے نیچے کئی کاریں کھڑی ہوئی تھیں اور تین لڑکے کام کرتے تھے۔

"آؤ بھائی غلام حسین، تم نے تو شادی کے بعد شکل بھی نہیں دکھائی۔" استاد شرفو نے دولہا بھائی سے کہا۔

"بس یار یہ ایک لڑکا ہے۔" دولہا بھائی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سالا ہے میرا۔ غریب والدین کا بیٹا ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ کچھ کام سیکھ لے۔ اسی لئے تمہارے پاس لایا ہوں۔"

"تم اسے اپنے ساتھ دکان پر کیوں نہیں بٹھا لیتے؟"

استاد شرفو نے کہا۔ "تمہارا ہاتھ بٹائے گا اور پھر تمہیں بھروسہ بھی رہے گا۔"

"ارے دکان کے کام میں کیا رکھا ہے شرفو بھائی۔"

دولہا بھائی نے کہا۔ "ویسے وہ لوگ اسے موٹر مکینک بنانا چاہتے ہیں۔ تم اسے اپنی شاگردی میں لے لو۔ ہوشیار لڑکا ہے، جلدی کام سیکھ لے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" استاد شرفو نے کہا۔ "مجھے ایک لڑکے کی ضرورت بھی تھی۔ کام بڑھتا جا رہا ہے۔ تین لڑکے تو ہیں میرے پاس مگر پھر بھی کام پورا نہیں ہو پاتا۔ اس کا کبھی گاڑیوں کا دھندہ ہے۔ پہلے کہیں کام کیا ہے اس نے؟"

"نہیں۔" دولہا بھائی نے جواب دیا۔

"پھر تو گویا سب کچھ شروع سے سکھانا ہوگا۔" استاد شرفو نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تو ایسا ہے بھائی غلام حسین کہ یہ کل ہی سے آ جائے۔ تین مہینے تک تو میں اسے پانچ روپے روزانہ کی دہاڑی دوں گا۔ اس کے بعد جب یہ کچھ سیکھ لے گا، تو دیکھیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" دولہا بھائی نے کہا۔ "کل سے یہ آ جایا کریں گے۔ کیوں بشیرے؟" دولہا بھائی نے میری طرف دیکھا۔

میں نے خاموشی سے گردن ہلا دی۔ اور یوں میری زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

اگلے دن جب میں پہلی بار کام پر جانے کے لئے گھر سے روانہ ہوا تو امی نے کھانے کی ایک پوٹلی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لو۔ دوپہر کو جب سب لوگ کھانا کھائیں تو تم بھی کھا لینا۔ اور دیکھو کام ختم کر کے تم سیدھے گھر واپس آنا۔ ادھر ادھر نہ نکل جانا۔ لڑکوں کے ساتھ۔ سمجھ گئے۔؟"

"سمجھ گیا۔" میں نے جواب دیا۔ اور گھر سے باہر نکل گیا۔ بس میں بیٹھ کر میں سیدھا گیراج جا پہنچا۔

تینوں لڑکے آ چکے تھے اور گیراج کے اندر سائبان کے نیچے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ استاد شرفو نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تینوں لڑکے عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے۔ ان میں سے ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ عمر میں باقی دونوں لڑکوں سے بڑا تھا۔

"آ جا بھائی آ جا۔" سگریٹ پینے والے لڑکے نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "کیا تو بھی یہاں کام کرنے آیا ہے؟"

"میں ... ہوں ... صاحب نے ... کام سیکھنے کے لیے لایا ہوں۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔" اس لڑکے نے کہا۔ "کیا نام ہے تیرا؟"

"بشیر۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ سب لوگ مجھے بشیرا کہتے ہیں۔" میرا اچھا ہوا کہ ان لڑکوں کے ساتھ بے تکلف ہو جاؤں۔

"اچھا تو بھائی بشیرے۔" اس لڑکے نے کہا: "میرا نام شمشاد ہے۔ اور یہ بختیار ہے اور یہ جمال۔" اس نے باقی دو لڑکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نام تو اس کا شمشاد ہے، مگر ہم لوگ اسے شمیم آرا کہتے ہیں۔" بختیار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کی شکل شمیم آرا سے بہت ملتی ہے۔ ملتی ہے نا؟"

"کون شمیم آرا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "یہ لوگ نہ جانے کیسی باتیں کر رہے تھے۔"

"تم فلمیں نہیں دیکھتے؟" بختیار بولا۔ "اسے شمیم آرا فلم ایکٹریس۔"

اور مجھے یاد آیا کہ بہت دن ہوئے جب ابا ہم سب کو ایک بار فلم دکھانے لے گئے تھے۔ اس میں شاید اسی نام کی کسی اداکارہ نے کام کیا تھا۔

"ابے زیادہ بکواس کی تو بتیسی باہر نکال دوں گا۔" شمشاد نے بختیار کی طرف مکا تانا۔ بختیار کھکھلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

"نام تو اس کا بختیار ہے۔ مگر ہم لوگ اسے ککو کہتے ہیں۔" شمشاد نے کہا: "ایک ہی نمبر ہے یہ۔ سالا استاد سے مار کھاتا ہے۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کی ہڈی بوٹی بہت مضبوط ہو گئی ہے مار کھا کھا کر۔"

"کیا استاد مارتے بھی ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے بڑی مار لگاتا ہے استاد۔" شمشاد نے کہا۔ "ذرا کوئی غلطی ہوئی، تو اس نے دیا گھما کے پلاؤ والا ہاتھ زور سے۔ دن میں تارے نظر آجاتے ہیں۔"

اتنے میں استاد شرفو آگیا۔ ہم ... جلدی جلدی کھڑے ہو گئے۔ شمشاد نے اپنی سگریٹ جلدی سے نیچے پھینک کر مسل دیا اور وہ سب کے سب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے استاد کو سلام کیا۔ میں نے بھی سلام کیا۔ استاد نے سب کے سلاموں کا جواب دیا۔

"ابے ککو۔" استاد بولا: "وہ سفید مان کا کاربوریٹر کھول دیا؟"

"ابھی کھولتا ہوں استاد۔" ککو جلدی سے ایک سفید رنگ کی گاڑی کی طرف بھاگتے ہوئے بولا۔

"ابے سالے پھوسی۔" استاد بولا: "باتیں بناتے بیٹھے ہوتے۔ ابھی ڈاکٹر ... شیخ صاحب آجائیں گے۔ انہیں کیا بتاؤں گا؟ تیرا سر! چل جلدی کر اور چل بے جمال۔ ڈاٹسن کا پچھلا وہیل کھول سیدھے ... الائنمنٹ میں خرابی معلوم ہوتی ہے۔ جا۔ تو شمشاد کے ساتھ لگ جا اور ابے بھائی کیا نام ہے تیرا؟ بشیرے تو جمال کے ساتھ لگ جا۔ آج پہلا دن ہے تیرا۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اوزاروں کو پہچان۔ ان کے نام جان لے اور یہ جان لے کہ کس اوزار سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے بے دھڑک پوچھ لے۔ ویسے یہ لڑکے بھی تیرے ہی ساتھی ہیں۔ تجھے سب کچھ بتاتے رہیں گے۔ بس جتنی جلدی کام سیکھ لے گا۔ اتنا ہی تیرا فائدہ ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور استاد کے ساتھ چل پڑا۔ جو ایک لکڑی کے بڑے سے بکس سے اوزار نکال رہا تھا۔

"اب ہمیں وہیل اتارنا ہے۔" جمال مجھے بتانے لگا "یہ رہا وہیل پانا۔ اب دیکھو میں اسے بولٹ میں پھنسا کر زور لگاؤں گا اور نٹ کو ڈھیلا کروں گا۔ پھر گاڑی میں جیک لگاؤں گا جس سے گاڑی اوپر اٹھ جائے گی۔ اس کے بعد وہیل کو باہر کھینچ لیں گے۔"

میں جمال کی مدد کرتا رہا اور بڑے غور اور دلچسپی سے سارے کام کو دیکھتا رہا۔

اس کے بعد میں نے جمال کے ساتھ اور دوسرے لڑکوں

کے ساتھ مل کر کئی کام کیے۔ استاد کی ہدایت کے مطابق میں سب سے پہلے اوزاروں کے نام اور ان کے استعمال کو جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے تک میں زیادہ تر اوزاروں کے نام جان چکا تھا۔ اس کے علاوہ گاڑیوں کے بہت سے مختلف حصوں کے نام بھی میں نے جان لیے تھے۔ بیٹری، ریڈی، ایٹر، کاربوریٹر، سائیلنسر وغیرہ وغیرہ۔

مجھے احساس ہوا کہ یہ تو ایک بالکل نئی دنیا ہے۔ میری اب تک کی زندگی میں موٹر گاڑیوں کا دخل صرف اتنا تھا کہ کبھی کبھی بس میں ادھر ادھر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور بس اور نہ ہی مجھے موٹر گاڑیوں سے کسی قسم کی دل چسپی تھی، لیکن آج پہلے ہی دن جب میں نے کام شروع کیا تو مجھے اس میں بڑی دل چسپی محسوس ہوئی۔ ہر ہر قدم پر میرا جذبۂ تجسس بیدار ہوتا تھا اور میں لڑکوں سے مختلف چیزوں کے بارے میں پوچھتا تھا۔ آج میں نے پہلی بار دیکھا کہ ایک موٹر گاڑی کے اندر کتنی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ کس قدر پرزے وغیرہ ہوتے ہیں، اور انھی پرزوں سے مل کر بننے والی موٹر گاڑی جب سڑک پر تیزی سے بھاگتی ہے، تو باہر سے گاڑی کے پہیوں اور باڈی کے علاوہ اور کوئی پرزہ نظر بھی نہیں آتا۔

میں ان لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا جنھوں نے گاڑی بنائی تھی۔ کتنے عقلمند اور ہوشیار لوگ ہوں گے وہ آج تک تو میں نے موٹر گاڑی پر غور ہی نہیں کیا تھا، اور اب جبکہ میں اسے اندر سے پوری طرح دیکھ رہا تھا تو مجھے یہ عجائبات کی ایک پوری دنیا معلوم ہوتی ہے۔

استاد شرفو خود بھی ایک گاڑی پر کام کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ لڑکوں کے کام کی نگرانی کر رہا تھا اور انھیں ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔ دوپہر کے وقفے تک اس نے شمشاد کو دو دفعہ اور جمال اور کلنو کو تین تین مرتبہ مارا۔

اس دوران مختلف لوگ بھی گیراج میں آتے رہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی گاڑیوں پر کام ہو رہا تھا۔ یہ استاد کے علاوہ تینوں لڑکوں سے بھی اچھی طرح واقف [illegible] سے باتیں کرتے تھے۔

"چلو بے، اب روٹی کھا لو، دوپہر ہو گئی ہے" استاد نے کہا۔ وسیع سائبان کے ایک طرف خالی جگہ پر [illegible] نے ایک چٹائی بچھا دی جو کونے میں لکڑی ہوئی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے گھر سے کھانا لے کر آتے تھے۔ استاد بھی اپنا سارا کھانا ایک اخبار پر ڈھیر کر دیا۔ میں نے بھی اپنی پوٹلی آگے کر دی۔

"کیا ہے اس میں؟" استاد نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم" میں نے جواب دیا۔ "امی نے دی تھی صبح چلتے ہوئے"۔

"ارے تو اسے کھول کے دیکھ نا، بھائی" استاد شرفو نے کہا اور میں نے جلدی سے کھانے کی پوٹلی کھول دی۔ اس میں آلو بیگن کی ترکاری تھی اور دو روٹیاں تھیں۔ میں نے اس کھانے کو بھی باقی کھانوں کے ساتھ ہی رکھ دیا۔

"چلو بھئی شروع کر دو، بسم اللہ الرحمن الرحیم" استاد نے کہا اور پہلا لقمہ توڑا۔ اور پھر سب لوگ کھانے لگے۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل تھا۔

میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ وہ سب لوگ ایک دوسرے کے کھانے کھا رہے تھے۔ اس بات کی کوئی قید نہیں تھی کہ ہر شخص اپنا لایا ہوا ہی کھانا کھائے۔ سب مل جل کر کھا رہے تھے۔ سب کا کھانا مشترک تھا۔ میرے لیے یہ بڑا دلچسپ اور خوشگوار تھا۔ ایک ہی وقت میں مجھے مختلف قسم ذائقوں کے کھانے کو مل رہے تھے۔

"ابے تیرے گھر کی ترکاری تو بہت مزیدار ہے" استاد بولا میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ میری آلو بیگن کی ترکاری سے کئی لقمے کھا چکا تھا۔ "کس نے پکائی ہے؟"

"میری امی ہی پکاتی ہیں" میں نے کہا۔

"اپنی امی سے کہنا کہ پھر کسی دن پکائیں" استاد بولا۔ "امی سے کہنا کہ ان کے بھائی شرفو نے ان کا شکریہ [illegible]

کیا ہیں سمجھا ؟ "

"ضرور سمجھ دوں گا" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

" اور ہاں تھوڑا سے" استاد نے کہا "کل سے ایک تھیلا اپنے گھر سے چند کپڑوں کا ساتھ لانا۔ وہ کپڑے یہیں رہیں گے اور انہیں تم کام کے وقت پہنو گے۔ روز روز ایک جوڑا خراب کرنے کے لئے کہاں سے لاؤ گے ؟"

مجھے گیراج میں کام کرتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں بڑی تیزی سے کام سیکھ رہا تھا۔ مجھے خود بھی تعجب ہو رہی تھی کہ مجھے اس کام سے اس قدر دلچسپی کیونکر پیدا ہو گئی۔ میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ میں زیادہ سے زیادہ کام کروں تاکہ جلد سے جلد گاڑیوں کے بارے میں سب کچھ سیکھ لوں۔ اب تو میں کئی گاڑیوں کے نام اور ماڈل بھی پہچاننے لگا تھا۔

استاد کے پاس دن بھر گاہک آتے رہتے تھے۔ جو اپنی اپنی گاڑیوں کے بارے میں اس سے باتیں کرتے تھے کبھی کبھی استاد کے ملنے والے بھی آتے تھے۔ جن کا گاڑیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن ایسا ہی ایک آدمی آیا۔ میں استاد کے قریب ہی بیٹھا ہوا ایک سپانر کو کھول رہا تھا۔ وہ آدمی استاد سے کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اور پھر جب وہ جانے لگا تو استاد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور اس کے حوالے کر دیئے۔

اس شخص نے نوٹوں کو گنا اور جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ " اب کچھ بڑھا کر دو شروع۔ سب ہی لوگ بڑھا کر دے رہے ہیں "

" کیا کروں بھائی " استاد نے مسکین صورت بنا کر کہا۔ " آج کل دھندا کچھ مندا ہی جا رہا ہے۔ ادھر بس اسٹاپ کے پاس ایک اور مستری نے گیراج کھول لیا ہے۔ میرے کئی گاہک ادھر جانے لگے ہیں "

" تم ٹھیک کام نہیں کرتے ہو گے نا! اس لئے تمہارے کسٹمر ٹوٹ رہے ہیں " اس شخص نے کہا۔

" یہ بات نہیں ہے " استاد نے سنجیدگی سے کہا " وہ



مستری اپنا کاروبار بڑھانے کے لئے پیسے بہت کم لے رہا ہے کچھ دن بعد بڑھائے گا پیسے۔ اپنے تو وہی ریٹ چل رہے ہیں۔ میں کس طرح پیسے کم کر سکتا ہوں۔ آخر یہ چار چار لڑکے بھی تو ہیں۔ ان کا خرچہ بھی تو نکالنا ہے "

" اچھا اس دفعہ تو لئے جاتا ہوں " اس نے کہا " اگلی دفعہ پانچ روپے بڑھا کر دینا۔ سب نے بڑھا دیئے ہیں "

وہ شخص چلا گیا اور اس کے جاتے ہی استاد نے اسے ایک نہایت فحش اور بھاری بھرکم گالی دی۔

" یہ کون آدمی تھا استاد " میں نے ڈرتے ڈرتے استاد سے پوچھا۔

استاد نے جواباً ایک اور زوردار گالی دیتے ہوئے کہا۔ " یہ تھا شاپ انسپکٹر۔ بھتہ لینے آیا تھا "

" شاپ انسپکٹر ؟ بھتہ ؟ " میں نے حیرت سے پوچھا۔

میرے لیے یہ الفاظ بالکل نئے تھے۔

اور جب استاد نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ بھتہ کیا ہوتا ہے اور شاپ انسپکٹر کسے کہتے ہیں۔

"اور صرف یہی تھوڑی ہے بھتہ لینے والا؟" استاد نے کہا، "ابھی تو ایم سی کا آدمی آئے گا۔ علاقے کے تھانے کا آدمی آئے گا، انکم ٹیکس والا آئے گا۔ سب کو بھتہ دینا پڑے گا۔ بھائی میرے ایم سی کے آدمی کو نہ دو تو وہ کہے گا کہ جگہ خالی کرو تم نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ انکم ٹیکس والے کو نہ دو تو وہ حساب مانگے گا اور انکم ٹیکس ٹھونک دے گا کہ خدا کی پناہ۔ اور تھانے کو بھتہ دیے بغیر بھلا کون کاروبار کر سکتا ہے۔"

استاد نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ایک ماہ کے اندر اندر میں نے ان سب لوگوں کو دیکھ لیا جو استاد کے پاس آ کر بھتہ لے جاتے تھے۔ استاد ان سب لوگوں کو بھتہ ادا کرتا تھا۔ میرے لیے یہ ساری باتیں ایک انکشاف کی حیثیت رکھتی تھیں۔ میں عملی دنیا کے نئے نئے تجربوں سے آگاہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ عمل اور کاروبار کی دنیا تھی جہاں ہر ہر قدم پر عجیب نئی چیزیں دیکھنے کو مل رہی تھیں۔

میں نے یہ دیکھ لیا کہ استاد کس طرح اپنے اکثر گاہکوں کو بے وقوف بناتا ہے۔ ہم سب لڑکے جانتے تھے کہ پرزے دھونے کے لیے مٹی کا تیل استعمال کیا جاتا ہے جو گیراج میں ہمیشہ موجود رہتا ہے لیکن استاد زیادہ تر گاہکوں سے پرزوں کی دھلائی کے نام پر پیٹرول کے پیسے لیتا تھا۔ جو پرزے ٹھیک ہوتے تھے یا ذرا سی مرمت سے ٹھیک ہو سکتے تھے وہ اکثر ان کی قیمت بھی گاہکوں سے یہ کہہ کر وصول کر لیتا تھا کہ نئے پرزے ڈالے ہیں۔ عجیب طرح کا گورکھ دھندا تھا۔

استاد جب کسی گاہک سے بات کرتا تھا تو ہم لڑکوں میں سے کوئی بھی نہیں بول سکتا تھا۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا تھا کہ کس گاڑی میں کتنا کام ہوا ہے۔ کون کون سے پرزے نئے ڈالے گئے ہیں اور کون سے پرزے مرمت کرنے کے بعد دوبارہ لگائے گئے ہیں۔ استاد کھلم کھلا جھوٹ بولتا۔ بڑی روانی اور فراٹے کے ساتھ جھوٹ بولتا [illegible] کی قیمت بھی وصول کرتا جو نئے نہیں ڈالے گئے تھے۔ اس کام کے بھی پیسے وصول کرتا جو کیا ہی نہیں گیا تھا۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا تھا اور حیران ہوتا تھا۔

"یار شہزادہ" ایک دن موقع پا کر میں نے شہزاد سے کہا، "یہ استاد اتنی اندھیر کیوں مچاتا ہے گاہکوں کے ساتھ؟"

"ابے اور بھی نہ لگے تو کیا کرے؟" شہزاد نے مجھے گھورتے ہوئے کہا، "کاروبار تو اسی طرح ہوتا ہے۔ یہ سب نہ کرے تو کمائے کہاں سے؟"

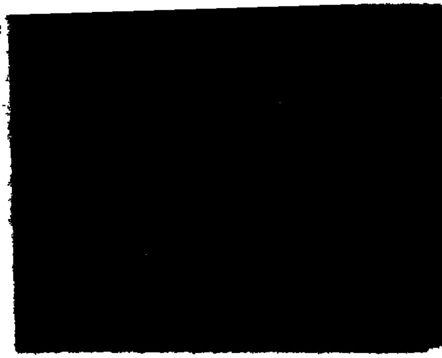
مجھے یہ بات بڑی عجیب سی لگی۔ "تو کیا ایسا ہوتا ہے کاروبار؟" میں نے دل میں سوچا، "کیا بے ایمانی کرنا ضروری ہوتا ہے؟"

مجھے کام کرتے ہوئے مہینہ بھر ہو گیا تھا۔ استاد دوسرے لڑکوں کو روزانہ ہی پیسے دے دیتا تھا لیکن مجھے کچھ نہ دیتا۔ میں نے سمجھا کہ شاید مہینہ ختم ہونے پر مجھے پیسے دے گا لیکن اس دن شام کو استاد نے مجھے بتایا کہ وہ میرے پورے مہینے کے پیسے میرے بھائی کو دے چکا ہے جو میرے ماں باپ کو پہنچ جائیں گے۔ گھر جا کر مجھے معلوم ہوا کہ استاد نے واقعی ٹھیک کہا تھا۔ دولہا بھائی نے اسے ہدایت دی تھی کہ پیسے میرے ہاتھ میں نہ دیے جائیں بلکہ انہیں دیے جائیں اور وہ میرے ابا کو پہنچا دیں گے۔ ابا کو پیسے پہنچ چکے تھے۔ اور انھوں نے یا امی نے مجھ سے اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔

دو مہینے دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے۔

ان دو ماہ کی مدت میں مجھ پر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوا تھا۔ یہ حقیقت، تجربے اور عمل کی دنیا تھی۔ یہ میرے اسکول اور میرے گھر کی دنیا سے مختلف تھی۔ یہاں قدم قدم پر نئے انکشافات ہوتے تھے اور انسان بہت کچھ سیکھتا چلا جاتا تھا۔

اسکول کھلنے میں دو روز رہ گئے تھے۔ جب آپا اور دولہا بھائی ہمارے گھر آئے۔ رات کا وقت تھا اور مجھ سمیت سب ہی لوگ گھر پر موجود تھے۔ آپا نے آتے ہی ابا کو یاد دلایا کہ دو ماہ گزر چکے اور اسکول کھلنے والا ہے۔



• بھی تو اُستادوں ہی کی طرح ملازم ہیں۔ وہ دولہا
بھائی بولے تھے: اگلے چند برس کے بعد اس کے بچے
بڑے ہو جائیں گے۔ شیر دل اس کی بہت تعریف کرتا تھا۔
• وہ کہتا تھا کہ اس نے دو مہینے میں جتنا کام سیکھا ہے
دوسرے لڑکے سال بھر میں نہیں سیکھ پاتے۔ چند سال میں
یہ لڑکا اپنے کام کا مستری بن جائے گا۔ پھر اسے علیحدہ گیراج
کھلوا دوں گا۔

• بات تو تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا۔ یہ یہاں کسی کی مجبوری
بھی بن گئے ہیں، ابا جی بولیں۔

• بشیرے کو سکول جانے دو نا ابا! آپا نے دولہا بھائی
اور ابا جی کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

آپا کے بے حد اصرار کے باوجود اُن کی بات نہیں مانی
گئی۔ دولہا بھائی بھی حد تک نیم راضی سے تھے، لیکن ابا جی نے ان کی
ایک نہ چلنے دی۔ اور بالآخر یہی طے پایا کہ مجھے اب سکول
جانے اور پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے محنت سے کام
کرکے ایک ماہر موٹر مکینک بن جانا چاہیے اور اس کے بعد
دولہا بھائی مجھے گیراج کھلوا دیں گے۔ آپا بہت اداس ہوگئیں
لیکن میں اتنا اداس نہیں تھا۔ اور مجھے خود بھی اس بات پر
تعجب تھا۔ دراصل مجھے اپنا یہ کام اتنا زیادہ پسند آگیا تھا کہ
شاید میں خود یہ چاہنے لگا تھا کہ جلد سے جلد ایک بہت اچھا
موٹر مکینک بن جاؤں۔

اور پھر میری زندگی کے اگلے پانچ سال استاد شیر دل کے
گیراج کی نذر ہوگئے۔ اس دوران دنیا میں، میرے گرد و پیش
اور خود میرے اندر بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ شمشاد
گیراج چھوڑ کر جا چکا تھا۔ جمال اور بختو ابھی تک کام کر رہے
تھے۔ دو نئے لڑکے اور آگئے تھے۔ ایک کا نام قربان تھا
اور دوسرے کا باسط۔ میں اس عرصے میں ایک مکمل اور ہوشیار
مکینک بن چکا تھا۔ ہر ماڈل اور ہر میک کی گاڑی کی نس نس
سے واقف ہو چکا تھا۔ اب مجھے کسی بھی کام میں استاد کی مدد کی
ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ میں آزادانہ طور پر سارے کام
کرلیتا تھا۔ باقی تمام لڑکوں میں سے کوئی بھی اتنا ماہر نہیں
سمجھتا تھا۔ حالانکہ بختو اور جمال مجھ سے پہلے کام
کر رہے تھے لیکن میں ان سے کہیں زیادہ ہوشیار تھا۔ استاد
مجھ پر مکمل بھروسہ کرتا تھا اور سارے اہم کام آنکھ بند کرکے
میرے سپرد کرتا تھا۔ میرے جسم کے رونگیں رونگیں میں
پیٹرول اور مٹی کے تیل کی بُو بس کر رہ گئی تھی اور جیسے میرے
بدن کا جزو بن گئی تھی۔ میرے ہاتھ کھردرے اور پتھر کی
طرح سخت ہوگئے تھے اور ان میں جم جانے والی کالک
جیسے ان کی جلد میں شامل ہوگئی تھی۔

میرے واقف کاروں کا حلقہ بہت وسیع ہوگیا تھا۔
طرح طرح کے لوگ، طرح طرح کے کسٹمر گیراج میں آتے تھے
اور ان سب سے میری دعا سلام رہتی تھی۔

میں اپنی آنکھوں کے سامنے دنیا بھر کی بے ایمانیوں
کی گرم بازاری دیکھتا تھا۔ بہت سی باتیں، جو پہلے سمجھ
میں نہیں آتی تھیں۔ اب صاف اور واضح طور پر سمجھ میں آنے
لگی تھیں، امی ابا کا میرے اور آپا کے ساتھ امتیازی
سلوک، آپا کے لیے سراج بھائی کے پیغام کی نامنظوری
غلام حسین جیسے آدمی سے آپا کی شادی، مجھے اسکول جانے
سے روکنے کی دولہا بھائی کی سر توڑ کوشش، گیراج میں
بھتہ وصول کرنے کے لیے طرح طرح کے آدمیوں کی آمد،
استاد کی گاہکوں کے ساتھ چالبازیاں اور کھلی دھوکے بازی
پھر گیراج میں آنے والے کئی لوگوں کے کالے اور ناجائز
دھندوں کے بارے میں معلومات۔ میرا ذہن وقت سے بہت
پہلے ہی پختہ ہو چکا تھا۔ مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ ہر شخص خود

اپنے مفاد کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ ایک نفسا نفسی کا عالم ہے اور اس دوڑ میں کوئی بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ جس شخص کے پاس جس قسم کی بھی بے ایمانی کی گنجائش موجود ہے، وہ اسے استعمال کر رہا ہے۔

میں اب فراٹے سے گالیاں بکتا تھا۔ مار پیٹ میں کسی سے کم نہیں تھا۔ اب تک کئی لوگوں کی ٹھکائی کر چکا تھا۔ ڈر اور خوف نام کی کوئی چیز میرے دل میں نہیں تھی۔ میں اکھڑ، سخت مزاج اور تند خو ہو گیا تھا۔ میری زبان کا لب و لہجہ بالکل بازاری بن گیا تھا۔ میرا قد اپنی اماں اور ابا کی طرح لمبا تھا۔ اور میرا جسم فولاد کی طرح سخت ہو گیا تھا۔

گھر کے حالات بدستور تھے۔ استاد سے تنخواہ اب میں خود ہی وصول کرتا تھا اور آدھی تنخواہ امی کو دے کر آدھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ گھر سے میرا صرف اتنا رشتہ تھا کہ رات گئے وہاں جا کر رہتا تھا۔ سارا دن گیراج میں رہتا اور شام کو دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے، سینما دیکھنے یا کہیں اور نکل جاتا اور رات کو بہت دیر سے گھر جا کر سو رہتا۔ گھر والوں سے زیادہ تر بات چیت کا موقع ہی نہ ملتا تھا لیکن ابا اور امی خوش تھے کہ میں کمائی کر رہا ہوں اور انھیں اچھے خاصے پیسے لا کر دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ انھیں اور کیا چاہیے تھا؟ میں اب ان پر بوجھ نہیں تھا بلکہ ان کی کفالت میں حصہ دار تھا۔

دولہا بھائی اور آپا کی زندگی میں اس دوران یہ اہم بات ہوئی تھی کہ آپا ایک بچی کی ماں بن چکی تھیں اور دولہا بھائی اس بات سے بالکل خوش نہیں تھے۔ انھیں بیٹا چاہیے تھا۔ ان کی باجی قدسیہ اب بھی اسی ٹھسے کے ساتھ ان کے ساتھ رہتی تھیں اور پہلے کی طرح آپا کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ لڑکی کی پیدائش پر جب دولہا بھائی نے ناک بھوں چڑھائی تھی تو باجی نے انھیں خوب سنائی تھیں۔

سراج بھائی نے بی اے کر لیا تھا۔ انھیں کوئی اچھی سی نوکری مل گئی تھی اور وہ عرفان چچا اور رخسانہ چچی کو ساتھ لے کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے تھے۔ گولی مار والا مکان ان لوگوں نے فروخت کر دیا تھا۔ سراج بھائی نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔

میں کبھی کبھی آپا کے گھر چلا جاتا تھا اور بچی کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر جاتا تھا۔ آپا کو جب کبھی مجھ سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملتا، وہ رو دیتیں اور اکثر تو آنسوؤں سے روتیں۔ وہ اپنی زندگی سے بالکل مطمئن نہیں تھیں۔ دولہا بھائی انتہائی کنجوس اور شکی آدمی تھے۔ وہ آپا کے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں دیتے تھے۔ سارے پیسے اپنے پاس رکھتے تھے اور گھر کے خرچ کے لیے گن گن کر پیسے دیتے تھے۔ وہ آپا کو کہیں بھی اکیلا نہیں جانے دیتے تھے۔ یا تو وہ خود ساتھ جاتے تھے اور یا پھر باجی ساتھ جاتی تھیں۔ آپا رو رو کر مجھے یہ ساری باتیں بتاتیں اور بڑے دکھ کے ساتھ کہتیں کہ اب تو انھیں ساری ہی زندگی یہ عذاب جھیلنا ہے۔

اور تب ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کے دھارے کا رُخ ایک دم موڑ کر رکھ دیا۔

میں نے ڈاکٹر سرفراز کی گاڑی میں انجن کا کام ختم کیا اور چابی ڈاکٹر صاحب کے حوالے کی۔

"استاد،" ڈاکٹر صاحب نے استاد سے مخاطب ہو کر کہا، "ذرا ٹرائل تو لے لیجیے۔"

"بشیر کے ہاتھ کی بنائی ہوئی گاڑی کا ٹرائل لینے کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔" استاد نے کہا، "وہ ٹرائل خود لے چکا ہے۔"

"پھر بھی استاد تم ٹرائل لے لو۔" ڈاکٹر صاحب نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے۔" استاد نے کہا، "میں ٹرائل لیتا ہوں، آپ میرے ساتھ آئیے۔" اور وہ دونوں چلے گئے۔ تین گھنٹے سے زیادہ گزر گئے اور استاد واپس نہیں آیا۔ ہم سب لڑکے سخت پریشان تھے۔

اور پھر ہمیں ایک دہشت ناک خبر ملی جس نے ہمارے حواس گم کر دیے۔

(جاری ہے)